امریکہ کی اسلام دشمنی
امریکی حکومت، ذرائع ابلاغ اور عوام کے تعصبات کو
بے نقاب کرتی ہوئی انکشاف انگیز تحریر
مصنف:
پال فنڈلے
(سابق رکن امریکی کانگریس)
PALESTINE

امریکہ کی اسلام دُشمنی

امریکی حکومت، ذرائع ابلاغ اور عوام کے تعصّبات کو بے نقاب کرتی ہوئی انکشاف انگیز تحریر

مصنف: پال فنڈلے

(سابق رکن امریکی کانگرس)

مترجم: محمد احسن بٹ

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور فون: 0092-42-7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk
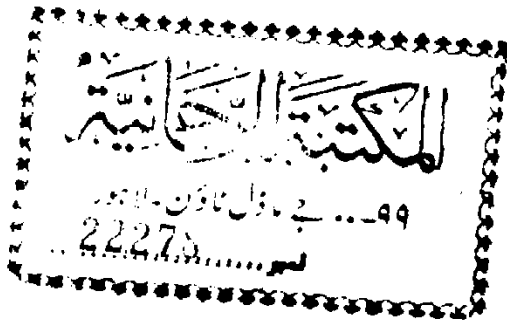
نام کتاب: امریکہ کی اسلام دشمنی

مصنف: پال فنڈلے

مترجم: محمد احسن بٹ

ناشر: آصف جاوید

برائے نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ' لاہور۔ فون: 7322892

مطبع: المطبعۃ العربیہ' لاہور

سال اشاعت: 2003ء

قیمت: -/180 روپے

فہرست

ان کے نام

جو

ہر خطے کے لوگوں

کی

آزادی کی قدر

کرتے ہیں

ہماری بقا اس جذبے کی سلامتی میں ہے جو ہر خطے میں بسنے والے تمام انسانوں کی آزادی کی قدر پر مبنی ہے'
اگر آپ اس جذبے کو تباہ کر دیں گے تو گویا اپنے ہی صحن میں جبر و ستم اور آمریت کے بیج بو دیں گے۔

ابراہام لنکن

ایڈورڈز وائل' الی نائے میں خطاب

11/اکتوبر 1858ء

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

امریکہ میں اسرائیلی لابی اور یہودیوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے والی شہرۂ آفاق کتاب They Dare To Speak Out کے مصنف سابق رکن امریکی کانگرس پال فنڈلے کی تازہ ترین کتاب Silent No More: Confronting America's False Images Of Islam کا اردو ترجمہ نذر قارئین ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بے مثال دیانت داری اور قابل تعریف انصاف پسندی سے کام لیتے ہوئے امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے موجود غلط اور یک رُخے تصورات کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے بنیاد پرستی' دہشت گردی' عورتوں پر جبر' پردہ' غیرت کے نام پر عورتوں کے قتل' نسوانی ختنہ اور طالبان کے حوالے سے امریکی عوام' ذرائع ابلاغ اور حکومتی حلقوں میں پھیلے ہوئے مغالطوں اور بدگمانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے حقائق کو پیش کیا ہے اور ان مغالطوں کو عام کرنے کے ذمہ دار افراد اور اداروں' امریکی حکومت' سیاست دانوں اور ذرائع ابلاغ پر کڑی تنقید کی ہے۔

قارئین کو اس کتاب کا ہر صفحہ امریکی معاشرے اور حکومت نیز متعصب امریکیوں کے ذہنوں کے تاریک گوشوں سے روشناس کروائے گا۔ کیسی الم انگیز حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی کو انفارمیشن اور علم کی صدی قرار دینے والا امریکہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اتنے جہالت آمیز مغالطوں کا شکار ہے!!

فاضل مصنف نے امریکی سیاسی تاریخ کے ایک اہم مرحلے یعنی موجودہ صدر جارج بش کی کامیابی میں مسلمانوں کے فیصلہ کن کردار کے حوالے سے نہایت اہم معلومات بھی فراہم کی ہیں' جو کتاب کے بارہویں باب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے اس ضرورت کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔ سفاک زمانہ بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور ممکنہ ہلاکت و بربادی سے بچنے کا واحد طریقہ ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

"نگارشات" آپ کے لیے ہمیشہ اہم موضوعات پر اعلیٰ ترین معیار کی حامل تصانیف لے کر آتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب بھی وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ایک نادر اور بصیرت افروز دستاویز ہے' جس کا مطالعہ ہر سنجیدہ فرد شوق سے کرے گا۔ آپ کی دعائیں شاملِ حال رہیں تو "نگارشات" آئندہ بھی اپنی اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے مزید تاریخ ساز کتابیں آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرے گا۔

اس کتاب کے حوالے سے اپنی آراء و تجاویز ضرور ارسال کیجئے گا۔

محمد احسن بٹ

اظہارِ تشکر

یہ میری پانچویں کتاب ہے اور سب سے زیادہ مبارزت طلب (Challenging)، پیچیدہ اور من موہ لینے والی۔ اس کتاب کو لکھنے میں جن جن لوگوں نے میری معاونت کی، میں نے ان سب کا ذکر اشاریے میں کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے واقعات، ذاتی تجربات اور بیش قدر تصورات فراہم کیے۔ انہوں نے یہ سب بڑے ولولے اور امنگ کے ساتھ اس امید میں کیا کہ جب کتاب مکمل ہو کر سامنے آئے گی تو اسلام کے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

شرلے کلائس (Shirley Cloyes) نے ادارتی حوالے سے بنیادی طور پر میری معاونت کی۔ ماضی میں انہوں نے امریکہ اسرائیل تعلقات کے حوالے سے دو کتابیں لکھنے میں میری مدد کی اور حال ہی میں کوسوو میں ہونے والی خانہ جنگی کی نتیجے میں رونما ہونے والے انسانی دکھوں سے نمٹنے میں ہاتھ بٹایا۔ زیرِ نظر کتاب کی تفصیلی ادارت میں مدد دینے والوں میں شامل ہیں: ایک غیر پیشہ ور اسلامی عالم ڈاکٹر نور ناصری، ان کی بیگم زینب البری، ایک استاد اور ماہر لسانیات اینڈریو پیٹرسن اور میرے ایک ہمسائے ڈاکٹر وولف فیوہرنگ، جو پولیٹیکل سائنس کے ریٹائرڈ پروفیسر ہیں۔

میری بیوی اور بہترین نقاد لوسیلی نے پروف ریڈنگ کے دوران میری الجھی ہوئی تحریر کو الجھاؤ سے پاک کیا۔ جب انہیں چند ابواب کے کئی کئی خاکوں کو پڑھنے کی درخواست کی جاتی تو وہ کہا کرتی تھیں کہ اگر یہ کتاب کبھی مکمل ہو گئی تو انہیں حیرت ہو گی۔ ہمارے دونوں بچوں کریگ اور ڈائنا نے متن کو سنوارنے میں مدد کی۔ اپنے والدین کی طرح وہ بھی مختلف ثقافتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے دوستوں کے حلقوں میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آمنہ پبلیکیشنز کے عملے نے صبر و تحمل سے کام لیا اور بے حد تعاون کیا۔

جب ایک چھوٹی سی ڈسکٹ (Diskette) میں سمویا ہوا مسودہ میرے ہاتھ سے گیا تو مجھے ہلکی سی اداسی محسوس ہوئی۔ اس مسودے کی تیاری میں اسلام کے لیے میرے احترام میں اضافہ ہوا اور مسلمان دوستوں کی وجہ سے میری زندگی باثروت ہو گئی۔ ڈسکٹ تو مجھ سے الگ ہو گئی تاہم میری آرزو ہے کہ یہ دوستی پائندہ رہے۔

پال فنڈلے

تعارف: ایک غیر متوقع سفر

آج خود میرے لئے بھی یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ عالم اسلام کو کسی منصوبے کے بغیر میرے جاننے کا عمل ایک ایسے چھوٹے اور دور دراز واقع ملک سے شروع ہوا جہاں برسوں سے کوئی امریکی حکومتی اہل کار نہیں گیا تھا۔ میں وہاں ایک امدادی (Rescue) مشن پر گیا تھا' جس کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو اپنے ایک رائے دہندہ ایڈ فرینکلن کو آزاد کروانے کے لیے گیا تھا جسے جاسوسی کرنے کے جھوٹے الزام کے تحت قید کر دیا گیا تھا۔ میں 1947ء میں' امریکی ایوان نمائندگان میں اپنی بائیس سالہ عملی زندگی کے وسط میں' ایک اجنبی دنیا — یعنی مشرق وسطیٰ — کا سفر کر رہا تھا جہاں مجھے فرینکلن کو رہائی دلوانے کی کوشش کرنا تھی۔

عوامی جمہوریہ یمن کا دارالحکومت عدن میری منزل تھا۔ وہ دنیا کے گرد ایک تہائی فاصلے پر جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مغربی سرے پر واقع ایک مارکسی ریاست تھی۔ آپ حالیہ نقشوں پر اُس ریاست کو نہیں پا سکیں گے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حکومت زوال پذیر ہوگئی اور یہ ملک 1990ء میں عرب جمہوریہ یمن کے ساتھ اتحاد کر کے جمہوریہ یمن میں ڈھل گیا۔

جب میں فرینکلن کی رہائی کے سفر پر روانہ ہوا تو اسے میرے تصور کے مطابق دُرشت اور غیر تہذیب یافتہ حالات میں قیدِ تنہائی کاٹتے ہوئے سولہ ماہ کا عرصہ ہو چلا تھا۔ اس کے بہت زیادہ پریشان والدین' جو مغربی الی نائے میں میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ان کے بیٹے کو ناحق مجرم ٹھہرایا گیا ہے' انہوں نے مجھ سے مدد کرنے کے لئے درخواست کی۔ فرینکلن نے جیل سے خط لکھ کر وضاحت کی تھی کہ وہ کویت

میں اپنے تدریسی عہدے کو سنبھالنے کے لیے جس جہاز پر جا رہا تھا' اس کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی۔ جس کی وجہ سے عدن میں ہنگامی طور پر لینڈنگ کرنا پڑی۔

جہاز کی مرمت کے دوران انتظار کرتے ہوئے اُس نے یہ جانے بغیر کہ وہ سیکورٹی ضابطوں کو توڑ رہا ہے' ہوائی اڈے اور قریبی بندرگاہ کے فوٹو اتار لئے۔ مقامی پولیس نے' جو اس شبے کا شکار تھی کہ چھ سال پہلے کی طرح برطانیہ ایک بار پھر کمانڈو حملے کی منصوبہ سازی کر رہا ہے' فرینکلن کو حراست میں لے لیا۔ کئی ہفتوں کی تفتیش کے بعد ایک عدالت نے اُسے پانچ سال قید کی سزا سنادی۔

اس زمانے کے بیشتر امریکیوں کی طرح مشرق وسطیٰ کے بارے میں میرا تصور بھی غیر واضح اور دھندلا تھا جبکہ واشنگٹن سرکار نے میری تشویش میں کمی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ امریکی محکمۂ خارجہ کی رائے میں عدن حکومت عرب دنیا کی سب سے زیادہ شدت پسند انقلابی حکومت تھی۔ جون 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سے کوئی امریکی سرکاری اہلکار اس ملک میں داخل نہیں ہوا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے امریکی حکومت کی طرف سے کوئی تحفظ حاصل نہیں ہو گا۔ نیز وہاں پہنچنے پر کوئی سفارتی معاونت بھی نہیں ملے گی۔ اس سفر پر روانہ ہونے کے بارے میں سوچ بچار کرتے ہوئے میں نے ایک تجربہ کار سفارت کار سے دریافت کیا کہ اگر جنوبی یمن کی حکومت مجھے بھی جیل میں ڈال دے تو محکمۂ خارجہ کیا کرے گا؟ اس کا تشویش انگیز جواب تھا: ''ہم کسی اور ایسے رکن کانگرس کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے جو تمہاری آزادی کی سعی کرنے کے لئے وہاں جانے پر راضی ہو۔''

عدن میں سفارت خانے کے حامل برطانوی دفتر خارجہ سے رابطہ کرنے کے بعد میں قائل ہو گیا کہ ایڈ فرینکلن کی رہائی کی واحد امید مَیں ہی ہوں۔ لہٰذا گہری تشویش کے باوجود مَیں واشنگٹن سے نیویارک گیا' پھر بیروت (لبنان) کے لئے براہِ راست پرواز لی اور وہاں سے عدن کے لیے جہاز پر سوار ہوا۔ جب جہاز عدن کی طرف پرواز کر رہا تھا تو میں پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ آئندہ کیا ہو گا___ شاید میرے لیے المناک نتائج ظاہر ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ میرے خاندان کے لیے بھی' جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا' یہاں تک کہ شاید امریکی خارجہ پالیسی کے لیے بھی منفی نتائج ظاہر ہوں۔ میں فکر مند تھا کہ اگر ہوائی اڈے پر مجھے کوئی نہ ملا تو میں کیا کروں گا؟

مجھے بہت حیرت ہوئی جب عدن کے سرکاری افسروں کے ایک وفد نے ہوائی اڈے پر میرا استقبال کیا۔ مجھے سفارتی احترام کے ساتھ مہمان خانے پہنچایا گیا اور دورانِ قیام استعمال کے لیے ڈرائیور سمیت کار مہیا کر دی گئی۔ تین دن تک کابینہ کے افسروں کے ساتھ مذاکرات کرنے، گھومنے پھرنے اور اضطراب کے عالم میں انتظار کرنے کے بعد میری روانگی کے طے شدہ دن سے پہلے کی شام صدر سالم ربائع علی سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کے حوالے سے اپنی شکایات تفصیل سے بیان کیں اور پھر خوشخبری سنائی، میرے رائے دہندہ کو۔۔۔ جس کا ذکر علی نے ''قیدی'' کے لفظ سے کیا تھا۔۔۔ رہا کر کے میری تحویل میں دے دیا گیا اور اُسے اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ اگلی صبح میرے ساتھ روانہ ہو سکتا ہے۔

وہ امدادی مشن سیاسی خدمت کی ایک غیر معمولی مثال سے کچھ سوا تھا۔ وہ میری زندگی کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ ماضی کو یاد کرتے ہوئے میں اس حقیقت کا ادراک کرتا ہوں کہ عدن تو اسلامی دنیا کی جانکاری کے ایک طویل، ولولہ انگیز اور معلومات افزا سفر کا میرا پہلا پڑاؤ تھا۔ ایسے ہی متواتر پڑاؤ آتے گئے اور میری آنکھوں پر ایک ایسی ثقافت کو منکشف کرتے گئے جو ہر انسان کی عزت، وقار اور قدر و قیمت نیز رواداری اور علم کی جستجو کی بنیاد پر اُستوار تھی ـــــ وہ معیارات جن کے بارے میں مجھے بعد میں علم ہوا کہ ان کی جڑیں مذہب اسلام میں بہت گہری اُتری ہوئی ہیں۔ یہ وہ مقاصد ہیں جن کی میرے عیسائی آباؤ اجداد ضرور تحسین کرتے۔

مَیں اُس دور دراز واقع سرزمین پر اس دنیا کے ایک ارب لوگوں کے مذہب سے پہلی بار متعارف ہوا، ایک ایسی مذہبی برادری جس سے تعداد کے اعتبار سے صرف عیسائی زیادہ ہیں، جن کی تعداد دو ارب سے زائد ہے۔ اس زمانے میں مجھے اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ مسلمان تو امریکہ میں پہلے ہی ایک ٹھوس اور بڑھتی ہوئی اقلیت بنتے جا رہے تھے۔ نہ ہی مجھے اس حقیقت سے آگاہی تھی کہ ان میں کاروبار، سائنس، فنون، علم و دانش، پیشوں (The Professions) اور کھیلوں کے قائدین (Leaders) بھی موجود ہیں اور میں اس حقیقت سے بھی غیر آگاہ تھا کہ امریکی معاشرے کے لیے مسلمانوں کی متاثر کن خدمات کے باوجود وسیع پیمانے پر مانے جانے والے یک رخے تصورات (سٹیریوٹائپس) نے مسلمانوں کے عوامی

تصور کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور عوامی خدمات میں کام آسکنے والی ان کی صلاحیتوں کو شدت سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

چھ برس بعد 1980ء میں کانگرس کے لیے دوبارہ انتخاب کے لیے چلائی گئی اپنی ہنگامہ خیز مگر کامیاب مہم کے دوران مجھے ذاتی تجربہ سے علم ہوا کہ یک رخے تصورات کس قدر اذیت دہ ہو سکتے ہیں۔ میرے مخالفوں نے قومی سطح پر اشتہار بازی کے ذریعے میری تصویر کشی سامیت دشمن (Anti-Semitic) کے طور پر کی ــــ مجھ پر یہ الزام فلسطینیوں کو انصاف دلانے کی میری کوششوں کی وجہ سے لگایا گیا تھا۔

میرے ڈیموکریٹ اور ری پبلکن یہودی رفقاء نے میرے خلاف لگائے گئے اس الزام کا عوامی سطح پر دفاع کیا لیکن جو داغ لگ چکا تھا وہ اتنا گہرا تھا کہ میں یہ سوچنے لگا کہ اس کا مٹنا ناممکن ہے۔ اس کے بعد سے میں جب کبھی کسی یہودی سے پہلی بار ملتا ہوں تو سوچتا ہوں کیا وہ اس خطاب کی بنیاد پر میرے بارے میں پہلے ہی رائے قائم کر چکا ہے؟ یک رخے تصور قائم کرنے کے حوالے سے اس ذاتی تجربے نے مجھ میں یہ پختہ عزم پیدا کیا کہ جب دوسروں کی کردار کشی کی جا رہی ہو تو میں اُس پر احتجاج کروں اور یہ ان عوامل میں سے ایک ہے جو میرے اس کتاب کے لکھنے کا محرک بنے۔

مَیں نے اسلام کو کسی اچانک انکشاف کے توسط سے نہیں جانا ہے' ایسے جیسے کہ کسی پُر چھتی کے تاریک گوشے میں کوئی خزانے کا صندوق ہاتھ لگ گیا ہو۔ اس کے بجائے ہوا یوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آگہی کے موتی ایک ایک کر کے سطح پر ابھرے اور ہر دریافت نئے تجسس اور سوالات کو مہمیز کرتی گئی۔ میرا یہ سفر مکتبی تعلیم کے تکلفات' درسی کتابوں یا مطالعاتی فہرستوں کے بغور مطالعے پر مشتمل نہیں تھا اور حتیٰ کہ چند مستشنیات کو چھوڑ کر اسلامی عالم کے طور پر معروف مسلمانوں سے بھی تبادلۂ خیالات اس میں شامل نہیں تھے۔ میں نے تو اسلام کے بارے میں ان عام مسلمانوں سے معلومات حاصل کی ہیں' جو کہ پورے امریکہ اور اس کے باہر آباد ہیں اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں۔ میں نے اس کتاب میں اسلام کو ویسے ہی پیش کیا ہے جیسے یہ عام مسلمان اس کو سمجھتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ میں نے فلسفے اور عمل میں کچھ نکات پر ان کے عدم اتفاق مگر بنیادی عقائد پر ان کے مستحکم اتفاق کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

اس سے پہلے کہ میرے سفر کا آغاز ہوتا' تہذیبوں کے ابھرتے ہوئے تصادم۔۔ یعنی مشرق بمقابلہ مغرب ۔۔ کے نحس تفکرات نے مجھے آگھیرا۔ میں نے ساری زندگی یہودی عیسائی (Judeo-Christian) اخلاقیات کے بارے میں تو سنا تھا لیکن کبھی یہودی' عیسائی' اسلامی (Judeo-Christian-Muslim) اخلاقیات کا ذکر نہیں سنا۔ اخراج کے اس عمل کی وجہ سے میرے تصور میں اسلام ایک اجنبی' بعید اور تشویش انگیز شے بن گیا۔ مسلمانوں یا دوسرے لوگوں کی طرف سے اصلاحی آراء موصول نہ ہونے کی وجہ سے میں یہ ماننے لگا کہ ایک عظیم سرحد کی ایک سمت تہذیب یافتہ اور ترقی پسند مغرب کی حیثیت سے عیسائیت اور یہودیت موجود ہیں جبکہ اس سرحد کی دوسری سمت اسلام ہے جس کے بارے میں میرا غلط تصور یہ تھا کہ وہ عرب/مشرق کی ایک پس ماندہ اور خطرناک قوت ہے۔ ایسے یک رخے تصورات (سٹیریوٹائپس) امریکہ میں عام ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک ایسے تصور جہاں (ورلڈ ویو) کو تشکیل دیا تھا جسے اب میں جھوٹا اور گمراہ کر دینے والا تسلیم کرتا ہوں۔ اس کا مقصد یہ بھی نہیں کہ میں سب مسلمانوں ہی کو بانس پر چڑھا رہا ہوں۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ چند مبینہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح کچھ غلط رویوں کا شکار مسلمان بھی اپنے مذہبی عہد توڑ دیتے ہیں اور ہر معیار سے ان کا یہ عمل منافقانہ اور لائق مذمت ہے۔ تاہم میں نے زیادہ تر مسلمانوں کو اس قدر بھلا پایا کہ مَیں خوشی سے انہیں اپنا ہمسایہ بنانا پسند کروں گا۔ اسلام نہ تو خالصتاً مشرقی ہے اور نہ ہی بڑی حد تک عرب سے تعلق رکھتا ہے۔ آج امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے زیادہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ آبادیاتی معنوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو بھی یہودیوں کی طرح ہی امریکی شہری تصور کیا جانا چاہیے۔

میں نے اپنے عدن کے دورے میں یہ جانا کہ اسلام' یہودیت اور عیسائیت یکساں ابراہیمی جڑوں کے حامل ہیں اور ان کے اہم عقائد' روایات اور معیاراتِ عمل مشترک ہیں۔ اپنے مسلسل سفر کے دوران ہر سنگ میل پر مجھے علم ہوا کہ میرے عقیدے یعنی عیسائیت اور یہودیوں کے عقیدے یعنی یہودیت کی طرح اسلام بھی خدائے واحد کو مانتے ہوئے امن' ہم آہنگی' خاندانی ذمہ داری' بین المذاہب احترام' عجز وانکساری اور کل نوع انسان کے لیے مساوی انصاف کی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اسلام ایک آفاقی' کثیر الثقافتی اور کثیر النسلی

مذہب ہے۔ یہ نسل‘ قومیت اور مذہبی عقیدے سے بالاتر ہو کر نوع انسان کی اخوت اور مساوات کا اعلان کرتا ہے۔

ایسے بنیادی اشتراک رکھنے والے عقیدوں کے باوجود مسلمان امریکہ کے عیسائی اکثریت والے معاشرے میں روزمرہ زندگی میں مشکلات سے دوچار ہیں۔ بیشتر امریکی کسی مسلمان سے شناسائی نہیں رکھتے اور امریکہ میں مسلمانوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی موجودگی سے آگاہ نہیں ہیں۔ انہوں نے اس مذہب کے بارے میں معلومات رکھنے والے کسی شخص سے کبھی تبادلۂ خیالات نہیں کیا اور نہ ہی کبھی قرآن کی کسی ایک آیت کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اسلام کے حوالے سے ان کے تاثرات بنیادی طور پر خبروں‘ فلموں‘ ٹیلی ویژن کے ڈراموں نیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مذاکروں (ٹاک شوز) میں پیش کیے گئے منفی اور جھوٹے تصورات سے ابھرتے ہیں۔

اگرچہ زیادہ تر امریکی مسلمانوں کو جان بوجھ کر نظرانداز نہیں کرتے یا ان کی مذہبی سرگرمیوں اور رسومات کے حوالے سے معاندانہ رائے نہیں رکھتے تاہم جن مسائل کا سامنا مسلمانوں کو ہے وہ کم از کم اتنے ہی سنگین ہیں جتنا کہ تھوڑا عرصہ پہلے امریکہ میں یہودیوں کو امتیاز کا سامنا تھا۔

زیرِنظر کتاب لکھنے کے دوران میرے سامنے جو مقاصد رہے‘ وہ ہیں: بین المذاہب افہام و تفہیم‘ رواداری اور تعاون۔ میں کوئی ایوانجلسٹ نہیں ہوں‘ جو بے عقیدہ لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے کوشاں ہو‘ نہ ہی میں اسلام پر کوئی سند ہوں۔ میں تو فقط اس مذہب کی درست تفہیم کا خواہاں ہوں‘ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے لیے ایک مضبوط اور اہل قیادت کی ضرورت ہے‘ خصوصاً مسلمانوں کی طرف سے۔ معاشرے کی ہر سطح یعنی خاندان‘ پاس پڑوس‘ سکولوں‘ میڈیا اور سب سے زیادہ اہم سیاسی عمل کے میدان میں قیادت فراہم کی جانی چاہیے۔ چونکہ مسلمان تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں اس لیے انہیں امریکہ کے سیاسی اکھاڑے میں فعال حصہ ضرور لینا چاہیے۔

ایک امید افزا آغاز ہو رہا ہے۔ جب میں نے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کیا تو میں ان مسلمانوں کی تعداد سے متاثر ہوا جو بہت زیادہ نمود و نمائش کے بغیر برادری کی قیادت (کمیونٹی لیڈرشپ) میں سرگرم عمل ہیں اور بین المذاہب ہم آہنگی اور دوسری شہری پیش رفتوں

کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے چند افراد جماعتی انتخابی مہمات میں حصہ لے رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ تمام شہریوں کے لیے بہتر زندگی کے وعدے کو نبھانے والے مساوی اور لازمی کام ہیں۔

میں نے قریباً ساری زندگی سیاست میں گزاری ہے اس لیے سیاسی جدوجہد کبھی میری سوچ سے باہر نہیں رہی۔ میں نے بہت کم عمری میں سیاست کا آغاز کیا تھا۔ یہ 1935ء کی بات ہے، جب میری عمر چودہ برس تھی، کہ میں نے پانچ ڈالر میں ایک استعمال شدہ میمیوگراف (Mimeograph) خریدا۔ یہ ٹائپ شدہ تحریر کے سٹینسل تیار کرنے والا اس زمانے کا جدید آلہ تھا جس نے مجھے پروگرام اور بلیٹن چھاپ کر روزی کمانے کے قابل بنا دیا اور ایک چھوٹے درجے کا پمفلٹ باز بننے کی ترغیب دی۔ میں نے اپنے کم عمری کے تبصروں کو اپنے سکول کے ساتھیوں اور ہمسایوں تک سلسلہ وار پہنچانا شروع کر دیا۔ ایک سال بعد 1936ء کے موسم خزاں میں میں نے اپنے آبائی قصبے کی گلیوں میں اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ عہدۂ صدارت کے ری پبلکن امیدوار کنساس کے گورنر ایلف ایم۔ لنڈن کے لیے بچ بچ بگل بجائے۔ ہماری بگل نوازی کے باوجود لنڈن انتخاب نو کے لیے صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ کی پہلی کوشش میں انہیں ہرانے میں ناکام ہو گئے۔ لنڈن سوائے مائن اور ورمونٹ کے ہر ریاست سے ہار گئے تھے۔

تاہم لنڈن کی شکست نے سیاست میں میری دلچسپی کو بڑھا دیا۔ تب سے میں نہایت اشتیاق کے ساتھ سیاسی دنیا میں سرگرم رہا ہوں اور دوسری عالمی جنگ میں فوجی خدمت انجام دینے کے علاوہ میں نے ہر دو برس بعد ہونے والے تمام عام انتخابات میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربہ سے شکست و فتح کی کیفیتوں کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں نے 1952ء میں سرکاری عہدے کے لیے اپنی پہلی جدوجہد میں ری پبلکن پارٹی کی طرف سے ریاستی سینیٹر کی نامزدگی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ 1960ء میں میں امریکہ کے ایوانِ نمائندگان کے لیے منتخب ہو گیا۔ میرا نام انتخابی پرچیوں (Election Ballots) پر پچیس مرتبہ آیا ہے۔ میں نے بارہ انتخابی مہمات میں سے گیارہ میں فتح حاصل کی اور آخری واحد مہم میں تھوڑے سے فرق سے ہار گیا۔ ڈیموکریٹوں نے تمام بارہ انتخابات میں میرا زبردست مقابلہ کیا جبکہ ری پبلکن امیدواروں نے تیرہ ابتدائی مہمات میں سے تین میں

مجھے چیلنج کیا۔ سوائے پہلی ابتدائی مہم کے میں نے باقی تمام میں کامیابی حاصل کی۔ ان ذاتی مقابلوں کے علاوہ میں نے اکثر و بیشتر دوسرے امیدواروں کے لیے بھی کام کیا اور انتخابات کے دوران مختلف قسم کے عوامی مقاصد (کاز) کی حمایت کی یعنی تقریریں کیں' پڑوسیوں کو قائل کیا نیز مضامین اور کتابیں لکھیں۔

میں نے اس ذاتی تسکین کا تجربہ کیا ہے جو کہ فعال کارکن اکثر محسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ انتخاب کے دن کے فوری ہدف کو پانے میں ناکامی پر بھی۔ جن دو مواقع پر مجھے شکست کا سامنا کرنا پڑا' ان انتخابی مہمات نے بھی بعض دوسرے اہم چیلنجوں کے دروازے مجھ پر کھولے۔ مثال کے طور پر ریاستی سینیٹر کے لیے میری ناکام مہم نے ایسی دوستیاں استوار کروائیں اور وہ تجربہ مہیا کیا جو آٹھ برس بعد کانگرس کے انتخابات میں میری کامیابی کا ضامن بنے۔ میں نے 1982ء میں کیپٹل ہل کے لیے اپنی بارھویں ٹرم میں ناکامی کو ابر سیاہ تصور کیا مگر جلد ہی اس میں کرنیں نمودار ہو گئیں۔ اور وہ یہ کہ اگر میں اس برس دوبارہ منتخب ہو گیا ہوتا تو اسلام سے کبھی آگاہ نہ ہوا ہوتا اور یہ کتاب ۔۔۔ یا اسرائیل امریکہ تعلقات پر دو کتابیں ۔۔۔ نہ لکھ پاتا۔

انسانی حقوق کے لیے میری طویل جدوجہد کا محرک مرکزی الی نائے کے ایک چھوٹے سے کالج ٹاؤن میں ہونے والے بچپن کے تجربات ہیں۔ وہاں میں نے "اعلان آزادی" پر ابراہام لنکن کے دستخط کرنے کے ستر برس بعد بھی ہنوز واضح طور پر موجود نسل پرستی کا مشاہدہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ افریقی امریکیوں کو ریستورانوں' ہوٹلوں اور نائی کی دکانوں میں خدمات فراہم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور مقامی سینما میں بالکونی کے ایک کونے میں بیٹھنے پر مجبور کیا گیا اور یہ سب لنکن کی سرزمین پر ہو رہا تھا!

بعد میں جب میں نوبلوغت کی عمر میں تھا' میں واشنگٹن ڈی سی گیا اور قصر صدارت سے تھوڑے ہی فاصلے پر نسل پرستی کو پروان چڑھتے ہوئے پایا۔ اس دورے کے دوران ایک سہ پہر کا ذکر ہے میں بس پر سوار ہو کر میموریل برج (Memorial Bridge) کے پار جا رہا تھا۔ جب بس ورجینیا والی سمت پہنچی تو ڈرائیور نے بس روک دی اور اس وقت تک آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جب تک تمام افریقی امریکی مسافر پچھلی نشستوں پر نہیں بیٹھ جاتے۔ میں غلامی کی اس ذلت انگیز یادگار کو دیکھ کر بہت مضطرب ہوا۔

دوسری عالمی جنگ میں خدمات انجام دینے کے دوران میں نے امریکی بحریہ میں بے انتہا نسل پرستی کا مشاہدہ کیا۔ افریقی امریکیوں کو الگ تھلگ رکھا جاتا اور عموماً ان حقیر

کام لیے جاتے تھے۔ تمام افسر سفید فام تھے۔ میں نے اس بات کو ذہن میں محفوظ کرلیا کہ جنگ کے بعد انسانی حقوق کی ترویج کے لیے جدوجہد کروں گا۔ نسل پرستی مٹ کے رہی۔

1944ء میں سی بی (Seabee) بٹالین نے، جس میں میں بھی شامل تھا، گوام کو جاپانیوں کے قبضے سے چھڑانے کے لیے زبردست یلغار کی۔ اس کے پندرہ ماہ بعد جب جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تو میری بٹالین نے اس پر قبضہ جمانے میں حصہ لیا۔ وہاں اترتے ہی میں جیپ پر سوار ہوکر قریب واقع ناگاساکی گیا جہاں چند ہفتے پہلے ہی صرف ایک امریکی ایٹم بم نے ساٹھ ہزار سے زیادہ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور جاپان کو ظلم وستم روکنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس بڑے صنعتی شہر پر واحد ایٹم بم کے پھٹنے کے بعد رونما ہونے والے ملبے کا دائرہ دو میل قطر کا تھا اور ایٹم کی ہیبت ناک قوت کا مظہر۔

ناگاساکی کے دورے نے مجھے قائل کرلیا کہ اگر مستقبل میں ایٹمی جنگ چھڑ گئی تو یہ ساری نوع انسان کی فنا کا باعث ہوسکتی ہے۔ میں نے پختہ عزم کیا کہ ہم لوگوں کا اخلاقی فرض ہے، جنھوں نے ایڈولف ہٹلر کی افواج اور جاپانی فوجی جتھا کے خلاف کامیاب جدوجہد کی ہے کہ ایک ایسے بین الاقوامی نظام کے نفاذ کے لیے بھی اسی طرح بھرپور کوششیں کریں جو دنیا میں مستقل امن کا ضامن ہو۔ مجھے یاد آیا کہ پہلی عالمی جنگ کو بعض اوقات ''سب جنگوں کو روکنے والی جنگ'' کہا گیا تھا۔ لیکن اس کے بجائے وہ جنگ ایک اور زیادہ تباہ کن تنازعے کی تمہید ہی ثابت ہوئی۔ مجھے خوف تھا کہ اگلی جنگ اس سے بھی زیادہ ہولناک ہوگی۔ میرے جنگ کے بعد کرنے والے کاموں کی فہرست میں ایک اور مقصد کا اضافہ ہوگیا۔ جنگ بھی مٹ کے رہی۔

میں اس حقیقت کا قائل ہوگیا تھا کہ ایک اور جنگ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ تمام تجربہ کار جمہوریتیں ایک وفاقی یونین بنالیں جیسا کہ ''نیویارک ٹائمز'' کے خارجی نامہ نگار کلیرینس کے۔ سٹرائٹ نے اپنی کتاب ''یونین ناؤ'' (Union Now) میں تجویز پیش کی تھی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ ایک ایسی نئی حکومت تشکیل دی جائے جس کے تحت امریکہ اور چودہ دوسری خودمختار اور صنعتی اقوام ایک فیڈریشن میں ڈھل جائیں جو اتنی بڑی اور اتنی مضبوط ہو کہ دنیا میں کسی بھی جگہ جارحیت کو روک سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ہر جگہ بنیادی انفرادی آزادیوں کی بھی حفاظت کرے گی۔ میں بحریہ کی ملازمت کے دوران سٹرائیٹ سے خط کتابت کرتا رہا اور جنگ کے بعد میں نے اسے واشنگٹن ڈی۔ سی سے ایک کم عرصہ چلنے والے ماہنامہ رسالے

''فریڈم اینڈ یونین'' جاری کرنے میں مدد دی۔

اٹھارہ ماہ بعد میں نے ایک قدم اٹھایا جس نے آخرکار میرے انتخابی عہدے کا دروازہ کھول دیا۔ میں دیہی اِلّی نائے کے ایک چھوٹے سے ہفتہ وار اخبار کا مدیر اور حصہ دار بن گیا۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا جس نے مجھے اپنے سیاسی خیالات و آراء کے اظہار کا ایک ذریعہ فراہم کر دیا۔ اس نے مجھے پورے مغربی اِلّی نائے میں قریبی واقفیت قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ جب 1960ء میں میں نے کانگرس کے لیے ایک کامیابی سے ہمکنار ہونے والی مہم چلائی تو یہ واقفیتیں اہم ترین اثاثہ ثابت ہوئیں۔

جب میں نے جنوری 1961ء میں امریکہ کے ایوانِ نمائندگان کے ایک رکن کے طور پر حلف اٹھایا تو میں جن معاملات و مسائل کو توجہ طلب سمجھتا تھا ان میں سے ایک بھی مسلمانوں یا مشرق وسطیٰ سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں مجھے لفظ اسلام یا مسلم (Muslim) کے معنوں کا بھی پتا نہیں تھا اور اگر کوئی مجھ سے پوچھتا کہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے نام بتاؤ تو میں چند ایک ملکوں کے نام ہی بتا پاتا۔ میں اس خطے کے پیچیدہ مسائل اور وہاں موجود بھرپور مفادات کے بارے میں معمولی سی آگاہی رکھتا تھا۔ نیز اسلام اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں میرے جو تھوڑے بہت تاثرات تھے بھی سہی تو وہ غلط تھے۔ اس وقت میرے کیپٹل ہل کے بیشتر رفقاء اسلامی دنیا کے حوالے سے اسی طرح کی لاعلمی اور عدم دلچسپی کے حامل تھے۔

تب بھی میرے مقاصد بڑی حد تک مثالیت پسندی سے ابھرے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ انسانی حقوق ـــ خصوصاً افریقی امریکیوں کے حوالے سے قانون بنواؤں اور ایک ایسے نئے بین الاقوامی ادارے کی ترویج کے لیے کام کروں جو کہ جنگ سے بچنے میں معاونت کرے۔ میں نے 1960ء کے عشرے میں شہری حقوق کے حوالے سے کی جانے والی قانون سازی کے لیے ولولہ و جوش کے ساتھ کام کیا۔ حالانکہ مجھے اس حقیقت کا ادراک تھا کہ میں جن تجاویز کے لیے ووٹ دے رہا تھا وہ اس ضلع میں عمومی طور پر غیر مقبول تھیں جس کی میں نمائندگی کرتا تھا۔ جب میں ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو وہ ووٹ کیپٹل ہل میں میرے سارے کیریئر میں سب سے زیادہ اطمینان بخش نظر آتے ہیں۔

میں نے 1963ء میں معاہدۂ شمالی امریکہ کی تنظیم (NATO) کے ایک کلیدی اتحادی فرانس کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کی بحالی کے لیے کام شروع کیا۔

میں نے 1965ء میں پیرس کے ہفتہ بھر پر محیط تلاش حقائق مشن پر اپنے ری پبلکن رفقاء کے ایک چھوٹے سے گروپ کی رہنمائی کر کے کیپٹل ہل اور اپنے ضلع میں ہلکا سا طوفان بپا کردیا۔ میں نے 1966ء میں ہارورڈ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کافی زیادہ احتجاج کرتے ہوئے عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ سفارتی تعلقات کو معمول پر لانے پر اصرار کرتے ہوئے ہلچل پیدا کردی۔

1967ء میں کانگرس میں اپنے سترہویں برس میں مجھے امور خارجہ کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ بعدازاں اسی برس دو جماعتی اتحاد کی طرف سے کلیرینس سٹرائیٹ کی فیڈریشن کی تجویز کے تحت زیر عمل آنے والی اٹلانٹک یونین قرارداد پر ہونے والی پیشرفت کا جائزہ لیا۔ اگرچہ اس قرارداد کو اس گروہ نے غیر امریکی قرار دے کر مسترد کردیا' جسے میں گمراہ محبِ وطن کہا کرتا تھا' تاہم اس نے خارجہ امور کے حوالے سے قائم ایوانِ نمائندگان کی کمیٹیوں اور قوانین کو عیاں کردیا۔ لیکن مستقبل کے دو صدارتی امیدواروں اِلّی نائے کے جان بی۔ اینڈرسن اور ایریزونا کے مورس کے۔ یوڈال کی تقریروں سمیت بھرپور تائیدی مباحثے کے باوجود وہ قرارداد اٹھارہ ووٹوں سے مسترد ہوگئی۔

میں یہاں یہ ضرور لکھنا چاہوں گا کہ یوڈال اور اینڈرسن غیر معمولی اوصاف کے حامل تھے — جرأت' ایک خوش گوار حسِ مزاح اور سیاسی بصیرت۔

یقیناً سات برس پہلے بھی اس کا ردعمل ایسا ہی رہا ہوگا جب 1973ء میں ہمارے دو جماعتی گروپ نے فیڈریشن کے خواب کو بالائے طاق رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مستقبل کے ایک اور صدارتی امیدوار اِلّی نائے کے پال سائمن کی حمایت حاصل ہونے کے باوجود ''گمراہ محبانِ وطن'' نے ہماری تائید نہیں کی اور قرارداد پہلے سے زیادہ فرق سے مسترد ہوگئی۔

عین ممکن ہے قانون سازی کی ان ابتدائی پہل کاریوں میں درپیش اختلافات نے مجھے مشرق وسطیٰ میں ایک متوازن امریکی پالیسی یعنی ایسی پالیسی جو عربوں اور اسرائیلیوں دونوں کے لیے منصفانہ ہو' کی خاطر کام کے دوران سامنے آنے والے چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کیا ہو۔ میں جون 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ سے چند ماہ پہلے امور خارجہ کمیٹی کا رکن بنا۔ اس وقت میں کسی بھی مسلمان سے شناسائی نہیں رکھتا تھا۔ مزید تین برس تک صورتحال ایسی ہی رہی اور تب بھی یہ ایک سریع تجربہ ہی رہا۔

مصر کے سفیر اشرف غوربل سے' جن سے میری قریبی دوستی استوار ہوگئی تھی' میں

نے گفتگو کرتے ہوئے بس یونہی پوچھ لیا کیا آپ مسلمان ہیں؟ انہوں نے مجھ پر ایک لطف آمیز نگاہ ڈالی تاہم اثبات میں جواب دیا۔ اس وقت میری عمر اکیاون برس تھی اور تب بھی مسلمان میری زندگی کی حد تک کوئی وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔ اِلی نائے میں' میرے آبائی قصبے میں کوئی مسلمان نہیں رہتا تھا۔ میں نے جس کالج میں تعلیم حاصل کی وہاں بھی نہ تو میرے شعبے میں اور نہ طلبہ تنظیم میں کوئی مسلمان تھا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکی بحریہ میں تین سالہ ملازمت اور بعدازاں ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر کے طور پر تیرہ برسوں میں مجھے کوئی ایک بھی مسلمان نہیں ملا۔

1972ء میں غوربل نے فنڈلے خاندان یعنی میری بیوی لوسیلی' مجھے اور ہمارے دو بچوں ڈائنا اور کریگ کو مصر کی سیر کرنے کی دعوت دی۔ ہم نے وہ دعوت قبول کرلی اور جولائی 1972ء میں وہاں ایک خوشگوار ہفتہ گزارا جس کے دوران ہم نے مصر کے عظیم الشان آثارقدیمہ دیکھے اور اس کے اس وقت کے سلامتی کے مسائل کا مشاہدہ کیا۔ بہت سے مسلمانوں نے گھروں اور دفاتر میں ہماری خوب مہمان نوازی کی مگر گفتگوؤں کا مرکزی موضوع مذہب نہیں بلکہ سیاست اور جنگ کا خطرہ رہا۔

اس زمانے میں قاہرہ نے جون 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ' جس میں اس نے بھاری نقصانات برداشت کیے تھے' کی یادیں تازہ کی ہوئی تھیں۔ مصری حکومت نے اس خوف سے کہ اسرائیل دوبارہ ہوائی حملے نہ کردے' تمام شہر میں اہم عمارتوں اور عجائب گھروں کے گرد ریت کی حفاظتی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ پانچ سال پہلے جنگ کی وجہ سے ٹوٹنے والے مصر امریکہ سفارتی تعلقات مکمل طور پر بحال نہیں ہوئے تھے اور تاریخی طور پر مصر کا حصہ جزیرہ نمائے سینائی ہنوز اسرائیلی فوجوں کے قبضے میں تھا۔

نہر سویز کے غربی کنارے پر جنگ سے تباہ حال سویز شہر کے مختصر دورے کے دوران ہم نے اس کے شرقی کنارے پر اسرائیلی فوجیوں کو گشت کرتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے بارودی سرنگوں کے خوف کے ساتھ ملبے کے درمیان' جو کبھی مصر کا وسیع' پررونق تفریحی شہر تھا' انسانی زندگی کی صرف ایک واحد علامت دیکھی یعنی سوکھنے کے لیے لٹکائے گئے کپڑے ـــــ قریب ہی ہم نے بموں سے تباہ ہونے والی ایک آئل ریفائنری (تیل صاف کرنے کے کارخانے) کی باقیات کو دیکھا' جو کبھی مصر کی معاشی ترقی کی ایک مثال تصور ہوتی تھی۔ اس وقت ہمیں اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ وہ بربادی مذہبی عدم رواداری سے تحریک پانے والی

جنگ کی دہشتناک پیداوار تھی۔

پندرہ ماہ بعد اکتوبر 1973ء میں عرب اسرائیلی تنازع دوبارہ بھڑک اٹھا۔ یہ تنازع شروع شروع میں تو اسرائیل کے لیے خطرناک ثابت ہوا جب ہتھیاروں اور رسد کی قلت کی شکار اسرائیلی افواج کو شکست ہونے کا امکان تھا۔ تاہم بعد میں جب اسرائیلی فوجوں کو امریکہ نے فوری طور پر رسد بہم پہنچا دی تو بازی مصر کے خلاف ہوگئی اور اسرائیلی فوجیں قاہرہ تک پہنچ گئیں۔

جنگ کے بعد رونما ہونے والی صورتحال نے مجھے مہرسکوت توڑنے کی تحریک دی۔ میں نے بے وطن فلسطینیوں کے نظرانداز شدہ المیے پر نوحہ خوانی کی۔ ان بیانات نے مجھے ایک ایسے مباحثے کا مرکز بنا دیا جو اس قدر توجہ طلب اور بھرپور تھا کہ اسلام کا مطالعہ التوا کی نذر ہوگیا۔

میں نے اسلام پر کوئی غور نہیں کیا جو کہ بیشتر فلسطینیوں کا مذہب تھا' نہ ہی میرے ساتھیوں نے عرب اسرائیلی تنازعے کے اسلامی پہلو پر گفتگو کی۔ اسلام کے موضوع کو کیپٹل ہل پر نظرانداز کردیا گیا تھا' اس کا ایک حد تک سبب یہ بھی تھا کہ کبھی کسی مسلمان نے کانگرس میں خدمات انجام نہیں دی تھیں۔ مجھے ایسا ایک موقع بھی یاد نہیں جب کانگرس کی کسی کمیٹی میں اسلامی تصورات پیش کیے گئے ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو 1970ء کی دہائی میں کیپٹل ہل کے چھ ہزار سے زیادہ تعداد والے عملے میں مشکل ہی سے کوئی ایک مسلمان رہا ہوگا۔

جہاں تک میں جانتا تھا چار لاکھ پچاس ہزار افراد پر مشتمل میرے حلقہ انتخاب میں کوئی مسلمان نہیں رہتا تھا۔ اسلام سے میری لاعلمی صدمہ انگیز تھی۔ ناٹو (NATO) میں گہری دلچسپی کے باوجود میں اس اتحاد کے ایک کلیدی رکن ترکی کو مسلمان ملک کے طور پر نہیں جانتا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ میں اس زمانے میں اسلام کو صرف عرب دنیا تک محدود تصور کرتا تھا۔

1974ء میں عوامی جمہوریہ یمن میں امدادی مشن کے دوران میں نے دو دیگر مسلمان ملکوں لبنان اور شام میں قیام کیا تھا۔ بیروت اور دمشق کے ساتھ ساتھ عدن میں ہونے والے تبادلۂ خیالات سے مجھے امریکی پالیسی کے حوالے سے عرب خدشات کے بارے میں پہلی مرتبہ براہ راست آگہی ہوئی اور عرب اسرائیلی سیاست کے حوالے سے میری معلومات میں اضافہ ہوا۔

جب میں یمن سے واپس کیپٹل ہل پہنچا تو ان تجربات نے مجھے امریکہ کی مشرق وسطیٰ پالیسی میں عرب دشمن تعصب کے خلاف احتجاج کرنے کی تحریک دی۔ میں نے جون 1967ء کی جنگ کے زمانے میں یمن اور بہت سی دوسری عرب ریاستوں کے ساتھ خراب ہو جانے والے سفارتی تعلقات کو بحال کرنے میں حکومت کی ناکامی پر تنقید کی۔ میں نے امریکی حکومت پر زور دیا کہ وہ اسرائیل کی تمام تر امداد اس وقت تک معطل کر دے جب تک وہ فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی پامالی اور لبنان کے خلاف فوجی جارحیت روک نہیں دیتا۔ میں نے کہا کہ آگے چل کر عربوں کے خلاف تعصب امریکہ اور اس کے ساتھ ساتھ اسرائیل کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہوگا۔

اس تعصب کے خلاف میری احتجاجی مہم آٹھ برسوں پر محیط ہوگئی' جن کے دوران مجھے بے پناہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایک مساویانہ پالیسی کا واحد وکیل تھا۔ میری اس حیثیت کی زبردست مخالفت کیپٹل ہل کے ساتھ ساتھ میری آبائی ریاست میں بھی کی گئی۔ حتیٰ کہ نومبر 1982ء کے انتخاب میں میری شکست کی ایک بڑی وجہ میری یہی احتجاجی مہم تھی۔

مشرق وسطیٰ کے سیاسی میدان جنگ میں اس لمبے اور بھرپور تجربے کے بعد دو برس تک میں نے ایسی ہی شدت کے ساتھ تحقیق کی اور معلومات اکٹھی کر کے کتاب لکھی ''وہ بولنے کی جرأت رکھتے ہیں: اسرائیلی لابی کا مقابلہ کرنے والے افراد اور ادارے'' (They Dare to speak out: People and institutions confront Israel's Lobby)

میں تو حیرت زدہ رہ گیا جب مختصر عرصے میں اس کتاب کی تین لاکھ سے زیادہ جلدیں فروخت ہوئیں اور یہ ایک بیسٹ سیلر بن گئی۔ مجھے اس کتاب کے قارئین کی طرف سے زبردست اور ولولہ انگیز دادوتحسین حاصل ہوئی۔ کتاب کی اشاعت کے بعد پہلے پانچ مہینوں میں مجھے نو سو خطوط موصول ہوئے۔ میں نے 1985ء کے موسم گرما کے شروع میں دونوں بندرگاہوں اور ان کے درمیان واقع بڑے بڑے شہروں میں چالیس سے زیادہ مرتبہ میڈیا پروگراموں میں شرکت کی۔ تین سال کے عرصے کے دوران میں نے لاتعداد دعوت نامے قبول کیے جن میں سے کچھ عرب طلبہ کے گروپوں کی طرف سے آئے تھے جنہوں نے امریکی کالجوں اور یونیورسٹی کیمپسوں میں میرے لیکچر کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے کینیڈا' یمن' اردن' متحدہ عرب امارات' سعودی عرب' عراق' انگلستان اور مصر میں بھی چھوٹے بڑے مختلف اجتماعات سے خطاب کیا۔ کئی شہروں میں انفرادی گفتگو بھی ہوئی۔ غیر رسمی گفتگو آزادانہ زندگی میں

درپیش سماجی اور سیاسی مسائل کے بارے میں بتایا۔

اس کتاب نے میری زندگی میں گہری تبدیلیاں پیدا کیں اور نئے سحرانگیز دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ مسلمان مجھ سے ملنے آئے اور میں ان سے ملاقاتیں کرنے گیا۔ 1989ء میں میری کتاب کے مرکزی خیال سے تحریک پاکر مرد و خواتین کے ایک گروپ نے کونسل برائے قومی مفاد (CNI) قائم کرنے میں مدد دی۔ پانچ سو ارکان پر مشتمل یہ تنظیم واشنگٹن میں قائم ہے جو مشرق وسطیٰ کے حوالے سے متوازن امریکی پالیسیوں کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کی قیادت اور حمایت کرنے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی اور یہودی بھی نمایاں رہتے ہیں اور سی این آئی کے تنظیمی اجلاسوں میں معاونت کرتے ہیں۔ سی این آئی کے صدر امریکی محکمۂ خارجہ کے تجربہ کار افسر جین برڈ ہیں۔

بعدازاں اسی برس ایک مسلمان طالب علم نے کنساس یونیورسٹی میں ڈربن جنوبی افریقہ کے بین الاقوامی ترویج اسلام مرکز کو دیئے گئے' میرے لیکچر کی وڈیو ٹیپ مجھے ارسال کی۔ یہ تنظیم دنیا بھر میں اسلامی دستاویزات اور وڈیو ٹیپیں تقسیم کرتی ہے۔ مئی 1989ء میں اس مرکز کے صدر احمد دیدات کا پیغام موصول ہوا۔ انہوں نے مجھے اور لوسیلی کو کیپ ٹاؤن آنے کی دعوت دی تھی جہاں وہ میرے ساتھ ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرنے کے خواہش مند تھے۔

ہم نے یہ دعوت قبول کرلی اور جولائی میں آدھی دنیا کے گرد سفر کرکے جنوبی افریقہ پہنچ گئے۔ یہ کئی مواقع میں سے ایک تھا جب لوسیلی اسلام کے سلسلے میں کیے گئے سفر میں میری ہم سفر بنی تھی۔ یہ وہ تجربات تھے جنہوں نے ہماری زندگیاں باثروت بنادی تھیں اور جنہیں ہم نے خود مختلف مذاہب سے ہونے کے باوجود شادی کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے دوستیوں کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ لوسیلی نسبی اعتبار سے رومن کیتھولک تھی' یہ مذہب اُسے اپنے فرانسیسی نژاد والد اور آئرش والدہ سے ورثے میں ملا تھا۔ میری پریسبائٹیرین جڑیں پیچھے سکاٹ لینڈ میں تھیں۔ حالیہ برسوں میں اپنے ہندو ہمسایوں پربھاکر اور ایاگری خاندانوں کے ساتھ قریبی دوستی نے ہمارے مذہبی آفاق کو مزید وسعت عطا کردی ہے اور ہمیں دوسرے عقیدوں کے حامل لوگوں کے ساتھ سکون محسوس کرنے اور اپنے عقیدے ہی کے درست ہونے کا دعویٰ نہ کرنے کی طرف مائل کیا ہے۔

احمد دیدات اور ان کے عملے کے ساتھ ہونے والی نشستیں ایک اہم تعلیمی تجربہ ثابت ہوئیں حالانکہ میں کتاب کی ترویج اور لیکچروں کے سلسلے میں امریکہ میں بڑی تعداد

میں مسلمانوں سے گفتگو کر چکا تھا تاہم میں نے جب تک جنوبی افریقہ میں احمد دیدات سے تبادلۂ خیالات نہیں کیا تھا میں اسلام کے حوالے سے جھوٹے یک رُخے تصورات سے آگاہ نہیں تھا۔ نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ عرب امریکی اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اپنی گہری اور دیرپا دلچسپی کے باوجود میں ان باتوں سے آگاہ نہیں تھا۔

ڈربن میں مسلمانوں کے اعمال کے ساتھ ساتھ اصولوں پر بھی گفتگو ہوئی۔ ایک دفعہ گفتگو کے دوران احمد دیدات کے عملے کے ایک فرد نے لفظ مسلم (Muslim) کے میرے تلفظ کی درستی کی بھی زحمت کی۔ میں غلط تلفظ کے ساتھ اسے موزلم (Mooz-lim) یا مازلم (Maaz-lim) بولا کرتا تھا۔ تب سے میں دوسرے لوگوں کو درست تلفظ مُسلم (Muslim) ادا کرنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ بظاہر یہ ذمہ داری معمولی سی دکھائی پڑتی ہے تاہم میں نے بہت عرصہ پہلے ہی یہ جان لیا تھا کہ ناموں کا درست تلفظ افراد کی عزت اور احترام کی ترجمانی کرتا ہے نیز یہ اس حقیقت کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ کسی فرد کے مذہبی تشخص کا بھی احترام اور درست تلفظ کرنا چاہیے۔

جنوبی افریقہ میں ہونے والے بیشتر مباحثوں میں اسلام کے حوالے سے عیسائیوں کے غلط تصورات پر توجہ مرکوز کی گئی۔ ان گفتگوؤں کے دوران دیگر یک رخے تصورات کے ساتھ ساتھ پانچ ایسے یک رُخے تصورات ابھر کر سامنے آئے جو بین المذاہبی اور بین الثقافتی ہم آہنگی اور تعاون میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ وہ پانچ یک رُخے تصورات اسلام کو دہشت گردی اور جنون پسندی' عورتوں پر جبر و استبداد' غیر مسلموں کے ساتھ عدم رواداری' جمہوریت دشمنی اور ایک اوپرے (Alien) اور انتقام پرور خدا کی عبادت سے جوڑتے تھے۔

میں آئندہ صفحات میں ان یک رُخے تصورات کو زیادہ تر اپنے ذاتی تجربے سے واضح کروں گا اور یہ دکھاؤں گا کہ اسلام کی درست تفہیم کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ یہ صرف ایک جھلک ہی ہے۔ ایک اعتبار سے یہ کتاب میرے ذاتی آگہی کے لئے کئے گئے سفر کا روزنامچہ (ڈائری) ہے۔ اس سفر کے دوران میں نے اپنے پرانے یک رُخے تصورات کی اصلاح کی۔ تاہم یہ اس سے کچھ سوا ہے۔ یہ ایک بیش قدر اور طویل مدت سے نظر انداز شدہ مقصد (کاز) کے بہادر ہراول دستے یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے علاوہ مسلمانوں کی ان تھک جدوجہد کی دستاویز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے ہزاروں لوگ اور بھی موجود ہیں جن کی

خدمات میری توجہ کا مرکز نہیں بن پائیں۔ اصلاح کے عمل کو بڑھانے والے اسلام کے پیروکار ایسے لوگ ہیں جو علم' تجربے اور جذبۂ محرکہ سے مالا مال ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کاز میں مسلمانوں کی براہِ راست شمولیت خاصی ہے اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے تاہم افسوس ناک امر یہ ہے کہ بیشتر مسلمان حصہ نہیں لیتے ہیں۔ ان کی ہچکچاہٹ سمجھ میں آتی ہے۔ بہت سے تارکین وطن (امیگرینٹس) ایسے ملکوں سے آئے ہوئے جہاں سیاسی سرگرمی یا تو وجود ہی نہیں رکھتی ہے یا بہت ہی محدود ہے اور وہ اس میدان میں قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں جہاں انہیں یوں دکھائی دیتا ہے گویا ہر کسی کے لیے پریشانیاں عام ہیں' جہاں امیدوار اکثر و بیشتر الزامات اور جوابی الزامات میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک اور بے حوصلہ کر دینے والی حقیقت یہ ہے کہ امریکی خبروں میں سیاست اور سیاست دانوں کے تاریک اور بے کشش پہلو غالب رہتے ہیں۔ میں سیاست میں طویل مدت گزارنے کے سبب سے خوب آگاہ ہوں کہ بیشتر منتخب شدہ لوگ دیانتدار اور محنتی ہوتے ہیں تاہم میڈیا معمولی خامیوں کو زیادہ توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ بدعنوانی (کرپشن) کبھی سیاست میں قدرے غیر نمایاں اور کبھی اسی پر غالب دکھائی دیتی ہے۔

ان تاریک حقیقتوں سے اچھے لوگوں کو بے حوصلہ نہیں ہونا چاہیے خصوصاً ان افراد کو جو رائد ین میں شامل ہوتے ہوئے عقیدے کے مطابق نیکوکاری کی زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ انہیں اُس عمل میں شرکت کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے جو حتمی طور پر طے کرتا ہے کہ حکومتی پالیسیاں کیسی ہوں گی اور کون ان پر عمل درآمد کرے گا۔

میری رائے میں سیاسی عمل میں شریک ہر فریق کی جیت لازمی ہوتی ہے۔ اگر مسلمان سیاست میں حصہ لیں تو وہ بین المذاہب دوستی اور احترام میں وسعت پیدا کریں گے اور اگر غیر مسلم ان ذمہ داریوں میں شریک ہوں گے تو اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ ان کے ذاتی روابط اور مشترکہ کاز کی وجہ سے وہ جھوٹے خیالات مٹ جائیں گے جنہوں نے اس عقیدے کے حوالے سے امریکہ کے تصور کو مسخ کر رکھا ہے نیز یک رُخے تصورات قائم کرنے سے ناگزیر طور پر پیدا ہونے والا مسلمانوں کا غصہ اور بے چینی ختم ہو جائیں گے۔ فوری طور پر ایسی کاوشیں وطن اور بیرون وطن مسلمانوں کے معیار زندگی میں بہتری لائیں گی اور امریکہ کے انصاف اور رواداری کی سرزمین والے ریکارڈ کو مستحکم کریں گی۔

ستمبر 1999ء میں پومانا' کیلیفورنیا میں مسلمانوں کے ایک اجتماع سے میرے

خطاب کے بعد اس عمل میں میرا کردار عمل انگیز کی حیثیت سے گفتگو کا موضوع بن گیا۔ میری آراء سننے کے بعد ضرورت مند بچوں کی مدد کے لیے نزدیک ہی ایک کلینک قائم کرنے والی ماہر دندان ڈاکٹر ناز حق نے مجھ سے ایک سوال دریافت کیا۔ انہوں نے پوچھا تھا: ''ایک مسلمان کی حیثیت سے میں متجسس ہوں کہ آپ کو جو کہ ایک عیسائی ہیں کس چیز نے اسلام کے جھوٹے تصورات کے بارے اس قدر متفکر بنا دیا۔ کیا اس کا سبب کوئی شخص تھا یا کوئی واقعہ؟''

اس سے پہلے ایسا سوال کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنے خیالات مجتمع کیے پھر انہیں بتایا کہ یہ ایک مجموعی عمل تھا۔ میں نے بتایا کہ میں برسوں میں اس صداقت کا قائل ہوا کہ ان غلط تصورات کی درستی مشرق وسطیٰ میں امن کے لئے اہم بلکہ حقیقتاً لازمی ہے۔ انہوں نے اس واضح اعلان کا جواب میں ایک الجھی ہوئی نگاہ سے دیا۔

خوش قسمتی سے انہوں نے میرے جواب کی وضاحت کرنے تک توقف کیا۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں اسلام کے بارے میں یک رُخے تصورات نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ تمام امریکیوں کے لئے نقصان دہ ہیں۔ یہ ہمسائیگی کی سطح پر بین المذاہب رواداری اور ہم آہنگی میں رکاوٹ بنتے ہیں' بے چینی' بے اعتمادی' اضطراب یہاں تک کہ خوف کا باعث بنتے ہیں اور بعض اوقات تشدد کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ واشنگٹن میں انہوں نے ایک ایسی افسوسناک فضا تخلیق کر دی جس کی وجہ سے شہری آزادیوں کے لیے ضرر رساں قانون سازی ہوئی۔ اس کی ایک مثال وہ قانون ہے جو وطن بدری کے مقدمات میں خفیہ شہادت کو جائز قرار دیتا ہے۔ اب بھی اعلیٰ تر سطح پر یہ غلط تصورات خارجہ پالیسی میں ایک تعصب کو بڑھاوا دیتے ہیں جو امریکہ کی عالمی ساکھ کو گزند پہنچاتا ہے نیز صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ انسانی حقوق کے لیے عالمگیر قیادت فراہم کرنے کی ہماری اہلیت کو سنگین حد تک متاثر کرتا ہے۔

اجتماع گاہ سے نکلنے سے پیشتر میں نے دوبارہ ڈاکٹر ناز حق کی توجہ مبذول کروائی تاکہ کچھ مزید خیالات کا اضافہ کر سکوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے انہیں جو جواب دیا ہے اس سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ میں یہ واضح کرنے میں ناکام رہا ہوں کہ ان یک رُخے تصورات کو کیسے نہایت تیزی کے ساتھ مٹایا جا سکتا ہے۔ انہیں مٹانے کے لیے سیاسی اقدام کی ضرورت ہے' سیاست وسیع مفہوم میں۔ تمام امریکیوں کو ـــ میرے جیسے عیسائیوں نیز مسلمانوں تمام امریکیوں ـــ میرے جیسے عیسائیوں نیز مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عمل کے میدان میں نکل آئیں۔ میں نے ضرورت مند بچوں کی بہتر صحت کے لیے ان کی خدمات

کو سراہا لیکن تاکید کی کہ وہ سیاسی میدان میں کوئی اہم ذمہ داری بھی سنبھالیں۔ مسلمانوں کے بارے میں یک رُخے تصورات کو لازماً صاف ہونا چاہیے اور فوری طور پر ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ اس کاز کی ذمہ داری قبول کریں گی تو بچوں کے لیے ان کی پیشہ ورانہ خدمات میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔ درحقیقت سیاسی میدان میں کوئی تعمیری کردار قبول کرنا ہر عمر کے امریکیوں کی خدمت کرنا ہے۔

وہ مسکراتے ہوئے بولیں: ''میں اس پر غور کروں گی۔''

شاید قاری بھی اس بات پر تھوڑا غور کریں گے۔

پال فِنڈ لے

1040 ویسٹ کالج ایونیو

جیکسن وائل الی نائے 62650

20 / مارچ 2001ء

پہلا باب

اسلام کے بارے میں میرے اولین مغالطے اور ان کی اصلاح

جھوٹے یک رُخے تصورات ہر عمر کے لوگوں سے سچائی کو چھپا لیتے ہیں۔ چھ برس کی عمر میں میرا اسلام سے تعارف ایک برا آغاز تھا۔ جیکسن وائل الی نائے میں پریسبائٹیرین سنڈے سکول میں مجھے مسلمانوں اور ان کے مذہب کے بارے میں گمراہ کیا گیا اور میں ادھیڑ عمری تک غلط معلومات کا حامل رہا۔

ہماری استانی نے' جو کہ رضا کارانہ طور پر برسوں خدمات انجام دیتی رہیں' ہمیں بتایا کہ غیر تعلیم یافتہ' غیر تہذیب یافتہ' تشدد پسند لوگ ''ارض مقدس'' کے صحرائی علاقوں میں رہتے اور ایک ''اجنبی خدا'' کی عبادت کرتے ہیں۔ میں بچپن کی یادیں تازہ کرتا ہوں تو ایک بات یاد آتی ہے کہ وہ انہیں محمڈنز (Muhammadans) کہتی تھیں اور بار بار کہا کرتی تھیں کہ ''وہ ہمارے جیسے نہیں ہیں۔''

ان کے تبصرے میرے ذہن سے چپک کر رہ گئے۔ مَیں اپنی بیشتر زندگی محمڈنز کو اجنبی' جاہل اور خطرناک لوگ تصور کرتا رہا۔ آج کے بہت سے امریکیوں کی طرح میری استانی بھی غلط معلومات رکھنے والے دوسرے لوگوں سے سن کر وہی غلط معلومات معصومیت کے ساتھ دہرا دیتیں۔ وہ جس بات کو سچ سمجھتی تھیں اُسی کو ہماری جماعت کے سامنے بیان کر دیتیں' بشمول غلط نام ''محمڈنز'' کے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ ان کی نیت اسلام کو بدنام کرنے یا غلط معلومات پھیلانے کی ہو۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ انہیں حقائق کا علم ہی نہیں تھا' بالکل اُسی طرح جس طرح دوسرے اساتذہ اور ہمارے مذہبی اجتماعات کی رہنمائی کرنے والے اور یوں

کو نہیں تھا۔ امریکی پریسبائیٹرین چرچ کے قومی دفاتر اسلام اور بین المذہبی افہام و تفہیم کی ضرورت کے بارے میں معلوماتی دستاویزات جاری کر چکے ہیں۔ تاہم ابتدائی زمانوں کے نقصانات کے ازالے کا کام تو صرف شروع ہی ہوا ہے۔

حتیٰ کہ خدا کی تعریف پر مبنی مشہور گیت ''پرانے زمانے کے جنگجوؤں سے'' بھی غلط تصورات سے معمور تھا۔ ستر برس بعد بھی مجھے اس کی دھن اور الفاظ کے ساتھ خدا کی تعریف میں لکھے گئے گیتوں کی کتاب کا صفحہ نمبر 219 یاد ہے' جس پر یہ گیت درج تھا۔ افتتاحی مشقیں ہمیشہ اجتماعی گانے پر مشتمل ہوتی تھیں اور ہم خدا کی تعریف میں لکھا گیا گیت نمبر 219 نہایت شوق سے گایا کرتے تھے۔ یہ ارض مقدس پر حملہ کرنے والے عیسائی صلیبی لشکروں کی یاد میں لکھا گیا شوخ و چنچل گیت ہے۔ ''پرانے زمانے کے جنگجوؤں سے' پہاڑوں کی بلندیوں پر نگاہ رکھے ہوئے' عیسیٰ کے آخری عشائے ربانی کے مقدس پیالے کا تصور ابھرا اور منتظر رات نے صدا دی' جھلک کے پیچھے آؤ' ساری دنیا پر جھنڈے لہرا دو' ساغر کی جھلک کے پیچھے بڑھو جو کہ عیسیٰ کے آخری عشائے ربانی کا ساغر ہے۔''

یہ گیت اسلام کے ایک مسخ شدہ تصور کو پیش کرتا ہے جس کو بہت سے' شاید بیشتر عیسائی اب بھی درست تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے کہ جنگجوؤں نے' جو اس گیت کے ہیرو ہیں' درحقیقت ہزاروں معصوم مسلمانوں کو ذبح کر دیا تھا اور اس قتل عام کا جشن بھی منایا تھا۔ اپنے آپ کو عیسائی کہلوانے والے ان صلیبی جنگجوؤں نے رواداری' رحم دلی اور انصاف کے ساتھ اپنے مذہب کی وابستگی کو نظرانداز کر دیا تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے انتقام پرور اور خون کے پیاسے وحشیوں کی طرح عمل کیا تھا۔

یہ گیت اس وقت اپنی تمام کشش کھو بیٹھا جب میں نے 15/ جولائی 1099ء کو یروشلم کے خونیں منظر کے بارے میں وہیں موجود ایک صلیبی جنگجو کی تحریر پڑھی: ''ہمارے لوگ تلواریں لہراتے سارے شہر پر چڑھ دوڑے' انہوں نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا' ان کو بھی نہیں جو رحم کی التجائیں کر رہے تھے۔ خون گھوڑوں کے گھٹنوں تک آ گیا' نہیں' نہیں' ان کی لگاموں تک آ گیا۔ یہ خدا کا منصفانہ اور حیرت انگیز فیصلہ تھا۔'' [1] یہ قتل عام صرف یروشلم تک ہی محدود نہیں تھا۔ صلیبی جنگجوؤں نے ''کافروں اور مرتدوں'' کو ڈھونڈتے ہوئے پورے مشرق وسطیٰ' خاص طور پر انطاکیہ اور قسطنطنیہ میں مسلمانوں' یہودیوں اور یہاں تک کہ دوسرے عیسائیوں کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے برعکس تین مواقع پر' جب مسلمانوں

نے یروشلم پر قبضہ کیا' کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔

1998ء تک' جب میں اپنی عمر کے ستترویں برس میں پہنچا' مجھے علم نہیں تھا کہ مسلمان اپنے غلط نام ''محمڈن'' پر کیوں سخت اعتراض کرتے ہیں۔ ایک نومسلم مصنف اینڈریو پیٹرسن نے وضاحت کی: ''یہ اسلام کے بارے میں ایک گہری غلط فہمی کا باعث بنتا ہے اور یہ مغالطہ پیدا کرتا ہے کہ مسلمان پیغمبر حضرت محمدؐ کو کسی دیوتا کی طرح پوجتے ہیں ـــ حالانکہ وہ حضرت محمدؐ کو خدا کا آخری پیغمبر مانتے اور ان کا احترام کرتے ہیں' ان کی پرستش نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف اور صرف خدائے واحد پر ایمان اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سب سے پہلے آتا ہے۔'' انہوں نے بتایا کہ باقی ارکان ہیں: روزانہ پانچ وقت نماز ادا کرنا' زکوۃ ادا کرنا' رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا اور اگر صحت اور مالی وسائل اجازت دیں تو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ حج کرنا۔ جو مسلمان ان پانچوں فرائض کو پورا کرتے ہیں انہیں اچھے مسلمان تصور کیا جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے یہ مغالطہ پیدا کرنے والی اصطلاح ''محمڈن'' برقرار رہے کیونکہ بیشتر عیسائی' جو ایک ایسے عقیدے کے پیروکار ہونے کے باوجود' کہ جسے آفاقی طور پر توحیدی عقیدہ جانا جاتا ہے' تثلیثی خدائی (Trinitarian Deity) یعنی خداوند فرزند' خداوند پدر اور روح مقدس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ عیسائی اس مغالطے کا شکار ہوں کہ اسلام میں بھی سہ شخصی خدا موجود ہے۔ ہوسکتا ہے دوسرے کے لیے تثلیثی عقیدہ میری طرح بچپن کے تجربوں سے ابھرتا ہو۔

چونکہ اسلام کے حوالے سے غلط تصورات بچپن ہی سے میرے ساتھ رہے اس لیے میں دوسرے امریکیوں کو ایسے ہی مغالطوں کو مانتے ہوئے پاکر حیرت نہیں کرتا۔ اس حوالے سے پورے امریکہ میں سنڈے سکول کی جماعتوں سے برس ہابرس سے بلاروک ٹوک پھیلتے جانے والے گمراہ کن یک رُخے تصورات ایک عظیم شر ہیں' جن پر غور کرنا ایک سنجیدہ اور معتدل رویہ ہوگا۔ اثر قبول کرنے کو تیار لاکھوں بچے ممکن ہے غلط معلومات کو سچ سمجھ کر قبول کر چکے ہوں اور انہیں برسوں اصلاح کیے بغیر دوسرے لاکھوں لوگوں تک پہنچاتے رہے ہوں۔

اسلام کے بارے میں میری آگہی کی شروعات 1974ء میں عدن والے امدادی مشن سے ہوئی۔ جہاں پانچ دن تک میرا اپنے ساتھ رہنے والے ایک خوش وضع' خوبصورت اور توانا نوجوان پروٹوکول افسر صالح عبداللہ سے تبادلہ خیال رہا اور نادانستہ طور پر وہ میرے

اسلام کے استاد بن گئے۔عدن میں سیر کے مقامات بہت کم تھے' ریڈیو نشریات ایک ایسی زبان میں تھیں جو میں سمجھتا نہیں تھا' یعنی عربی میں۔ خوش قسمتی سے عبداللہ انگریزی روانی سے بولتے تھے۔ ٹیلی ویژن تقریباً ناموجود تھا۔ ہماری رفاقت گھنٹوں پر محیط ہوا کرتی تھی اور ہم مشرق وسطیٰ کی سیاست پر تبصرے کیا کرتے تھے' تاہم ہماری گفتگو کا رخ باقاعدگی سے اسلام کی طرف مڑ جایا کرتا تھا۔ شاید اس موضوع نے مجھے اس لئے اپنی طرف مائل کیا کہ مجھے جنوبی یمن کے الگ تھلگ ہونے کا احساس ستاتا تھا۔ بیرونی دنیا سے خبروں کا موصول نہ ہونا' ہجوم اور بہت زیادہ گاڑیوں کی عدم موجودگی' صحرا کا سکون' تابناک ساحلوں کا خالی پن اور خلیج عدن کی وسعت' ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ میں نے کسی کے ساتھ مسلمانوں کے عقیدے پر تبادلۂ خیال کیا۔

ایک روز جب ہم شہر کی سیر پر تھے' عبداللہ نے ایک سفیدی شدہ عمارت کے بارے میں بتایا کہ یہ ایک مسجد ہے اور یہ بھی بتایا کہ شہر میں ایسی کئی مساجد ہیں۔اس پر مجھے یہ سوال پوچھنے کی تحریک ملی کہ کیا سوویتوں نے' جو کہ دہریت اور آمریت کے حامل تھے' مقامی مذہبی روایات میں مداخلت کی اور مساجد کو بند کیا؟

انہوں نے قابل فہم انداز میں تفصیلی جواب دیا ''نہیں' آپ کو لازماً یہ سمجھ لینا ہوگا کہ ہماری حکومت بیرونی اثرات سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ہم اپنی آزادی کی بہت زیادہ قدر کرتے ہیں۔سوویتوں نے' جو کہ کئی اعتبار سے مددگار رہے ہیں' لیکن مذہب میں مداخلت کی کوئی کوشش نہیں کی۔اگر وہ کوشش کرتے تو اس کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوتا۔''

میں نے اپنے عیسائی ہونے کے بارے میں بتایا اور پوچھا کیا ان کی حکومت دوسرے مذاہب کو برداشت کرتی ہے؟ ''ہاں' عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو اپنے اپنے عقائد پر عمل کی اجازت ہے۔ہماری حکومت مذہبی آزادی کی ضامن ہے۔درحقیقت ذرا ہی آگے بائیں طرف عیسائیوں کا چرچ ہے۔اب اس کے چند ہی ارکان ہیں تاہم یہ ان دنوں بہت مصروف ہوتا تھا جب عدن پر برطانیہ کا قبضہ تھا۔مجھے یقین ہے کہ ہمارے سارے عوام اسلام سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔بچوں کو مذہب کی تعلیم مکمل طور پر دی جاتی ہے اور ہماری مقدس کتاب قرآن کا مطالعہ ان پر فرض ہے۔ہم چاہے کتنے ہی بوڑھے ہو جائیں اس کا مطالعہ ضرور کرتے ہیں۔بہت سے یمنیوں نے' ممکن ہے عدن میں ہی ہزاروں نے' اسے یاد کیا ہوا ہے اور وہ اس کے ایک ایک لفظ کی اپنی یادداشت سے تلاوت کر سکتے ہیں۔''

میں نے کوئی بات تو نہیں کی تاہم میں اس آخری بیان سے متاثر ہوا۔ میرے کئی شناسا عیسائی بائبل کے بعض اجزا کو تو سنا سکتے ہیں مگر کوئی بھی اس کے سارے متن یا میرے علم کی حد تک اس کی کسی ایک پوری کتاب کو بھی زبانی نہیں سنا سکتا۔ میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کی تھوڑی سی تعداد ہی پورے قرآن کی تلاوت کر سکتی ہوگی لیکن ایسا لگتا ہے کہ سب نے طویل اجزا یاد کیے ہوئے ہیں۔ عبداللہ کے ساتھ مجھے یہ عادت پڑ گئی تھی سو تب سے میں جب بھی مسلمانوں سے اسلام کے بارے میں پوچھتا ہوں ان کے جوابات میں قریباً ہمیشہ ہی قرآن کا ایک نہ ایک موزوں حوالہ ضرور شامل ہوتا ہے۔

عبداللہ نے کہا کہ آج سیر ضرور کریں گے کیونکہ آج جمعہ ہے' جو کہ تعطیل کا دن ہے۔ ''حکومتی اہلکار آج ملاقاتوں کے لیے دستیاب نہیں ہیں' سو عدن کی سیر کا یہ مثالی وقت ہے۔ جمعہ کو قریباً تمام دفاتر اور حکومتی خدمات کی تعطیل ہوتی ہے' اس خاص روز مسلمان مساجد میں خصوصی طور پر نماز ادا کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔''

جب میں نے کہا کہ عیسائیوں کا عبادت کا خصوصی دن اتوار ہے تو انہوں نے کہا ''مسلمانوں کے لیے ہر روز عبادت کا دن ہوتا ہے۔ ہمارے عقیدے کے مطابق صرف جمعہ کو ہی نہیں بلکہ ہر روز پانچ وقت مسجدوں میں نماز ادا کی جاتی ہے' جس کے لیے باقاعدہ اذان دی جاتی ہے۔'' میں اپنے آپ کو بولنے سے نہیں روک سکا اور کہا: ''مجھے امید ہے کہ اگر میں ایک ذاتی سوال پوچھوں تو آپ برا نہیں مانیں گے۔ ہم گھنٹوں ساتھ رہے ہیں مگر میں نے کبھی آپ کو نماز ادا کرتے نہیں دیکھا۔ کیا آپ پر میری رفاقت کی وجہ سے پابندی لاگو نہیں ہے؟'' عبداللہ نے برا نہیں مانا اور بولے: ''آپ نے غور نہیں کیا ہے۔ شیڈول مجھے مطلوبہ اوقات میں نماز کی اجازت دیتا ہے اور آپ تو دوسرے معاملات میں معروف ہوتے ہیں جبکہ نماز میں تو چند ہی منٹ لگتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہم ہر روز گرمی کی شدت کے اوقات میں ایک دوسرے سے الگ آرام کر رہے ہوتے ہیں۔ میں اپنی نمازوں کا ناظم الاوقات ترتیب دے چکا ہوں۔ اسلامی قانون ہمیں نمازیں قضا کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور ہم صرف اسی صورت میں نمازیں بعد میں ادا کر سکتے ہیں کہ یا تو موسمی حالات بہت خراب ہوں یا ہم سفر کر رہے ہوں۔''

اس مرحلے پر ڈرائیور نے' جو کہ انگریزی نہیں بولتا تھا شیورلیٹ کار ایک کم بلند لمبی ... صبح کیا ... عبداللہ ... گھر ... معمول میں

تو جمعہ کے روز بند ہوا کرتا ہے تاہم اسے آپ کے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ سعودی عرب اور اومان سے ہونے والی حالیہ سرحدی لڑائی کے دوران ہماری فوج کے ہاتھ لگنے والے فوجی آلات دیکھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان سب پر لکھا ہے "ساختۂ امریکہ" (Made in America)۔

عجائب گھر کی رہنما (گائیڈ) فریدہ ضائر اٹھارہ برس کی خوش وضع خاتون تھیں جنہوں نے دل کش مغربی لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ بھی عبداللہ کی طرح روانی سے انگریزی بولتی تھیں۔ وہ فارمیسی (ادویہ سازی) کی تعلیم سے پہلے یک سالہ لازمی مطلوبہ حکومتی ملازمت کر رہی تھیں۔ مختصر استقبالیہ تقریر میں انہوں نے اپنے وطن کے حوالے سے فخر اور اسلام کے حوالے سے جوش اور دلولے کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا: "ہمارے وطن میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ ہمارے لیے تمام ملازمتوں کے دروازے کھلے ہیں اور ہمیں بھی مردوں کی طرح سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ شاید آپ جانتے ہوں گے یہی اسلامی طریقۂ کار ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے آگاہ نہیں تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ کچھ مسلمان ملکوں میں عورتوں کو مردوں کی طرح سیاسی اور روزگار کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ عدن میں آمد سے پہلے میں تصور کرتا تھا کہ مسلمان عورتوں کو گھروں تک محدود رکھا جاتا ہے اور وہ امتیاز کا نشانہ ہیں۔ جب ہم عجائب گھر سے باہر آئے تو عبداللہ نے کہا: "اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم صحرائی بستیوں کا دورہ کرتے جہاں آپ دیکھتے کہ عورتوں نے قدیم روایت کے مطابق سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہنے ہوئے ہیں اور چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ عدن میں تو ضائر کی طرح بہت سی عورتیں مغربی لباس زیب تن کرتی ہیں۔"

عبداللہ کے ساتھ اسلام پر گفتگوئیں تو میری تعلیم کا فقط آغاز ہی تھیں۔ آنے والے برسوں میں یہ تعلیم بغیر نظام کے' وقفوں وقفوں سے اور بغیر منصوبہ بندی' کمرہ ہائے جماعت' مشقوں یا امتحانوں کے جاری رہی۔

میں نے لاس اینجلس' شکاگو' نیش وائل' واشنگٹن ڈی سی' نیویارک سٹی' ہوسٹن' سینٹ لوئیس' ویسٹ اونٹاریو' قاہرہ' جدہ' عمان اور پی تانگ (ملائیشیا) میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ پچیس برسوں پر محیط خط و کتابت کے ذریعے اسلام کے بارے میں آگہی حاصل کی ہے۔

جیسا کہ عدالتوں میں کہا جاتا ہے اطلاع ذاتی طور پر موصولہ ہے' سنی سنائی نہیں ہے۔

مجھے نیو جرسی کی ایک مسجد میں ایک ناقابل فراموش تجربہ ہوا۔ میں نے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ نماز ادا کرتے دیکھا' مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے نمازی شانہ بہ شانہ کھڑے نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز کے بعد لندن سے آئے ہوئے ایک سنہرے بالوں والے مہمان نے مجھے بتایا: ''میں نے چالیس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا تھا اور میں بے حد مطمئن ہوں۔''

لاس اینجلس میں مجھے امریکی مسلمانوں کے بارے میں زیادہ وسیع آگاہی حاصل ہوئی۔ عراقی تارکین وطن کی اولاد سلام المریعتی نے' جو بعد میں مسلم افیئرز کونسل لاس اینجلس کے ڈائریکٹر بنے' مجھے اپنی ہمراہی میں جنوبی کیلیفورنیا کے لاس اینجلس اسلامی سنٹر کا دورہ کروایا۔ امریکہ کے دوسرے مراکز (سنٹروں) کی طرح اس سنٹر میں بھی عبادت گاہ' ابتدائی طالب علموں کے لئے سکول' اجلاس گاہیں اور کتابوں کی ایک بڑی دکان موجود تھی۔

سلام المریعتی بھی مذہبی دریافت کے سفر سے گزر چکے تھے۔ انہوں نے ''لاس اینجلس ہیرالڈ ایگزامنر'' میں اس مذہبی بیداری کا تذکرہ شائع کروایا جس کا تجربہ انہوں نے کالج میں داخلے کے بعد کیا تھا۔ ''میرا دل خالی خالی محسوس ہوتا تھا۔ میں ایک عمومی امریکی کمزوری یعنی خود اطمینانی میں مبتلا تھا' یعنی برخود غلط تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کرۂ ارض پر میرے ہونے کا مقصد محض معاشرے میں معمولی سی جگہ بنانا نہیں ہے' صرف تعداد میں اضافہ کرنا اور مر جانا نہیں ہے۔ میری یہ تمنا' یہ عزم مجھے قرآن کی طرف لے گیا' جو کہ انسانی آگہی کا عظیم سرچشمہ ہے۔ قرآن سے میں نے اپنی دنیا' اپنی تاریخ' خود اپنے بارے میں اور اپنے خالق کے بارے میں علم حاصل کیا۔'' 2

المریعتی کو اسلام میں شادی اور ماں باپ کے رشتوں کی افادیت کا نیا ادراک اس وقت ہوا جب ان کی فزیشن بیوی لیلیٰ نے' جو مسلم ویمنز لیگ کی سابقہ صدر ہیں' بیجنگ (چین) میں عورتوں کے حوالے سے منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔ اپنی بیوی کی غیر موجودگی میں انہوں نے اپنے دو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کی۔ انہوں نے لکھا کہ اس تجربے نے انہیں یہ سمجھنے میں مدد دی کہ ''اسلامی قانون کیوں یہ کہتا ہے کہ عورتیں شادی کے بعد اپنے کنوارپنے والے نام رکھ سکتی ہیں اور ان کے شوہر ان کی ذاتی آمدنی کو خرچ نہیں کر سکتے (اور کیوں) شوہر کو گھریلو ذمہ داریاں لازماً ادا کرنی چاہئیں یا اپنی بیوی کے لیے گھریلو ملازمائیں فراہم کرنی چاہئیں۔'' انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ''ہم آہنگی' عدل

وانصاف اور آزادی" کو "اسلام کے بنیادی سماجی مقاصد" کے طور پر سمجھنے کی راہ دکھائی۔

اسلام کے حوالے سے دیگر مشاہدات 1988ء میں ہوئے' جب میں نے کانگرس چھوڑنے کے بعد مشرق وسطیٰ کا پہلا دورہ کیا۔ ایک روز جب میں ریاض (سعودی عرب) کے نزدیک گاڑی پر سوار گزر رہا تھا تو میں نے ایک چرواہے کو تنہا دوپہر کی نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ بعد میں دارالحکومت میں ایک تعمیراتی مقام پر میں نے ایک شخص کو اکیلا سہ پہر کی نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ بعد ازاں جدہ کے نزدیک ایک ساحلی گھر میں نماز دوبارہ میری توجہ کا مرکز بنی۔ میرے میزبان حامد بخش' جو ایک ممتاز تاجر تھے' اجازت لے کر ساتھ والے کمرے میں جانے لگے تو انہوں نے ضرور میرے چہرے پر الجھن کے تاثرات دیکھے ہوں گے کیونکہ وہ رک گئے اور بولے: "یہ نماز کا وقت ہے۔ میں صرف دس منٹ کے لئے ہی جاؤں گا۔" پھر انہوں نے مزید کہا "نماز ہمیں خدا کو یاد رکھواتی ہے۔" جب میں نے جدہ میں ایک کاروباری (بزنس مین) سے ملاقات کی تو مجھے تب ان کی ڈیسک پر منتظر رہنا پڑا جب انہوں نے چند فٹ دور قالین پر اپنی دوپہر کی نماز ادا کی۔

بعد میں امریکہ واپسی پر اسی برس میں دو مسلمانوں سے ملا یعنی نیش وائل میں میٹ لائف کی مالیاتی خدمات کی نمائندہ زینب البری اور ان کے شوہر ڈاکٹر نور ناصری جو ایک ماہر معاشیات ہیں اور مراکش میں پیدا ہونے والے اسلام کے غیر پیشہ ور عالم ہیں۔ مصر میں پیدا ہونے والی البری نے میری کتاب "وہ بولنے کی جرأت رکھتے ہیں" پڑھ کر میرے مقامی لیکچر کا اہتمام کیا۔ پھر میری درخواست پر وہ کونسل برائے مفاد کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی پہلی مسلمان رکن بن گئیں۔ آنے والے برسوں میں انسانی حقوق سے ان کی وابستگی اور اسلام کے لیے جوش و ولولے نیز ناصری کی اسلام اور اس کی تاریخ کے اپنے بھرپور علم سے مستفید کروانے پر رضامندی' میری اسلامی تعلیم میں تیزی سے پیش رفت کا باعث بنیں۔ ناصری کے مرحوم والد نے مراکش کے مرحوم شاہ حسن کے وزیر مذہبی امور کے طور پر خدمات انجام دی تھیں۔

البری نیش وائل کے علاقے میں مسلمانوں اور عرب امریکیوں کی خیرسگالی کی ایک مؤثر سفیر ہیں۔ وہ مقامی تنظیم "انٹر فیتھل کمیٹی" اور دوسرے شہری گروپوں کی رہنما ہیں۔ بین المذہبی اور بین النسلی منصوبے ان کے خاص میدان ہیں۔ وہ سرکاری عہدوں کے امیدواروں کی معاونت کرنے کے لیے جماعتی مہمات میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ انہوں نے 2000ء میں

نائب صدر ایل گور کی صدارتی مہم میں ''ویمن فار گور'' کی ایک رہنما کی حیثیت سے کلیدی کردار ادا کیا۔ چندے اکٹھے کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایل گور کے نیش وائل میں واقع قومی ہیڈ کوارٹر میں اس قدر وافر مقدار میں پیسٹریاں فراہم کیں کہ انہیں قومی ٹیلی ویژن پر ''سموسہ خاتون'' (Pie Lady) کا خطاب دیا گیا۔

میں نے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے کئی دوروں میں مسلمانوں کے ساتھ وسیع شناسائیاں استوار کیں۔ 1988ء میں میں نے سعودی عرب کے مشرقی صوبے میں آرامکو کے مالی تعاون سے قائم کیے گئے ہائی ٹیک عجائب گھر کا دورہ کیا جہاں اسلام کے تہذیبی کارناموں کو کمپیوٹر ٹرمینلوں پر دکھایا جاتا ہے۔ میں نے عجائب گھر کے ڈائریکٹر کو رائے دی کہ اگر واشنگٹن کے سمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ میں ایسے ہی ٹرمینل عوام کے دیکھنے کے لیے نصب ہوں تو اسلام کے حوالے سے یک رُخے امریکی تصورات کی اصلاح ممکن ہے۔

دو سال بعد کاروباری (بزنس مین) احمد صالح ججوم سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک سابقہ سرکاری ملازم ہیں' کئی اسلامی تنظیموں کی قیادت کرتے ہیں اور اس وقت جدہ کے روزنامہ ''المدینہ'' کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ دبئی میں کاروباری (بزنس مین) عیسیٰ صالح الگرگ میرے قریبی دوست اور مشیر بن گئے۔

اسلام کے حوالے سے عوامی مغالطوں کے بارے میں مجھے ستمبر 1993ء میں پی نانگ (ملائیشیا) میں اس وقت بھرپور علم ہوا جب میں نے اسلام دشمن یک رُخے تصورات کا جائزہ لینے والی ہفتہ بھر طویل ورکشاپ میں شرکت کی۔

مجھے سب سے زیادہ اینڈریو پیٹرسن نے متاثر کیا جو کہ الی نائے کے رہنے والے ہیں اور اب چین کی ایک یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ ہم میں برسوں مراسلت ہوتی رہی۔

جب 1989ء میں شکاگو کے پروفیسر ایم شریف باسیونی نے مجھے اپنی کتاب ''اسلام کا تعارف'' کی ایک جلد بھیجی تو میرا سفر تیزی سے طے ہونے لگا۔ میں باسیونی سے 1974ء میں پہلی مرتبہ ملا تھا جب وہ عدن میں میرے امدادی مشن کے بارے میں پڑھنے کے بعد کیپٹل ہل پر مجھ سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ وہ بین الاقوامی قانون کے ماہر ہیں اور اس وقت امریکی دفتر خارجہ میں قانونی مشیر کے طور پر تقرر کے لئے زیر غور تھے۔

جامع اور دلکش کتابوں میں سے ایک ہے۔ وہ قرآن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یہ رسول کریم حضرت محمدؐ کے ذریعے نوع انسان تک پہنچنے والا آخری الوہی پیغام ہے' جنہیں اللہ نے اپنی آخری وحی کے حامل کے طور پر منتخب کیا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت کے درمیان مضبوط رشتہ کیوں وجود رکھتا ہے۔''

وہ بین المذہبی رشتوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عیسائیوں اور یہودیوں کو قرآن میں ''اہل کتاب'' کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بھی حضرت موسیٰؑ' عہد نامہ قدیم کے پیغمبروں اور حضرت عیسیٰؑ کے توسط سے اللہ کا پیغام پہنچا تھا' عیسیٰؑ کے بارے میں اسلام کا ایمان ہے کہ کنواری بی بی مریمؑ سے ان کی پیدائش ایک معجزہ ہے۔''[4]

قرآن عہد نامۂ قدیم و جدید کے صدیوں بعد نازل ہوا اور اس میں انجیلی پیغمبروں حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ کے حوالے کثرت سے موجود ہیں۔ قرآن حضرت عیسیٰؑ کو خصوصی احترام دیتا ہے جن کا ذکر تینتیس مرتبہ آیا ہے اور کنواری بی بی مریمؑ کو بھی' جن کا ذکر چونتیس مرتبہ آیا ہے — آپؑ واحد خاتون ہیں جن کا ذکر نام کے ساتھ قرآن میں آیا ہے۔[5]

قرآن کی آیت 3:84 ہے: ''کہو! ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ' اسحاقؑ اور ان کی آل پر نازل کیا گیا اور ان (کتابوں) پر جو موسیٰؑ' عیسیٰؑ' پیغمبروں پر ان کے مالک نے نازل کیں۔ ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے' اور ہم خدا کے لیے اسلام کو ضرور مانتے ہیں۔''

حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کو آیت 3:45 میں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے: ''دیکھو! فرشتوں نے کہا: ''اے مریمؑ! خدا نے آپ کو اپنی جانب سے خوش خبری دی ہے: اس کا نام عیسیٰؑ ابن مریم ہوگا' جو اس دنیا میں عزت کا حامل ہوگا اور آئندہ زندگی میں بھی نیز خدا کے قریبی لوگوں میں سے ہوگا۔''

باسیونی عیسائیت کے ساتھ اسلامی رشتوں کو ''بنیادی'' قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مسلمان بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں جو کہ کائنات کا خالق ہے۔ وہ آفاقی طور پر مسلمانوں کے زیر استعمال عربی الفاظ کی اہمیت بیان کرتے ہیں' خواہ ان مسلمانوں کی اپنی زبان کوئی بھی ہو۔ مثال کے طور پر اللہ خدا (GOD) کا مترادف عربی لفظ ہے اور اسے عرب مسلمان اور عیسائی ہر دو استعمال کرتے ہیں۔ گڈیون بائبل

میں لفظ ''اللہ'' جہاں عہد نامۂ جدید میں جان 3:16 میں ظاہر ہوتا ہے وہاں کئی مختلف زبانوں میں دہرایا گیا ہے۔ لفظ "HALLELUJA" جو عیسائی حمدوں میں عام استعمال ہوتا ہے' لفظ اللہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ عربی میں اسلام کا مطلب ہے اللہ کی رضا کے سامنے اطاعت اختیار کرنا اور مسلم کا مطلب ہے ایسا شخص جو اطاعت کرے۔ میرا ایمان ہے کہ اس مفہوم میں عیسائی اپنے آپ کو ''مسلم'' تصور کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی خدا کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح مسلمان بھی حضرت ابراہیمؑ کے وارثوں کے طور پر امن کا عہد کرتے ہیں۔

باسیونی واضح کرتے ہیں کہ ''قرآن'' ایک عربی لفظ ہے جس کا مطلب ''پڑھنا یا تلاوت کرنا'' ہے۔ قرآن عربی میں اللہ کے الفاظ کی تلاوت ہے' جو کہ تیئیس برس کی مدت میں رسول اللہ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا۔ وحی کا آغاز مکہ میں 610ء میں ہوا اور مدینہ میں 632ء میں وحی کا نزول ختم ہو گیا' جو کہ رسول کریمؐ کی وفات کا سال ہے۔ آپ کاتبین کو وحی لکھوا دیتے تھے جو کپڑے' ہڈیوں اور دیگر دیرپا چیزوں پر انہیں درج کر لیتے۔ آپ کی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے انہوں نے 114 سورتوں پر مشتمل عربی متن والی کتاب کی شکل میں مرتب کیا' جو غیر متبدل ہے اور آج تک مسلمانوں نے اس کی درستی کو چیلنج نہیں کیا۔

رسول کریمؐ کے اقوال و افعال کے نوشتے (ریکارڈز) جو ''حدیث'' کہلاتے ہیں' قرآن کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ احادیث مسلمانوں کو روزمرہ زندگی میں رہنمائی فراہم کرتی ہیں نیز افراد کے مابین اور فرد اور ریاست کے مابین جھگڑوں کو سلجھانے کے طریقے بتاتی ہیں۔ تاہم باسیونی انتباہ کرتے ہیں: ''اسلام کو تنگ نظر قانون پسندانہ روشنی میں بالکل نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ یوں کہ ایک لائحہ عمل (فریم ورک) پیش کرتا ہے جو سب انسانوں کے لیے بنیادی عدل و انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔ عاجزی اور رحمدلی اسلام کے عظیم تصورات میں شامل ہیں۔''[6]

اگرچہ عیسائیوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں تاہم ان میں فرق بھی ہیں' مثال کے طور پر خدا کے ساتھ ان کے تعلق میں۔ مسلمانوں کے لئے وہ بلاواسطہ اور ذاتی ہوتا ہے۔ اسلام میں عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح مذہبی پیشوائیت موجود نہیں ہے۔ مسلمانوں کے بھی رہنما ہوتے ہیں' جنہیں عموماً امام کہا جاتا ہے' تاہم کسی کو بھی دوسرے مسلمانوں پر کوئی مذہبی اتھارٹی نہیں دی گئی۔ باسیونی واضح کرتے ہیں کہ امام نماز کے لیے خدمات انجام دیتا ہے اور

''عام طور پر یا تو ایسا شخص ہوتا ہے جس نے اسلامی تعلیم حاصل کر رکھی ہوتی ہے یا جو جماعت (گروپ) میں دوسروں سے زیادہ علم رکھتا ہو' عمر میں بڑا ہو یا اسے دوسرے مسلمان خاص طور پر متقی وعبادت گزار تسلیم کرتے ہوں۔'' مفتی ایک عالم (سکالر) ہوتا ہے جو قرآن کی تعبیرات (Interpretations) کرتا ہے۔

باسیونی لکھتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے ''قرآن سے ہدایت حاصل کرتے ہوئے'' نمازوں کی تعداد اور طریقہ بیان فرمایا تھا: ''زندگی میں حاصل شدہ مراتب سے بے نیاز ہو کر شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہونا' اللہ کے سامنے برابر ہونے کی علامت ہے۔ ہر مسلمان سجدہ کرتا ہے جو علامت ہے تمام انسانوں کی برابری' عاجزی' خالق کی عبادت اور اس حقیقت کی کہ ہم زمین سے آئے ہیں اور اسی میں مل جائیں گے۔ نماز ادا کرنے والا ہر مسلمان مکہ کی طرف رخ کرتا ہے' جو سب مسلمانوں کو اتحاد اور وحدت عطا کرتا ہے۔ نماز سے پہلے مسلمانوں پر وضو کرنا لازم ہے' جس میں شامل ہے قرآن اور رسول کریمؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق منہ' ہاتھ' کہنیوں تک بازو اور پاؤں دھونا۔ اس کا مقصد نہ صرف صفائی ہے بلکہ اس سے پہلے جاری عمل سے انقطاع بھی۔'' جمعہ کی نماز کے اجتماعات میں نمازیوں کے مابین نسل دولت' قوت واقتدار یا استحقاق کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں ہوتا ہے۔7

رسول کریمؐ نے نماز کے ذریعے عبادت گزاری کے ساتھ ساتھ شخصی حفظانِ صحت کی بھی ہدایات دیں۔ پابندی سے نماز ادا کرنا جسمانی کسرت کا ایک بہترین پروگرام ہے اور جیسا کہ میں نے ایک مسلمان ہمسائے سے جانا ہے' صفائی فرض ہے۔

ایک روز یمن کے دیہات میں گرد آلود سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہمارے ہمرکاب ایک پروفیسر نے گھڑی دیکھی اور بولے: ''یہ نماز کا وقت ہے لیکن وضو کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے' اس لیے مجھے نماز قضا کرنی پڑے گی۔ میں نماز ادا کرنے کے لیے پاک نہیں ہوں۔'' جب میں نے حال ہی میں اپنے کانگرس کے زمانے کے دوست ڈاکٹر محمد بشر دوست کو اپنے ہمراہی پروفیسر کی بات سنائی تو انہوں نے کہا کہ وہ پانی کی عدم موجودگی میں نماز ادا کر سکتے تھے۔ انہوں نے واضح کیا کہ اگر ضروری ہو تو مسلمان صفائی کے تقاضے علامتی طور پر پورا کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو ریت' پتھر یا دیوار پر اور پھر اپنے چہرے اور بازوؤں پر پھیر لیں۔

بشر دوست اور ان کے خاندان نے' جو افغان پناہ گزین ہیں' واشنگٹن کی ایک نواحی

بستی میں میرے کانگرس کے دور کے اواخر میں ہمارے پڑوس میں آباد ہو کر ہمیں مذہب اسلام کا مشاہدہ کروایا۔ ہمارے خاندان نے بشر دوست' ان کی بیوی' اور چار بچوں کو امریکی زندگی سے مکمل ہم آہنگ ہونے میں مدد دی۔ اس کے بدلے میں انہوں نے ہمارے اسلام کے علم کو وسعت دی۔ عیدالفطر کی شاندار ضیافت میں انہوں نے ہمیں روزے کے اسلامی فرض کے بارے میں وضاحت سے بتایا۔۔۔ اس ماہ کے دوران دن میں کھانا پینا بند ہوتا ہے۔

بعد ازاں ایک گرم سہ پہر میں مجھے پہناوے کے بارے میں علم ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ بہت سی عورتیں مل کر عقبی صحن میں شمسی غسل (سن باتھنگ) کر رہی تھیں۔ مَیں نے عقبی صحن کی باڑھ کے اوپر سے ڈاکٹر بشر دوست کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی بیوی کو بھی ان عورتوں میں شامل ہونے پر خوش آمدید کہا جائے گا جو بہت کم کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ اس پر انہوں نے واضح کیا کہ وہ ان عورتوں میں شامل نہیں ہوگی کیونکہ کھلے عام شمسی غسل کرنا پہناوے میں حیاداری کے اسلامی قانون کی خلاف ورزی ہے' یہ قانون مرد اور عورت ہر دو پر لاگو ہوتا ہے۔

مجھے بعد میں علم ہوا کہ روزہ لاس اینجلس کے ایک بچے کے لیے ندامت کا باعث بنا۔ سلام المریعتی چوتھی جماعت میں تھے تو انہوں نے روزے رکھنے شروع کر دیئے تاہم انہوں نے اپنے غیر مسلم کھیل کے ساتھیوں سے اس کی وضاحت کرنا مشکل پایا۔ برسوں بعد انہوں نے اپنے مخمصے کو بیان کیا: ''چونکہ مَیں اپنے دوستوں پر اس تصور کو واضح نہیں کر سکتا تھا سو میں نے انہیں کہا ''میرے والدین نے مجھے ایسا کرنے کا کہا ہے۔'' یقیناً اس سے میرے ماں باپ کے بارے میں ایک خوفناک احساس پیدا ہوا۔ خدا کا شکر ہے کہ بعد میں مجھے روزے کا سبق۔۔۔ یعنی قوت ارادی پیدا کرنا اور اپنے جسموں کے روحانی پہلو کی نشوونما۔۔۔ کو واضح کرنے کی جرأت حاصل ہو گئی۔ میرے ہائی سکول کے دوستوں نے میرے طرز حیات کے اس پہلو کو جان اور سمجھ لیا۔ وہ روزے کے حوالے سے میرا اور میرے والدین کا احترام کرنے لگے اور زیادہ اہم بات یہ کہ وہ اسلام کا احترام کرنے لگے۔'' 8

بہت کم عیسائی اتنی سخت مذہبی ذمہ داریوں پر عمل کرتے ہیں جتنی کہ مسلمان قبول کرتے ہیں۔ ہمارا خاندان کھانوں سے پہلے مختصر عبادت کے لیے سر جھکاتا ہے اور اتوار کی صبحوں کو ہمیشہ چرچ میں حاضری ایک بے کہی مگر پختہ ذمہ داری تھی بلکہ کھانے' سونے اور سانس لینے کی طرح زندگی کا ایک حصہ۔ ایسٹر کی اتوار سے پہلے کے دنوں میں کسی حد تک ترک

ذات متوقع ہوتی تھی اور کیتھولک جمعہ کے دن گوشت کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ ان افعال میں سے کچھ تو معدوم ہو گئے ہیں تاہم اپنے عروج پر بھی وہ مسلم عقیدے سے تقابل کرنے پر نرم دکھائی دیتے ہیں۔

بہت سے مسلمان جو فریضۂ حج ادا کر چکے ہیں' بیان کرتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے عظیم تجربہ تھا۔ حج مساوات بھی پیدا کرتا ہے کیونکہ خواہ شہزادے ہوں یا مفلس ومحتاج ایک سا لباس پہنتے ہیں۔ کئی برس پہلے کی بات ہے کہ ایک صبح جدہ (سعودی عرب) کے ایک ہوٹل کی لابی میں انتظار کرتے ہوئے میں نے نزدیک واقع مکہ سے آنے والے لوگوں کو گاڑیوں سے اترتے دیکھا۔ سب نے ایک جیسے سادہ سفید لبادے پہنے ہوئے تھے۔ میں یہ بتانے سے قاصر تھا کہ کون امیر ہے اور کون غریب' کون اعلیٰ خاندان سے ہے' کون عام خاندان سے ہے۔ 1999ء کے موسم گرما میں دائفلاح ہنداوی نے مکہ سے واپسی پر دبئی سے اپنی کام کی جگہ (ورک پلیس) سے مجھے فون کیا۔ وہ اردنی تھے اور میں ان سے پہلی مرتبہ تب ملا تھا جب وہ ایک امریکی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ وہ عام طور پر زندہ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتے مگر اس روز انہوں نے خوشی کے ساتھ خبر دی: ''یہ میری زندگی کا سب سے عمیق تجربہ تھا۔ ہم نے صرف اپنے لیے یا صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لوگوں کے لیے عبادت کی۔'' 9

نماز' عیاشی سے پرہیز اور صدقہ وخیرات جیسے بنیادی فرائض کے علاوہ مسلمانوں پر پابندی ہے کہ وہ دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی نہ کریں اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ رواداری برتنے اور ان کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

نکتہ چینی کرنے پر پابندی کا مجھے اس وقت پتا چلا جب میں نیویارک شہر میں ری پبلکن پارٹی کی سرگرمیوں میں نمایاں مقام حاصل کر رہے افریقی امریکی نومسلم نقاعیل ہام سے انٹرویو لے رہا تھا۔ میں نے ان سے لوئیس فراخان کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی' جو کہ ''نیشن آف اسلام'' نامی افریقی امریکیوں کی تنظیم کے لیڈر ہیں اور اس وقت یہ تنظیم قرآن کی اپنی تعبیرات کی وجہ سے مرکزی دھارے کے مسلمانوں کی تنقید کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ چونکہ میرے انٹرویو کے نوٹس ادھورے تھے اس لیے مَیں نے وضاحت کے لیے ہام کو ٹیلی فون کیا' میں نے کہا: ''جب میں نے کوئنز کے مسلم سنٹر میں آپ سے گفتگو کی تو آپ نے لوئیس فراخان پر تنقید کی تھی۔ میں نے تصدیق کرنے کے لیے کال کی

ہے تاکہ آپ کی تنقید کا درست طور پر حوالہ دے سکوں۔" ہام نے جواب دیا: "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کال کی کیونکہ میری آراء مسٹر فراخان کی ذات پر تنقید نہیں تھیں۔ میں ہمیشہ کسی بھی شخص پر تنقید کرنے سے پرہیز کرتا ہوں۔"

ممکن ہے کہ مقدس ادب کے مطالعے میں مسلمان عیسائیوں سے بہت آگے ہوں۔ میرے سنڈے سکول کے تجربے کے مطابق چھوٹی عمر کے بچے بائبل اور زبور کی کچھ آیات ہی یاد کرتے ہیں۔ میری نوجوانی کا ایک اہم ترین مرحلہ وہ تھا جب افتتاحی مشقوں کے دوران میں نے ایک بہت بڑے اجتماع کے روبرو بائبل کی کچھ کتابوں کے نام اپنے حافظے سے سنائے تھے۔ میں نے ان ناموں کو اتنی تیزی سے سنایا تھا کہ اس کے پڑھنے میں بمشکل ایک منٹ کا وقت لگا ہوگا تاہم جب میں نام گنا چکا تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی پہاڑ سر کیا ہو۔ مسلمانوں کے اس کارنامے سے کہ وہ پورا قرآن حفظ کر لیتے ہیں، میری کارکردگی کا موازنہ کیا جائے تو حقیقتاً یہ بہت معمولی دکھائی پڑتی ہے۔

ممکن ہے مسلمان عیسائیوں پر ان کی بائبل کے متن کی لفظی قبولیت کے حوالے سے بھی فوقیت رکھتے ہوں۔ کئی برس پہلے کی بات ہے کہ کلکتہ میں مذہبی رہنماؤں کے ایک بین المذاہب اجلاس میں یونیٹیرین غلبے والے عیسائی ریورنڈ مونکیور ڈی۔ کونوے سے کہا گیا کہ وہ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش کے حوالے سے اظہار خیال کریں۔ گروپ کو دیئے گئے اپنے جواب میں کونوے نے کہا "یہ ایک اساطیری اور شاعرانہ دلچسپی کا حامل قصہ ہے اور اسے تاریخی نہیں سمجھنا چاہیے۔" جب اجلاس میں درجن بھر یا اس سے زیادہ تعداد میں شرکت کرنے والے عالی مرتبت مسلمانوں سے رائے مانگی گئی تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر ایک ترجمان نے کہا کہ وہ سب "عہد نامۂ جدید کے بیان کو جوں کا توں تسلیم کرنے کے پابند ہیں۔"

کونوے نے برا سا منہ بناتے ہوئے نتیجہ اخذ کیا کہ اس اجلاس میں موجود مسلمان حقیقی آرتھوڈکس عیسائی تھے۔ بعدازاں انہوں نے تحریر کیا: "مسلمان عیسائی تو نہیں ہیں تاہم مشرق میں صرف وہی عہد نامۂ قدیم و جدید میں بیان کئے گئے حضرت عیسیٰؑ کے معجزوں اور ان کی پیدائش سے متعلقہ اجزا کو لفظاً تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی تشکیک پسند شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔"10

عیسائی مسلمان رشتہ تاریخی ہے۔ عیسائیت اور اسلام دونوں ہی بنیادی صحیفوں کو خدا

کا کلام تسلیم کرتے ہوئے ان کا احترام کرتے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں یہ بائبل ہے۔ مسلمانوں کے ہاں یہ قرآن ہے۔ دونوں مذاہب ثانوی تحریروں (Literature) کے بھی حامل ہیں جن کے بارے میں ٹیکساس کے فزیشن عنایت لالانی کو یقین ہے کہ ان کی قبولیت میں افراط و تفریط ہو چکی ہے اور بعض اوقات دونوں مذہبی برادریوں کی ناکامیوں میں بھی کردار ادا کر چکے ہیں۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''عیسائیوں کے ہاں ان میں شامل ہیں آگسٹین' ایکویناس' دانتے' لوتھر' کیلون اور میلینکتھن کی تحریریں۔ مسلمانوں کے ہاں ان میں شامل ہیں احادیث' سنت اور شریعت۔''

لالانی لکھتے ہیں کہ پوری تاریخ میں انسانی حقوق کے ساتھ عیسائیت اور اسلام کی وابستگی میں نشیب و فراز آتے رہے ہیں تاہم وہ یقین رکھتے ہیں کہ دونوں برادریاں وقتی زوال پر غالب آ کر پیش رفت کر چکی ہیں: ''انسان یقیناً ترقی کرتا ہے۔'' وہ یقین رکھتے ہیں کہ بعض اوقات دونوں مذہبی برادریوں نے انسانی حقوق کے ضمن میں عظیم پیش رفت کی ہے تاہم ایک دوسرے کے ساتھ ہم قدم نہیں رہیں۔ ''انسانی حقوق کے مغرب میں روایت بن جانے سے بہت عرصے پہلے انہیں مسلمانوں نے تسلیم کیا اور فروغ دیا۔ اسلام کے سنہرے دور میں عرب مسلمان برادری اسلام کے زیر اثر عیسائی دنیا سے بہت آگے نکل گئی۔ مسلمانوں کا سنہرا دور آٹھویں سے تیرہویں صدیوں پر محیط تھا۔ عیسائی دنیا نے تیرہویں صدی میں عرب مسلمان برادری کے زوال آمادہ ہونے سے فوری پہلے ہی اپنے ترقی کے سفر کا آغاز کیا۔ اس سارے عمل میں مذہب نے بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔''

ایک اہم عالم اور مصنف ڈاکٹر رالف بریبینٹی یقین رکھتے ہیں کہ اسلام اب عالمگیر قبولیت میں عروج کا تجربہ کر رہا ہے جبکہ عیسائیت اس دور میں ایسا لگتا ہے' بعض حوالوں سے میدان کھو رہی ہے۔ اسلام کا نظام اقدار زیادہ بدعتوں سے پاک اور بالکل صحیح لگتا ہے بمقابلہ عیسائیت کے جو اساطیر اور تخیل پرستی کی طرف زیادہ مائل ہو رہی ہے..... دوسری طرف اسلام ترقی کے جاندار اور تابناک مرحلے میں ہے۔''

بریبینٹی' جو ایک اُسقُف ہیں' تنبیہ کرتے ہیں کہ اسلام اپنے مکمل عروج کو صرف اسی وقت پہنچے گا جب مسلمان مسلمانوں کے انفرادی رویے کے ساتھ ساتھ اسلام کے عوامی تصور پر بھرپور توجہ دیں گے۔ ''تاریخ کی اس ساعت میں اسلام کی حرکیات اور واضح طور پر متعین کردہ قدریں مغربی دنیا کے زوال کو بڑھانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ ایسا صرف اس طرح

کیا جا سکتا ہے کہ عالمی منظر نامے میں اسلام کا تصور اور دنیا کے سٹیج پر مسلمانوں کے اعمال امن، انصاف اور زندگی کے احترام جیسے اسلامی اصولوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔" 11

لالانی کسی حد تک اختلاف کرتے ہوئے ایک گہرے مسئلے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ متفکر ہیں کہ کچھ مسلمان قائدین قرآن کے لچکدار اور غیر ادعا پسندانہ کردار کو پہچاننے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ انہیں اوصاف کی وجہ سے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں پیش رفتیں ممکن ہوئی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہودی عیسائی مذہبی ادب کے مقابلے میں قرآن واضح طور پر ایک غیر ادعا پسند کتاب ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ مرتبہ ایسا لگتا ہے کہ ایک آیت ادعا پسندانہ غیر لچکدار تائید سے شروع ہوتی ہے اور اسی تسلسل کے ساتھ عین درمیان میں حیران کن اچانک پن کے ساتھ آدمی کو اس کے فیصلے میں نرمی پیدا کرنے والے رحم، کامل علم اور مطلق قدرت پر غور کرنے کا موقع دیتی ہے۔

"گو بہت سے عوامل انسان کو حد سے نہیں بڑھنے دیتے تاہم چونکہ انسانی معاملات پیچیدہ ہوتے ہیں اور چونکہ انسان قرآن کے زمانہ نزول کے لیے موزوں اعلیٰ ترین معیارات عمل سے بھی آگے ترقی کر سکتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے ابہام خدا کے لیے بالکل موزوں ہیں یا شاید مجھے ایسا لگتا ہے۔ خدا انسان کو کاملیت کی عظیم ترین بلندیوں کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے اپنے ہی راستوں پر گامزن رکھنے کا خواہش مند نہیں تھا۔"

لالانی لکھتے ہیں: "اس لچک داری کا پال اور آگسٹین کی غیر لچکداری سے موازنہ کیجیے جن کے موقف اب ایسا لگتا ہے کہ عیسائی دنیا کی روزمرہ زندگی میں اثر و رسوخ کھو رہے ہیں اور مکمل استرداد کے خطرے سے دوچار ہیں۔ یہاں تک کہ مرکزی دھارے کے پروٹسٹنٹ چرچ جیسے کہ لوتھرن اور اصلاح یافتہ کیلونسٹ شائستگی کے ساتھ تقدیر اور صرف عقیدے اور برکت کے ذریعے انصاف کے فلسفے کو ترک کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں خالص پن کے لیے "اصلاح" (ریفارمیشن) کا جوش و ولولہ صرف پال اور آگسٹین کی ادعا پسندی کو دوبارہ لاگو کرنے ہی کے لیے تھا، جس کو پاپائیت کی بدعنوانی سے تحریک ملی تھی اور مسلمانوں کی طعنہ زنی نے اسے مہمیز کیا تھا لیکن تھامس ایکویناس اور ایراسمس کی تحریروں کے استثنا کے ساتھ، سولھویں صدی کی "اصلاح" (ریفارمیشن) نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی روح کو نظر انداز کر دیا۔

تاہم آج عرب مسلمان برادری بھی اسلام کے سنہرے دور کے دوران مسلمان قائدین کی اپنائی ہوئی قابل عمل پابندیوں کو نہ اپناتے ہوئے قرآن کی روح کو نظر انداز کرنے کے خطرے سے دوچار ہے۔ میں اس بڑھتے ہوئے رجحان کا حوالہ دے رہا ہوں' جس کے تحت اسلام کے ثانوی صحیفوں کو قرآن کے تقریباً مساوی قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ بہت غلط رجحان ہے کیونکہ بہت سے ثانوی متن رسول خدا حضرت محمدؐ کے کام کو منسوخ کرنے اور اسلام سے پہلے کی تاریکی کو دوبارہ مسلط کرنے کی واضح کوششیں ہیں۔ جیسا کہ اس رجحان کے تحت اسلامی معاشرے میں عورت کی حیثیت کو تصور کیا جاتا ہے۔

''میں مذاہب کے موازنے پر خوش نہیں ہوں۔ تمام مذاہب برحق ہیں اور خدا رحیم و کریم ہے۔ تاہم اسلامی صحیفوں کی نسبت یہودی' عیسائی صحیفوں میں زیادہ انسانی تحریف دکھائی دیتی ہے۔ میں جنہیں ثانوی متن کہتا ہوں ان کا اثر اٹھارہویں صدی تک عیسائی فکر پر حالیہ زمانے میں مسلمان معاشرے پر اسلام کے ثانوی متنوں کے اثر سے کہیں زیادہ تھا۔''[12]

جیکسن وائل' الی نائے میں پہلے پریسباٹیرین چرچ' جس کا میں رکن ہوں' کے پادری ریورنڈ جان ایس۔ کے کہتے ہیں: ''خدا ابہام کے لئے بہت زیادہ رواداری کا حامل ہے۔''

لالانی قرآن میں جو لچک داری پاتے ہیں اسے غیر مسلموں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وہ وسیع پیمانے پر تسلیم کئے جانے والے ان یک رُخے تصورات کو مسترد کریں جو اسلام کو ایک ادعا پسندانہ' بے لچک' انتقام پرور اور درشت مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

رواداری عیسائیت اور اسلام دونوں مذاہب کی اہم ترین حکمت عملیوں میں سے ایک ہے' تاہم بعض اوقات اور مقامات پر اسے نظرانداز کیا جا رہا ہے اور دونوں مذہبوں کے درمیان رشتے کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ عیسائیوں کی نسبت مسلمان بین المذہبی رشتے کو زیادہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ حقیقت ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت دونوں کو وحی پر استوار مذاہب کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ جیسے جیسے عیسائی اس رشتے سے زیادہ آگاہ ہوتے جائیں گے وہ یہودی عیسائی اسلامی ورثے کی بات کرنا شروع کر دیں گے۔ یہ اصطلاح اکثر استعمال ہونے والی اصطلاح یہودی عیسائی (Judeo-Christian) کی نسبت زیادہ درست ہے۔[13]

اسلام کے حوالے سے میرے لیے سب سے زیادہ حیران کن اور اطمینان بخش انکشاف عیسائیت اور اسلام کے مابین قریبی رشتے کی موجودگی کے بھرپور ثبوت کا ظہور ہے' خصوصاً بنیادی ادب میں۔ یہ اس لیے حیران کن ہے کیونکہ یہ اس کے بالکل الٹ ہے جس پر بیشتر امریکی عیسائی یقین رکھتے ہیں۔ یہ اس لیے اطمینان بخش ہے کیونکہ یہ چیز عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کے بارے میں سچ کو جان لینے پر عظیم بین المذاہب تعاون کی یقین دہانی کراتا ہے۔ میری سنڈے سکول کی استانی جو اعلان بار بار کرتی تھیں کہ مسلمان' جنہیں وہ غلطی کا ارتکاب کرتے ہوئے ''محمڈنز'' کہا کرتی تھیں' ''ہم جیسے نہیں ہیں'' یہ انکشاف اس اعلان کو چیلنج کرتا ہے۔

میرے شناسا بیشتر مسلمان اسلام کے پانچوں بنیادی ارکان کے پابند ہیں' یہ ریکارڈ نہیں باعمل مسلمان قرار دلواتا ہے تاہم دیگر نے واضح طور پر اور بلا جھجک بتایا کہ وہ نماز اور زکوۃ ہمیشہ ادا نہیں کرتے۔ وہ اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتے ہوئے بھی خود کو مسلمان قرار دیتے ہیں۔ یہ اقرار عیسائیوں سے اس مماثل عمل کی یاد دلاتا ہے' جو صرف ایسٹر اور کرسمس پر چرچ جاتے ہیں لیکن پھر بھی اپنے آپ کو عیسائی کہلاتے ہیں۔ چرچ میں حاضری عیسائی اصول اخلاق سے کفر و ایمان کا لازماً تعین نہیں کرتی بلکہ یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ عیسائی چرچوں کے کل ارکان کی نصف تعداد کبھی کبھار ہی عبادت کے لیے چرچ کی بنچوں پر موجود ہوتی ہے۔

میں بے عمل تصور کیے جانے والے مسلمانوں کی تعداد کے مطبوعہ اندازے پیش کرنے سے قاصر ہوں تاہم میرے کئی شناسا مسلمانوں کو یقین ہے کہ خود کو مسلمان تصور کرنے والے لوگوں کی کم از کم نصف تعداد اس زمرے سے تعلق رکھتی ہے۔ دیگر لوگ اس سے بھی زیادہ یعنی 70 سے 80 فیصد کا اندازہ بتاتے ہیں۔ درست معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مسجد میں حاضری پانچوں ارکان کی پابندی کی ترجمانی نہیں کرتی ہے۔ ایک اور عامل (Factor) وہ اسلامی روایت ہے جو ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان کے گناہوں یا دوسری شخصی خامیوں کی ٹوہ لگانے سے روکتی ہے۔

تاج برطانیہ' جس کا حامل چرچ آف انگلستان کا رسمی سربراہ ہوتا ہے' کے وارث پرنس چارلس یقین رکھتے ہیں کہ عیسائی مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ 1993ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے خطاب میں انہوں نے مغربی تہذیب پر اسلام کے احسانات (Contributions) کی تعریف کی اور کہا' اسلام ہمیں دنیا میں رہنے

اور اسے سمجھنے کا طریقہ سکھا سکتا ہے' جس کی عیسائیت اہل نہیں ہے۔ اسلام کی اہم ترین بات اس کا آفاقی نکتۂ نظر ہے۔ اسلام انسان اور فطرت' مذہب اور سائنس' ذہن اور مادے کو الگ الگ کرنے کو مسترد کرتا ہے اور ہمارے اور ہمارے اردگرد موجود دنیا کے بارے میں ایک مابعد الطبیعیاتی اور وحدانی نکتۂ نظر پیش کرتا ہے۔'' [14]

ابراہیم ابوربیع نے' جو اسلام اور عیسائی مسلم روابط کے مطالعے کے لیے قائم کیے گئے ڈنکن بلیک میکڈانلڈ سنٹر کے شریک ڈائریکٹر ہیں' اپریل 1999ء میں کنکٹیکٹ میں ہر لفورڈ سیمینری میں خطاب کرتے ہوئے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ''تقدس کے احساس'' کو جوں کا توں رکھنے کی کوشش کرتا ہے' انہوں نے مزید کہا: ''ایک لمحے کے لیے حج پر غور کیجئے جب معاشرے کے ہر طبقے کے افراد' غریب اور امیر' عرب اور غیر عرب اللہ کے حضور سرِ تسلیم خم کرنے اور رحم اور مہربانی کی التجا کرنے کے لیے مکہ جاتے ہیں۔''

ابوربیع بین المذاہب تعاون کی وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یہ امر بہت اہم ہے کہ ہماری تین روایات یعنی یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے درمیان نئے الٰہیاتی اور دانش ورانہ روابط قائم کرنے پر توجہ مرکوز کی جائے ـــــ وہ روابط جو ایسا لگتا ہے انسانی تاریخ کے خاص مرحلوں میں کھو گئے...... ایسا صرف ہماری روحانی امید پرستی کے عظیم ذخیرے کو دوبارہ دریافت کرنے سے ہو سکتا ہے کہ ہم ان روابط کو اپنے اور اپنے بچوں کی خاطر ایک بار پھر قائم کر سکیں۔'' [15]

حوالہ جات

1. ''مسلم ذہن کا مطالعہ'' از حسن حشوط صفحہ 38-39
2. لاہیرالڈ ایگزامائنڈر' 26-2-1989' صفحہ F-11
3. لاس اینجلس ٹائمز' 8-3-1996' صفحہ A-15
4. ''اسلام کا تعارف'' از ایم شریف باسیونی' صفحہ 28
5. ''تمہاری سوچ سے زیادہ مشترک'' از بل بیکر' صفحہ 43
6. ''اسلام کا تعارف'' از باسیونی' صفحہ 42-44
7. ایضاً صفحہ 32
8. لاہیرالڈ ایگزمنر' 26-2-1989' صفحہ F-1
9. خط' 1-8-2002
10. ''اسلامی دنیا کے خواص اور ساخت'' از رالف برینٹی' صفحہ 76
11. ایضاً' صفحہ 86
12. خط' 28-5-2002
13. ایضاً صفحہ 16
14. ایضاً صفحہ 38
15. ہرلفورڈ سیمینیری'' پریکس'' اپریل 1999ء' صفحہ 3

دوسرا باب

اجنبی ہمارے درمیان

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو!" ایک متحیر ہمسائے نے تب اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا جب میں نے اُسے اپنے تازہ ترین کام کے حوالے سے بتایا کہ میں امریکی مسلمانوں کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ اس سے ملتے جلتے ردِعمل کا اظہار ہمارے جیکسن وائل' الی نائے کے دوسرے دوستوں نے کیا۔ 25000 آبادی والے اس کالج ٹاؤن میں ہم 1984ء سے مقیم ہیں۔ وہ الجھ کر رہ گئے اور کسی نے بھی موضوع کو نہیں سمجھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں سے ذاتی شناسائی نہیں رکھتے تھے اور ان موضوعات پر گفتگو کو ترجیح دیتے تھے' جنہیں وہ اپنی روزمرہ زندگیوں سے زیادہ متعلق تصور کرتے ہیں۔

شاید انہیں اس حقیقت کا پتا نہیں تھا کہ امریکی مسلمان حقیقتاً کتنے قریب رہتے ہیں۔ بہت سے مسلمان قریبی شہروں سینٹ لوئیس' شکاگو اور سپرنگ فیلڈ میں رہتے ہیں تاہم ہماری کاؤنٹی میں صرف بارہ مسلمان آباد ہیں۔ وہ ہیں وکیل ایلن یؤان کی ماہرِ معاشیات بیوی راشا اور ان کا بیٹا' سلیم محمود راؤ ایم۔ ڈی' ان کی بیوی اور دو بچے' شہناز راؤ ایم ڈی ان کے خاوند سلیم اور ان کا بیٹا' جل دوربک' جو ایک کاشتکار اور باغبان کی بیوی ہیں اور ڈان کلارک جو ایک فلٹر سروس کے مالک ہیں۔ ان میں سے تین — ایلن یؤ دوربک اور کلارک نومسلم ہیں۔ مسٹر اور مسز یؤ مختلف مقامی چرچوں میں اسلام کے بارے میں تبادلۂ خیال میں شرکت کر چکے ہیں۔

امریکہ میں لاکھوں مسلمان کئی نسلوں سے آباد ہیں۔ ان کی صحیح تعداد کا پتا نہیں ہے' تاہم تازہ ترین شماریاتی مطالعے سے 1999ء میں معلوم ہوا کہ ان کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے جبکہ 2000ء میں مسلمانوں کی تعداد ستر لاکھ ہو جانے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ امریکن مسلم کونسل کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق 1992ء میں امریکی مسلمانوں کی تعداد پچاس لاکھ' 1996ء

میں ستر لاکھ اور 1999ء میں اسی لاکھ تھی۔ 1 17/مارچ 2000ء کے ''شکاگو ٹریبیون'' میں شائع ہونے والی ایسوسی ایٹڈ پریس کی ایک رپورٹ میں امریکی مسلمانوں کی کل تعداد کا اندازہ ایک کروڑ لگایا گیا ہے۔

امریکی مسلمانوں کی بالکل درست تعداد بتانا تین وجہ سے مشکل ہے: ریکارڈ کسی ایک ذریعے سے اکٹھے نہیں کیے گئے۔ 2 امریکی محکمۂ مردم شماری کو شہریوں سے ان کی مذہبی وابستگی کے بارے میں پوچھنے کی اجازت نہیں' اور مساجد کی انتظامیہ نمازیوں کی تعداد کا ریکارڈ نہیں رکھتی۔

امریکی مسلمانوں کو شمار کرنا مشکل ہے کیونکہ ان کی اکثریت کسی اسلامی تنظیم سے وابستہ نہیں ہے۔ واشنگٹن ڈی۔ سی کی امریکن مسلم کونسل فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر عبدالرحمٰن العمودی نے تخمینہ لگایا ہے کہ کم از کم دو تہائی امریکی مسلمان اسلامی تنظیموں سے غیر وابستہ ہیں۔ 3 ڈاکٹر جان ایل۔ ایسپوزیٹو کے مرتب کردہ ''آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ'' مطبوعہ 1995ء میں تناسب اس سے بہت زیادہ یعنی 90 فیصد دیا گیا ہے۔ 4

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سلیمان نیانگ' جو نیویارک کے ''سنٹر فار امریکن مسلم ریسرچ اینڈ انفارمیشن'' کے صدر ہیں' واضح کرتے ہیں: ''امریکی مسلمان' بڑے معاشرے میں اپنے مذہبی معاصروں کی طرح' دو بڑے زمروں میں بٹے ہوئے ہیں۔ وہ جو مسجدوں میں عبادت کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں اور وہ جو مذہبی مراکز سے دور رہتے ہیں چنانچہ مسلم انتظامیہ کے شمار کنندگان کی نگاہ میں نہیں آپاتے''۔ 5 انہوں نے تخمینہ لگایا ہے کہ جو ''دور رہتے ہیں'' وہ ٹھوس اکثریت میں ہیں۔'' کچھ عالموں نے تخمینہ لگایا کہ صرف دس فیصد لوگ باقاعدگی سے مساجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔ 6

مسلم تنظیموں کے قائدین نے 1999ء کے لئے ساٹھ لاکھ کو محتاط تخمینے کے طور پر قبول کیا۔ تاہم شکاگو کے اسلامک انفارمیشن سنٹر آف امریکہ کے صدر اور شمال مشرقی الی نائے یونیورسٹی کے فیکلٹی ممبر ڈاکٹر موسیٰ قطب اس تعداد کو بہت ہی کم قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے یقین ہے کہ کل تعداد ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہوسکتی ہے' یہ وہ عدد ہے جو میں کئی مرتبہ شکاگو ٹریبیون اور نیٹ ورک ٹیلی ویژن پر دیکھ چکا ہوں''۔ 7 2000ء کے ''ورلڈ المانک'' میں 1999ء کے 3,332,000 کے مقابلے میں 5,500,000 کا تخمینہ شائع کیا گیا ہے۔ 8

''آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا'' مطبوعہ 1995ء میں ... کوئی تیس

سے چالیس لاکھ پیرو......" 9

کورٹ لینڈ سٹیٹ یونیورسٹی نیویارک کے عالم الیاس بایونس اور ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو کے عالم ایم۔ معین صدیقی دستیاب اعداد وشمار کے تجزیئے اور محتاط اندازوں کو استعمال کرتے ہوئے ان اعداد تک پہنچے: 1990ء میں پچاس لاکھ' 1995ء میں ساٹھ لاکھ اور 2000ء میں ستر لاکھ۔ جنوری 2000ء کے لئے ان کی پیش گوئی تھی 6712960۔ وہ "ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مسلمان آبادی پر ایک رپورٹ" کے مصنف ہیں جسے نیویارک سٹی کے سنٹر فار امریکن مسلم ریسرچ اینڈ انفارمیشن نے 1998ء میں شائع کیا تھا۔ 1997ء میں شکاگو کی ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی نے بایونس کی تصنیف کردہ "الی نائے کے مسلمان: ایک آبادیاتی رپورٹ" شائع کی جس میں مہیا کئے گئے اعداد وشمار ستر لاکھ کا تخمینہ لگانے میں معاونت کرتے ہیں۔

1993ء کے تخمینے مساجد کی تعداد آٹھ سو بتاتے ہیں۔ ایک تخمینے کے مطابق چھ سال بعد یہ تعداد دو ہزار ہو گئی تھی۔ دوسروں کو یقین تھا کہ حقیقی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے ایک مطالعے کے مطابق صرف شکاگو میں چار سو مقامات پر جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی' ان میں سے کچھ چھوٹے ہال ہفتے کے باقی دنوں میں غیر مذہبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ کونسل فار امریکن اسلامک ریلیشنز (CAIR) کے تحقیقاتی مرکز نے تخمینہ لگایا ہے کہ مساجد سمیت اسلامی تنظیموں کی تعداد چھ ہزار ہے۔

اگرچہ امریکی مسلمانوں میں دیہی کمیونٹیوں کی طرف جانے کا واضح رجحان موجود ہے' تاہم بیشتر مسلمان صنعتی ریاستوں کے بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔ کیلیفورنیا میں دس لاکھ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں جبکہ نیویارک میں اس سے تھوڑے سے کم' دوسرے شہروں کے تخمینے یوں ہیں: الی نائے میں تقریباً چار لاکھ' نیوجرسی' مشی گن اور انڈیانا میں تین تین لاکھ جبکہ ورجینیا' ٹیکساس' اوہیو اور میری لینڈ میں مسلمان قدرے کم تعداد میں ہیں۔ 10 شہری علاقوں میں نیویارک سٹی سب سے زیادہ مسلمان آبادی کے ساتھ قوم میں سب سے آگے ہے اس کے بعد ترتیب وار آتے ہیں: لاس اینجلس' شکاگو' سان فرانسسکو' ڈیٹرائٹ' بوسٹن' سینٹ لوئیس' ہوسٹن اور میامی۔ اگست 2000ء میں امریکن مسلم کونسل کی طرف سے زوگبی انٹرنیشنل کے ذریعے کروایا گیا پول امریکی مسلمانوں کے حیران کن بکھراؤ کو دکھاتا ہے: مشرق میں 32.2

فیصد' جنوب میں 25.3 فیصد' سنٹرل گریٹ لیکس میں 24.3 فیصد اور مغرب میں 18.2 فیصد۔

ابتدا میں بیشتر مسلمان امریکہ میں زنجیروں میں آئے۔ وہ سیاہ فام (Blacks) تھے۔ جنہیں 1530ء میں مغربی افریقہ میں سفید فام تاجروں کے ہاتھ غلام بنا کر بیچ دیا گیا جو انہیں بحر اوقیانوس کے پار برازیل لائے۔ پھر کیریبئین اور بعد ازاں ان برطانوی نو آبادیوں میں جنہوں نے امریکہ بننا تھا۔ یہ ہماری تاریخ کے سب سے زیادہ شرمناک ابواب ہیں کہ امریکہ میں ایک کروڑ انسان' جن میں سے 25 فیصد مسلمان تھے' مستقل غلامی میں تھے اور ان پر اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے جبر کیا جاتا تھا۔ امریکی آئین کی ایک شق 1808ء تک غلاموں کی درآمد ختم کرنے کا تقاضا کرتی تھی تاہم غلامی 1865ء یعنی اس عمل پر سے برطانوی قانون کا سایہ ہٹ جانے کے بھی چھبیس برس بعد تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ [11]

باقی تمام مسلمان ہمارے ساحلوں پر رضاکارانہ طور پر آئے اور ان میں سے کچھ تو شمالی امریکہ میں سب سے پہلے وارد ہونیوالوں میں سے تھے۔ ایک قدیم دستاویز بتاتی ہے کہ کولمبس کے شمالی امریکہ کے پہلے بحری سفر سے تین صدیاں پہلے 1178ء میں مسلمان جہاز راں یہاں آ چکے تھے۔ ان جہاز رانوں میں سے کچھ کا تعلق چین سے اور کچھ کا مغربی افریقہ سے تھا۔ [12] 1312ء میں افریقہ کے علاقے مالی کے مسلمانوں نے دریائے مسسپی کے راستے مستقبل کے اندرونی امریکہ کو سب سے پہلے دریافت کیا۔ 1492ء میں کرسٹوفر کولمبس کے ''نئی دنیا'' کے پہلے کامیاب بحری سفر میں بہت سے مسلمان اس کے عملے میں شامل تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک دستاویز بھی لایا تھا جس میں عرب عالم الادریسی نے لکھا تھا کہ آٹھ مسلمان دریافت کنندگان نے برسوں پہلے ایک نیا براعظم دریافت کیا تھا۔ [13]

بعد کے تارکین وطن میں وہ مسلمان تھے جو کیتھولک ظلم و ستم سے بچنے کے لیے سپینی دریافت کنندگان میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض مسلمان فلوریڈا اور جنوب مغربی امریکہ میں آباد ہو گئے۔ جبکہ پورے براعظم میں قائم کیے جانے والے ریلوے نظام کی تعمیر کرنے والے چینیوں میں مسلمان بھی شامل تھے۔ 1960ء کی دہائی کے اواخر میں مسلمان کثیر تعداد میں جنوبی ایشیا اور عرب ریاستوں سے ترکِ وطن کر کے آئے۔ خانہ جنگی کے بعد مسلمانوں نے زیادہ ترکِ وطن کیا اور جنگوں اور ابتر حالات کے ساتھ ساتھ ترکِ وطن میں بھی اضافہ ہوا۔ [14] 1995ء تک تارکین وطن امریکی مسلمانوں اور پیدائشی امریکی مسلمانوں کی تعداد مساوی ہو چکی تھی جو کہ پچاس مختلف نسلی گروپوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

لمبے عرصے سے مسلمانوں میں افریقی امریکی سب سے بڑا نسلی گروپ چلے آرہے ہیں، یعنی کل تعداد کا ایک تہائی۔ [15] بایونس اور صدیقی پانچ برس پہلے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عربی النسل مسلمان کل تعداد کا 32 فیصد تھے جبکہ افریقی امریکی اور جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے مسلمان کل تعداد کا 29,29 فیصد تھے۔ ترک اور ایرانی پس منظر والے بالترتیب 5 اور 3 فیصد تھے۔ دیگر تجزیوں نے جنوبی ایشیائی مسلمانوں کا فیصد زیادہ جبکہ سیاہ فام اور عربی النسل مسلمانوں کا فیصد کم ظاہر کیا ہے۔ [16] 1992ء میں کیا گیا ایک تجزیہ بتاتا ہے کہ سیاہ فام 42 فیصد ہیں۔ [17] آٹھ سال پہلے کا تخمینہ ہے کہ قوم کی مسلم آبادی میں دس لاکھ افریقی النسل، نو لاکھ مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک سے آنے والے، ساڑھے چار لاکھ پاکستان اور ہندوستان سے آنے والے اور باقی ماندہ بلقان، البانیہ، ترکی، ایران اور شمالی افریقہ سے آنے والے شامل ہیں۔ [18] 1998ء میں دنیا بھر کے ایک ارب بیس کروڑ مسلمانوں کا ایک تجزیہ ظاہر کرتا ہے کہ عرب اور عربی النسل مسلمان کل تعداد کا دس فیصد ہیں، یہ فیصد امریکہ میں ان کے زیادہ فیصد سے متضاد ہے۔ اگست 2000ء میں کیا گیا زوگبی انٹرنیشنل کا سروے پیدائش کے اعتبار سے درج ذیل فیصد ظاہر کرتا ہے: مشرق وسطیٰ کے عرب 26.2 فیصد، جنوبی ایشیائی 24.7 فیصد، افریقی امریکی 23.8 فیصد، مشرق وسطیٰ کے غیر عرب 10.3 فیصد، مشرقی ایشیائی 6.4 فیصد، دوسرے علاقوں کے پیدائشی 11.6 فیصد۔

اگرچہ اب افریقی امریکی کل امریکی مسلمان آبادی کا صرف 25 فیصد ہیں تاہم وہ مذہبی برادری کا ایک متحرک حصہ ہیں۔ ایتھلیٹک کارناموں کے ذریعے عروج پر پہنچنے والے لاتعداد افریقی امریکیوں میں سے دو نے کھیلوں سے مختلف معاملات پر بول کر اپنی شخصیت میں مزید عظمت پیدا کی ہے۔

محمد علی دنیا کے زندہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ نامور اور سب سے زیادہ تحسین و ستائش کیے جانے والے شخص ہیں۔ ''یو ایس اے ٹوڈے'' نے اس سابق باکسنگ چیمپئن کو ''ایتھلیٹ آف دی سنچری'' قرار دیا اور ایتھلیٹک کارناموں کے حوالے سے صدی کے دیگر انتخابات میں بھی وہ سرفہرست رہے۔ تاہم وہ سیاسی گھونسے بازی میں اپنی پرسکون جرأت مندی کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ علی کو عوامی مسائل پر جرأت مندی کے ساتھ بات کرنے اور اپنے ایتھلیٹک کیریئر کی قیمت پر بھی اپنے موقف پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے وسیع پیمانے پر عزت و احترام حاصل ہوا ہے۔

انہوں نے ''نیشن آف اسلام'' تنظیم کے ذریعے اسلام قبول کیا تھا مگر بعد ازاں ''نیشن آف اسلام'' کے اس وقت کے نسلی علیحدگی پسندانہ فلسفے کو مسترد کرتے ہوئے مرکزی دھارے کے مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ بہت عرصہ پہلے باکسنگ رنگ (RING) سے ریٹائر ہونے کے بعد سے علی اپنا بیشتر وقت اور آمدنی انسانی حقوق اور عالمی امن کے فروغ جیسے مقاصد پر خرچ کر رہے ہیں۔ وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ معروف شناخت کے حامل امریکی کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں اور انہیں ترقی پذیر دنیا اور خاص طور پر افریقی امریکیوں کے ثقافتی ہیرو ہونے کا منفرد مقام بھی حاصل ہے۔

سوانح نگار میکس ویلیس نے ''نیویارک ٹائمز'' میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں لکھا کہ علی نے ''سیاہ فاموں کے لیے کھیلوں کی دنیا کی برتری پسندانہ رواداری کو ختم کر کے کھیلوں کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے حقیقتاً تبدیل کر دیا۔'' یہ نسل پرستانہ سرگرمی ایک سابقہ افریقی امریکی باکسنگ چیمپئن جو لوئیس (Joe Louis) کے دور میں مقبول ہوئی تھی۔ لوئیس کو سپورٹس رائٹرز نے ''اپنی قوم کا فخر'' قرار دیتے ہوئے ان کی ستائش کی تھی' اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے ایک شکوہ نہ کرنے والے اطاعت شعار اور عاجز شخص کا اپنا تاثر برقرار رکھا ہوا تھا۔ ویلیس لکھتے ہیں: ''علی نے بھی اپنی قوم کا فخر بن جانے کا عزم کر رکھا تھا۔ تاہم ان کے نزدیک ان الفاظ کا مفہوم جو لوئیس سے مختلف تھا۔'' سپورٹس سوشیالوجسٹ ہیری ایڈورڈز لکھتے ہیں: ''علی سے پہلے سیاہ فام ایتھلیٹ سفید فام معاشرے کو تفریح مہیا کرنے والے بیسویں صدی کے گلیڈی ایٹرز (Gladiators)☆ ہوتے تھے۔''

فروری 1964ء میں علی نے اپنا پہلا ہیوی ویٹ ٹائٹل جیتنے کے بعد اسلام قبول کرنے کا اعلان کر کے کھیلوں کی دنیا کو حیران و ششدر کر دیا۔ ایک اخباری کانفرنس میں معاندانہ سوالات کا جواب دیتے ہوتے ایک اکثر حوالہ دیئے جانے والا اعلان کیا: ''آپ مجھ سے جو کچھ بننے کی خواہش رکھتے ہیں مجھے وہ نہیں بننا ہے۔'' اس کے فوری بعد انہوں نے اپنے نام کیسیکس کلے (Cassius Clay) کو ''غلامانہ نام'' کہتے ہوئے اپنا نام محمد علی رکھ لیا' تاہم

☆۔ گلیڈی ایٹرز (Gladiators): قدیم روم میں ایسے غلاموں کو ''گلیڈی ایٹر'' کہا جاتا تھا جنہیں رومی بادشاہ تفریح طبع کے لئے آپس میں لڑوا کر تماشا دیکھتے تھے' جبکہ بعض بادشاہ تو اتنے سفاک تھے کہ ان غلاموں کو خونخوار درندوں کے مقابلے میں اتار دیا کرتے تھے اور اس خونیں تماشے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (مترجم)

بہت سے سپورٹس رائٹروں نے' جو ایک باکسر کے سیاسی بیان دینے کی جرأت سے پریشان تھے' مہینوں ان کے نام کی تبدیلی کو قبول نہیں کیا۔

1967ء میں علی نے ویت نام کی جنگ کا شدید ترین مخالف ہونے کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا' حالانکہ پینٹاگون نے انہیں یقین دہانی کروائی تھی کہ دوسری جنگ عظیم میں جو لوئیس کے مانند انہیں بھی وردی میں کبھی محاذ جنگ کے قریب نہیں بھیجا جائے گا۔ وہ اپنا ہیوی ویٹ ٹائٹل برقرار رکھ سکتے تھے اور سابقہ جنگ میں لوئیس کی طرح فوجیوں کو صرف باکسنگ کا مظاہرہ کر کے لطف اندوز کر سکتے تھے۔

انہوں نے انکار کر دیا اور وضاحت کی: ''میں ہلاک کرنے والوں جتنا ہی مجرم ہوں گا۔'' ویلیس لکھتے ہیں کہ نیویارک باکسنگ کمیشن نے علی سے ٹائٹل واپس لے لیا حالانکہ اس نے دو سال کے عرصے میں دو سو سے زیادہ مجرموں کو لائسنس جاری کیے تھے۔ ''جبکہ علی کا سب سے زیادہ سنگین جرم دو سال پہلے ٹریفک قوانین کی ایک خلاف ورزی تھی۔'' ان پر فوج سے بھگوڑا ہونے کا الزام لگا دیا گیا' تاہم وہ چار سال پر محیط مہنگی قانونی جنگ کے دوران کبھی حرف شکایت لبوں پر نہیں لائے' جس کا اختتام تب ہوا جب امریکی سپریم کورٹ نے انہیں بے قصور قرار دیا۔ ''میرے اصول پیسے یا میرے ٹائٹل سے زیادہ اہم ہیں...... میں جانتا تھا کہ میں حق پر ہوں۔ مجھے مقابلہ کرنا ہی تھا۔''

انہوں نے اپنے عقیدے کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے کہا ''اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو وہ نہ ہوتا جو آج میں ہوں۔'' انہوں نے 1975ء میں ''پلے بوائے'' رسالے کو بتایا کہ وہ اپنے آپ کو اس حوالے سے یاد کیے جانا پسند کریں گے کہ ''ایک انسان جس نے مذہب اسلام کے ذریعے اپنے لوگوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔'' رمزے کلارک' جنہوں نے اٹارنی جنرل کے عہدے پر فائز ہوتے ہوئے علی پر فوج سے بھاگنے کا مقدمہ چلایا تھا' اب کہتے ہیں کہ علی امید کے عالمگیر مینارۂ نور ہیں۔ ''وہ ہر ایک کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ تم (ایک ساتھ) شریف اور طاقتور ہو سکتے ہو...... انہوں نے اپنی طاقت سے ہمیشہ شرافت اور محبت کو فروغ دیا ہے۔ وہ جس سب سے زیادہ اہم شے کی ترسیل کرتے ہیں وہ ہے ان کی محبت اور ان کی نیک کام کرنے کی آرزو۔''

ان بے عزتی کرنے والے تبصروں کے علاوہ جو وہ عمومی طور پر اپنے باکسنگ کے حریفوں پر کرتے ہیں — جنہیں وہ خود بھی ٹکٹیں فروخت کرنے کے لیے ''اشتہاری حربے''

قرار دیتے ہیں۔۔۔ علی اسلامی معیارات پر عمل کرتے ہوئے دوسروں پر نکتہ چینی سے پرہیز کرتے ہیں۔ سپورٹس رپورٹر جان ساراسینو لکھتے ہیں: ''بہت سے لوگوں نے علی کی مہربان فطرت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان لوگوں نے آج تک انہیں گالیاں دی ہیں' برا بھلا کہا ہے' خوب مطعون کیا ہے۔ علی جانتے ہیں کہ وہ لوگ کون ہیں' تاہم وہ کبھی کسی کے بارے میں کوئی برا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔'' 19

باسکٹ بال میں روایت کا مقام حاصل کر لینے والے ایک اور افریقی امریکی مسلمان کریم عبدالجبار کو' جنہیں اپنے ہم نام فٹ بال کے مشہور کھلاڑی سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے' 1995ء میں تاریخ کے عظیم ترین باسکٹ بال کے کھلاڑی کے طور پر ''ہال آف فیم'' کے لیے منتخب کیا گیا۔ جب سات فٹ دو انچ لمبے عبدالجبار ہائی سکول میں پڑھتے تھے تو انہوں نے اپنی ٹیم کے ساتھیوں کو پچانوے مرتبہ فتح سے ہمکنار کروایا جبکہ صرف چھ مرتبہ شکست کا سامنا ہوا۔ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا' لاس اینجلس میں انہوں نے برونز کو تین سال میں اٹھاسی فتوحات دلوائیں' اس کے مقابلے میں صرف دو میچ ہارے۔

وہ اپنے بیس سالہ پیشہ ورانہ دور میں اپنی ٹیم کے چھ مرتبہ نیشنل چیمپئن شپ جیتنے میں سب سے زیادہ قابل قدر کھلاڑی قرار پائے۔ 1989ء میں ریٹائرمنٹ پر وہ قومی باسکٹ بال ایسوسی ایشن میں نو شماریاتی زمروں میں نئے ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔

1996ء میں عبدالجبار نے ایک بیسٹ سیلر کتاب ''جری سیاہ فام'' (Black Profiles in Courage) لکھ کر سیاہ فاموں کے کھیلوں کے علاوہ شاندار کارناموں کو واضح کرتے ہوئے افریقی امریکیوں کی عزت نفس کو بڑھایا۔ ستمبر 2000ء میں ایک اور افریقی امریکی مسلمان اور قومی باسکٹ بال ایسوسی ایشن کے روشن ترین ستاروں میں سے ایک ستارے شریف عبدالرحیم اٹلانٹا میں مسلمان سکولوں کو ایک لاکھ ڈالر کا عطیہ دے کر ایک انسان دوست قرار پائے۔ 20

لوئیس فراخان ''نیشن آف اسلام'' کی قیادت کرتے ہیں۔ یہ افریقی امریکیوں کی ایک تنظیم ہے جو پہلے تو سیاہ فاموں کی علیحدگی پسندی کا پرچار کرتی تھی نیز ابھی حالیہ زمانے تک بھی مرکزی دھارے کے مسلمانوں سے بعض نظریاتی اختلافات رکھتی تھی۔ اس تنظیم کے پیروکاروں کی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ ہے نیز یہ ڈیڑھ سو مساجد اور سسٹر کلارا محمد سکول کہلانے والے پچاس اداروں کا انتظام چلاتی ہے۔ 21

اگرچہ فراخان کے پیروکار مسلمان ہونے کا اعتراف کرنے والے افریقی امریکیوں کا ایک مقابلتاً چھوٹا گروہ ہیں' تاہم ان کی قومی شہرت اور اثر ورسوخ نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ ٹیلی ویژن کی ایک خوش گفتار شخصیت فراخان کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے کہ انہوں نے نوجوان افریقی امریکیوں میں خود اعتمادی پیدا کی ہے۔ انہوں نے 1995ء میں واشنگٹن کی طرف دس لاکھ انسانوں کے جلوس (Million Men March to Washington) کا اہتمام و انصرام کیا۔ اس میں دس لاکھ سے زیادہ افریقی امریکی مردوں نے شرکت کی۔ 2000ء میں انہوں نے خاندانوں کے جلوس (Family March) کا اہتمام کیا' جس میں غیر سیاہ فاموں سمیت تقریباً پانچ لاکھ افراد ملک کے دارالحکومت میں اکٹھے ہوئے۔

حالیہ زمانے تک بھی فراخان نسلی اتحاد (Racial Integration) کے مخالف رہے ہیں اور تقریباً مخصوص افریقی امریکی مقاصد کے لیے مہم چلا چکے ہیں۔ بعض اوقات انہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں پر شدید نکتہ چینی کی ہے' یہ وہ چیزیں ہیں جن کو مرکزی دھارے کے مسلمانوں نے آفاقیت' رواداری اور اسلام کے کثیر نسلیت کے اصولوں کی خلاف ورزی تصور کیا۔

فروری 2000ء میں شکاگو میں ہونے والی نیشن آف اسلام کی سالانہ عوامی عبادت کی تقریب میں فراخان اور امریکی معاشرے کے مرکزی دھارے کے مسلمانوں کے سب سے زیادہ قابلِ احترام قائد امام ڈبلیو۔ دین محمد متحد ہو گئے۔ فراخان کے چیف آف سٹاف لیونارڈ محمد نے اجتماع میں اعلان کیا کہ اب نیشن آف اسلام کے تمام پیروکار مسلم عقائد سے وابستہ ہوں گے: ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ''

عبادت کی یہ تقریب کئی برس تک نیشن آف اسلام کی قیادت کرنے والے علی جاہ محمد (Eli Jah Muhammad) کی پچیسویں برسی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ڈبلیو۔ دین محمد نے تنظیم چھوڑ دی اور مرکزی دھارے کے اسلام کے ایک رہنما بن گئے۔ ان کی تنظیم کے ارکان کی تعداد تقریباً ستر ہزار ہے' جنہیں بڑے شہری مراکز میں واقع مساجد سے خدمات مہیا کی جاتی ہیں۔ ان کے پیروکاروں کی تعداد رسمی اراکین سے زیادہ ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق یہ تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ [22] ان کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے امریکی سینیٹ کے اجلاس کے دوران نماز ادا کی۔

اسلامک سوسائٹی آف دی نارتھ امریکہ کے سیکرٹری جنرل' مرکزی دھارے کے

ایک ممتاز مسلمان سید محمد سعید نے شکاگو کے اجلاس میں فرا خان کے بیان پر انہیں سلامی دی۔ انہوں نے کہا: ''یہ ایک تاریخی موقع ہے۔ ہم نے اس لمحے کی آمد کے لیے ستر برس انتظار کیا ہے۔ یہ مسلم اتحاد کی طرف ایک عظیم قدم ہے۔'' انہیں یقین ہے کہ فرا خان کا فیصلہ مسلمانوں کے مابین عرصۂ دراز سے چلے آنے والے اختلاف کو مٹا دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ مرکزی دھارے کی برادری کو وسعت عطا کرے گا جس میں پہلے ہی افریقی امریکی کل تعداد کا ایک چوتھائی ہیں۔ 23

بایونس اور صدیقی کی تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ عوامی یک رُخے تصورات کے برعکس امریکی مسلمان برادری بہت سی نسلوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہے، جو عمومی طور پر خوب تعلیم یافتہ، محنتی، کامیاب اور قانون کی پابندی کرنے والے ہیں۔

مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ بایونس نے ایک غیر مطبوعہ تحقیق کا خلاصہ بیان کیا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ بیس سال سے چالیس سال کی عمر والے گروپ کے برسر روزگار مسلمان اوسطاً تین سال کالج میں پڑھ چکے ہیں — قومی اوسط سے دو سال زیادہ۔ اس گروپ کی سالانہ اوسط شخصی آمدنی درمیانے اور اوسط درجے کے مابین ہے، یعنی 39700 ڈالر، جو ایک ایسے گروپ کے لیے حیران کن حد تک زیادہ ہے کہ جس میں بہت سے نئے تارکینِ وطن شامل ہوں۔ یہ تخمینے کسی حد تک ان امریکی پالیسیوں کے اثرات کو منعکس کرتے ہیں جو کالج ڈگری کے حامل تارکینِ وطن کو ترجیح دیتی ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ سے باہر مسلمانوں کی اکثریت غربت و افلاس میں رہتی ہے۔

1974ء میں ہونے والی نمونہ جاتی تحقیق نے ظاہر کیا کہ مسلمانوں میں بے روزگاری صرف دو فیصد ہے یعنی قومی اوسط سے نصف۔ 24 ان کے ہاں جرائم کی شرح بھی کم ہے۔ 1995ء میں بایونس نے نیویارک سٹی میں تحقیق کی، جو غیر مطبوعہ ہے، وہ تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ تیرہ سے انیس برس کی عمر کے مقامی مسلمانوں کی گرفتاری کی شرح بہت معمولی ہے۔ یعنی تمام نوجوانوں کی تعداد کا 001. فیصد، جو کہ 15 فیصد کی قومی اوسط سے بہت ہی کم ہے۔

بایونس اور صدیقی اس نتیجے پر پہنچے ہیں: ''شمالی امریکہ کے مسلمان ہر اعتبار سے غربت کی ماری ہوئی، غیر تعلیم یافتہ اور بے خانماں اقلیت کی اس روایتی تصویر سے مشابہت نہیں رکھتے، جس کے بارے میں امریکی ڈراؤنے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔'' 25

امریکی مسلمان پرچون فروشی کے علاوہ انجینئرنگ، کاروباری انتظام (بزنس

ایڈمنسٹریشن) طب' مالیات' حسابیات' الیکٹرانکس' سائنس اور تعلیم میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔

53 سالہ مصری نژاد احمد زیوائل نے' جو لاس اینجلس کے کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پروفیسر ہیں' 1999ء میں کیمسٹری میں نوبل انعام حاصل کیا۔ جو انہیں ایک سیکنڈ کے چارار بویں حصے میں کیمیائی ردِعملوں کو مانیٹر کرنے اور ایٹموں کی حرکت کو ریکارڈ کرنے والا کیمرہ تیار کرنے پر دیا گیا تھا۔ ان کے کارنامے نے ٹیکنالوجی کے نئے آفاق عیاں کر دیئے ہیں۔

بڑی صنعتوں کے ایسے چیف ایگزیکٹو افسروں میں جو مسلمان ہیں: ان میں شامل ہیں اے ایس ٹی کمپیوٹرز کے صفی قریشی' اوکسیڈینٹل پیٹرولیم کے رے ایرانی اور اےتھن ایلن فرنیچر کمپنی کے فاروق کاٹھواڑی قابل ذکر مسلمانوں میں شامل ہیں: بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہر سیاسیات (پولیٹیکل سائنٹسٹ) کینیائی نژاد علی المازوری' بنگھمٹن یونیورسٹی' سٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک کے انسٹی ٹیوٹ آف گلوبل کلچرل سٹڈیز کے ڈائریکٹر اور پروفیسر آف ہیومینٹیز البرٹ شوائنٹزر' ایوانسٹن' الی نائے کی نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے چیئرمین ابراہیم ابولگوڈ' ڈی پال یونیورسٹی شکاگو کے شریف باسیونی' یونیورسٹی آف شکاگو کے پروفیسر راشد خالدی' جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے ہشام شربی' جو کہ مرکز برائے پالیسی تجزیات واشنگٹن ڈی۔ سی کے ڈائریکٹر بھی ہیں نیز سٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میڈیکل سکول کے ایم۔ اے۔ کیو صدیقی۔

دوسرے مسلمان جنہوں نے قومی شہرت حاصل کی' ان میں شامل ہیں: متحرک فلموں اور ٹیلی ویژن فیچروں کے پروڈیوسر مصطفیٰ عکاد اور اسد کیلاڈ' امام ڈبلیو۔ دین محمدؐ' شاعر عامر برکہ جو پہلے لیری جونز ہوتے تھے اور موسیقار احمد جمال اور یوسف لطیف' مرحوم آرٹ بلیکی اور دیگر کا کیا مذکور۔

1991ء میں ہونے والی خلیج کی جنگ کے فوری بعد مسلمانوں نے امریکی مسلح افواج میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ مذہبی وابستگی کے ذاتی اعلانات ظاہر کرتے ہیں کہ 1992ء میں امریکی مسلح افواج میں تقریباً دو ہزار مسلمان تھے۔ [26] 1999ء میں امام یحییٰ ہینڈی نے تخمینہ لگایا کہ سات ہزار مسلمان امریکی افواج میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

2000ء میں نارفوک' ورجینیا میں واقع بحریہ کے مرکز میں پہلی مسجد قائم کی گئی۔ [27]

مستقلاً ترکِ وطن اور 3.5 فیصد شرح پیدائش کی وجہ سے' جو کہ اوسط سے دگنا

سے بھی زیادہ ہے' مسلمان امریکہ کی سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والی مذہبی برادری ہیں۔ اگر ترک وطن اور پیدائش کی شرحیں یہی رہیں تو 2027ء میں امریکہ مسلمان آبادی دگنی ہو جائے گی۔

اس رجحان میں مذکورہ بالا شرح پیدائش ایک اہم عامل ہے کیونکہ بیشتر لوگوں کے لیے مذہبی وابستگی مذاہب کے تقابلی مطالعے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک پیدائشی معاملہ ہے۔ عیسائیوں' یہودیوں' ہندوؤں' بدھ مت کے ماننے والوں اور دیگر عقیدوں کے لوگوں کی طرح مسلمان بھی مذہبی شناخت پیدائشی طور پر پاتے ہیں۔ بچپن میں ہی میں ایک پریسبائٹیرین اور لوسیلی ایک کیتھولک بن گئے کیونکہ ہمارے والدین انہیں مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ چند ایک امریکیوں نے محتاط مطالعے کے بعد شعوری چناؤ کرتے ہوئے ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دے کر اپنا لیا۔ عام طور پر تقابلی مطالعہ ہائی سکول کے زمانے کے بعد عمل میں آیا جب متعلقہ شخص کافی مدت پہلے کوئی وابستگی قائم کر چکا تھا۔ یہ بہت کم تبدیلی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ تاہم مستثنیات بھی موجود ہیں۔

اسلام کی قبولیت (Conversions) جسے مسلمان ''واپسی'' (Reversions) کہتے ہیں' بڑھ رہی ہے۔ میرے پاس کل تعداد کا حساب تو موجود نہیں ہے تاہم مسلمانوں کے ساتھ میرے گذشتہ پچیس برسوں کا تجربہ میرے اس یقین کی راہ کشادہ کرتا ہے کہ تعداد خاصی ہے۔ کچھ افریقی امریکیوں نے جبراً غلام بنا لیے جانے والے اپنے مغربی افریقی آباؤ اجداد کے نمایاں مذہب اسلام کی طرف واپس آتے ہوئے عیسائی وابستگیاں چھوڑ دیں۔ اس عمل میں ان میں سے کچھ لوگوں نے سفید فام آقاؤں کی طرف سے اپنے آباؤ اجداد کو دیئے گئے غلامانہ ناموں کو مسترد کرتے ہوئے' محمد علی کی طرح' عربی ناموں کو اپنا لیا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ تبدیلیاں (Converions) کل تعداد کا چھوٹا سا حصہ ہیں۔

کئی برس پہلے کی بات ہے کلنٹن سائپس نے ایک سوا سی درجے کا مذہبی موڑ لیا تھا۔ انہوں نے جرائم کی زندگی اور کوکلکس کلان (Ku Klux Klan) کی فعال رکنیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ ''میں ایک مکمل سند یافتہ نفرت فروش تھا۔ میں کلان کے جلاؤ' گھیراؤ' گھروں میں گھس جانے' میڈیا پر بیانات دینے اور حملوں وغیرہ میں بھرپور انداز میں ملوث تھا۔'' جیل میں کئی مرتبہ قید ہونے کے بعد آخر میں ان کی تبدیلی' مذہب عمل میں آئی تھی۔ جب سائپس وفاقی قید خانے میں قید تھے تو ایک افریقی امریکی سے ان کی دوستی ہو گئی جنہوں

نے ان کی تبدیلیٔ مذہب میں مدد دی۔ 28

اپنے سفروں کے دوران میری ملاقات ایسے امریکی مسلمانوں سے ہوئی جن کے آباؤ اجداد شمالی ایشیائی، مشرق وسطیٰ کے، افریقی اور اینگلوسیکسن یا مشرقی یورپی تھے۔ جب میں کالج کیمپسوں کے دورے کرتا ہوں تو میری ملاقاتیں مسلمان طلبا سے اکثر ہوتی ہیں، ان میں سے بیشتر مرد ہوتے ہیں جو جنوبی ایشیائی یا عرب ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے حال ہی میں اسلام قبول کرنے والی یورپی النسل عورتوں سے شادیاں کی ہوتی ہیں۔

شادی کا پیش خیمہ بننے والا بین المذاہب رومانس ہمیشہ نومسلموں کو جنم نہیں دیتا ہے۔ میرے ذاتی شناساؤں میں امریکی عرب امتیاز مخالف کمیٹی کی بورڈ چیئرمین نائلہ اسالی عیسائی ہیں جبکہ ان کے خاوند زیاد اسالی ایم۔ ڈی، جو امریکی کمیٹی برائے یروشلم کے چیئرمین اور متعدد عرب امریکی تنظیموں کے قائد ہیں، مسلمان ہیں۔ تھامس ایبرکرومبی نے ''نیشنل جیوگرافک'' رسالے کے ادارتی عملے میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے سے پہلے تیس سال کی عمر میں اسلام قبول کر لیا جبکہ ان کی بیوی لِن (Lynn) عیسائی ہی رہیں۔ ڈاکٹر ہشام شرابی کی مرحومہ بیوی گائل عیسائی تھیں۔

مذہب کی تمام تبدیلیوں میں رومانس ایک محرک نہیں ہے۔ اپریل شوکت تیس سالہ کنواری خاتون ہیں اور اردن میں امن فوج کی ایک رضاکار ہیں۔ میں ان سے ملا نہیں ہوں تاہم ای میل کا احسان ہے کہ میں نے ان کی قبولیت اسلام کے بارے میں جانا اور اس بارے میں کہ مذہبی وابستگی کی تبدیلی کے سبب خاندانی تعلقات میں پیدا ہونے والے کھنچاؤ پر وہ کس طرح غالب آئیں۔ ہماری مراسلت تب شروع ہوئی جب انہوں نے اسلام کے حوالے سے لکھے گئے میرے ایک مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھے کہا کہ میں واشنگٹن ڈی۔سی کے مضافاتی علاقے میری لینڈ میں ایک زیرِتعمیر اسلامی سکول کے لیے عطیات جمع کرنے کی تقریب سے خطاب کروں۔ پہلے کیے گئے وعدوں کی وجہ سے مجھے انکار کرنا پڑا تاہم بعد میں ہونے والی مراسلت نے مسلمانوں اور اسلام کی تفہیم میں میری مدد کی۔

ممکن ہے کہ ان کا تجربہ دوسرے نومسلموں کی نسبت مخصوص ہو۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا کوئی خاص واقعہ مذہبی تبدیلی کا باعث بنا؟ تو انہوں نے جواب دیا: ''میری زندگی میں کوئی ایک مرکزی واقعہ نہیں ہے۔ میں اُس وقت بائیس برس کی تھی اور کسی چیز کی متلاشی تھی لیکن میں کہہ نہیں سکتی تھی کہ جس شے کی مجھے تلاش ہے وہ مذہب ہے۔ ہم خدا پر پختہ

ایمان رکھتے تھے لیکن ہم مذہب پر عمل صرف اس حد تک کرتے کہ رات کے کھانے کے بعد برکت کی دعا مانگ لی یا مشکل میں مدد کی التجا کر لی۔ ہماری زندگیوں میں منظم مذہب کی غیر موجودگی کے باوجود ہمیں ہمیشہ مذہب کا احترام کرنے کا درس دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی خدا سے ذاتی تعلق استوار کیے ہوئے تھا' جس پر ہم شاذونادر ہی بات کیا کرتے تھے۔ اس پر بھی ہم ہمیشہ بہت قریب رہے۔ ہمارے والدین نے دیانت داری' انصاف اور شائستگی ہمارے ذہن و دل پر نقش کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا۔"

کسی دوسرے مذہب کی جگہ اسلام ہی کیوں؟

"کالج سے فراغت کے بعد میں نے لگ بھگ دو سال ٹویوٹا والوں کے لئے فنانس منیجر کے طور پر کام کیا۔ ٹویوٹا کے مقامی کاروباری شریک ایک مسلمان تھے اور ان کے بہت سے ملازمین بھی مسلمان تھے۔ اس عرصے کے دوران ایک مصری سے میری دوستی ہو گئی' جو کہ مسلمان تھا۔ شروع شروع میں میرے ردِعمل کسی بھی آزاد' تعلیم یافتہ مغربی عورت کے سے تھے' جس کو کہ اسلام کے بارے میں کوئی آگہی نہ ہو۔ میں اسلام کو عورتوں پر جبر و استبداد کرنے اور قوانین کے خبط کا ملزم ٹھہراتی تھی۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا کہ میں "بڑی تصویر" کو نظر انداز کر رہی ہوں یعنی خدا تمام دوسری چیزوں سے زیادہ بڑا ہے۔

"مہینوں تبادلۂ خیال اور مطالعہ کرنے کے بعد میرا نکتۂ نظر تبدیل ہونا شروع ہوا اور میں نے مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ صرف ایک بات مجھے روکے ہوئے تھی اور وہ یہ خوف تھا کہ میں حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا ماننے سے انکار کی پاداش میں جہنم میں ڈال دی جاؤں گی۔ میری مراد یہ ہے کہ میں اپنے نئے پائے ہوئے عقائد پر مکمل ایقان رکھتی تھی تاہم سوال تھا کہ کیا ہوگا اگر میں غلطی پر ہوئی؟ یقین کیجئے میں نے اس موضوع پر گھنٹوں تنہا غور و فکر کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ جس چیز نے اسے آسان بنایا وہ یہ علم تھا کہ میں حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر ماننے کا عقیدہ ترک نہیں کر رہی تھی۔ اسلام آپؑ کو پیغمبر تسلیم کرتا ہے۔"

شروع شروع میں اپریل کے والدین نے اس کے مذہب تبدیل کرنے پر زیادہ بات نہیں کی۔

"میں نے اب سے دو سال پہلے تک حجاب اوڑھنا شروع نہیں کیا تھا۔ ایسا تب ہوا جب میرا خاندان میرے مذہب تبدیل کرنے پر بہت زیادہ فکرمند ہو گیا۔ مجھے یقین ہے "امریکہ دشمن" سمجھے جانے والے مذہب کی یہ خارجی نمائش ہمارے درمیان پیدا ہو جانے والی

تقسیم کا باعث ہے۔ میرے مذہب تبدیل کرنے سے پہلے میرا خاندان اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یک رُخے تصورات اور تعصب کا حامل تھا۔ آج میرا خاندان میرا بہت ساتھ دیتا ہے۔ میرے والدین میرے عقائد کا احترام کرتے ہیں گو کہ ہم اتنے کشادہ انداز میں گفتگو نہیں کرتے جتنا کہ میں پسند کرتی ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک باہمی احترام کو پروان چڑھا چکے ہیں، جس نے میرے مذہب تبدیل کرنے سے پہلے کی نسبت زیادہ مضبوط رشتہ استوار کرنے میں مدد دی ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اب بھی بعض اوقات وہ پرانی اپریل کے کھونے پر رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔'' [29]

مذہبی سرگرمیوں کے علاوہ مسلمان اپنی مہمان نوازی کے لیے مشہور ہیں، ایک ایسی مسرت جس کا تجربہ لوسیلی اور میں یہاں اور بیرون ملک متعدد بار کر چکے ہیں۔ 1995ء میں مسلمانوں کے یک رُخے تصورات پر ہونے والی ایک ہفتہ بھر طویل کانفرنس میں شرکت کے لئے پینانگ، ملائیشیا کا دورہ خاص طور پر ناقابل فراموش ہے۔ ائیر پورٹ پر اٹارنی جنرل جان محی الدین (John Mohideen) نے ہمیں خوش آمدید کہا اور وہاں سے سیدھا اپنے گھر لے گئے جہاں ان کی بیوی مسلمہ نے ایک استقبالئے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ انہوں نے تلے ہوئے کیلے کا پکوان پیش کیا، اس کا ذائقہ نہایت اشتہا انگیز تھا۔ ایک ہفتے بعد کانفرنس ختم ہوگئی اور ہم گھر واپس جانے کے لیے ہوائی جہاز پر سوار ہونے ہی والے تھے کہ مسز محی الدین نے ہوائی جہاز کی روانگی والے دروازے پر لذیذ پکوانوں کے پیکٹ ہمارے حوالے کیے۔ جب ہم سفر کے دوران کیلے کھا رہے تھے، جو اس وقت بھی گرم تھے، تو ہم نے محسوس کیا کہ دوسرے مسافر ہمیں رشک آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مَیں مشی گن اور عراق میں خطاب کرنے کے لیے گیا تو وہاں مجھے مسلمان برادری اور ان کی خاندانی اقدار کے حوالے سے آگہی حاصل ہوئی۔ اپریل 1998ء میں ڈیئر بورن مشی گن کا دورہ بطورِ خاص معلومات افزا تھا۔ ایک مقامی مسجد میں خطاب سے پہلے میں مشرق وسطیٰ سے تجارتی سامان کے درآمد کنندہ رمزے بزی کے گھر گیا اور ان کی بیوی وردے، چار بیٹوں، تین بیٹیوں، ایک داماد اور ایک سالی پر مشتمل بڑے خاندان پر ایک نظر ڈالی کہ وہ کس طرح مل جل کر خوشی سے رہتے ہیں۔ عملی طور پر بزی کے خاندان میں دیگر ایسے افراد بھی شامل تھے، جن سے ان کا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ ایک ان کہے اتفاق رائے سے بزی بیشمار ہمسایوں کے قائد اور ذاتی مشیر بن چکے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ ان کے ہمسایوں کے باقاعدگی

سے اکٹھا ہونے کا مقام بن گئی ہے۔ بعض اوقات ان کی تعداد پچاس سے تجاوز کر جاتی ہے' جیسا کہ میرے دورے کی سہ پہر ہوا تھا۔ وہاں دن رات چائے اور کافی کے ساتھ ان کی پسندیدہ زبان میں گفتگو جاری رہتی ہے اور گفتگو کے موضوعات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

بزی خاندان کے سادہ سے بنگلے کو لوگوں کی مستقل آمدورفت کی وجہ سے نئے سرے سے بنایا گیا ہے۔ بزی نے باورچی خانے اور کھانے کے کمرے کو تہہ خانے میں منتقل کر کے مرکزی فرشی ''مجلس'' (کمرۂ استقبالیہ کا عربی مترادف) کو تین گنا بڑا کر لیا ہے۔ تہہ خانے میں انہوں نے ایک اضافی ''مجلس'' بنائی ہے۔ اگر متصل واقع باورچی خانے میں میز تمام کھانے والوں کے لیے ناکافی ہو جائے تو یہ اضافی ''مجلس'' کھانے کا کمرہ بنا دی جاتی ہے۔

1997ء میں ملاقاتی اتنی بڑی تعداد میں آئے کہ بزی کو اپنے دو کاروں والے گیراج کو تیسری مجلس میں تبدیل کرنا پڑا۔ ان کی بیوی' جو مسلمانوں کا روایتی حجاب اور لمبا لباس پہنے ہوتے ہیں' مہمانوں کی خاطر تواضع میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ ان کی بیٹیوں نے بتایا کہ برتنوں کی دھلائی اور چائے کافی کی تیاری کبھی رکتی نہیں ہے۔ میرے دورے کے زمانے میں بزی نے سڑک کے پار ایک بہت بڑی رہائش گاہ کی تعمیر کا آغاز کروا دیا تھا۔ انہوں نے فخریہ بیان کیا کہ اس رہائش گاہ میں ان کے خاندان کے دونوں حصے مزید نشوونما پائیں گے۔

بزی کا ڈئیر بورن والا گھر گریٹر ڈیٹرائٹ میں واقع ہے۔ اس شہری علاقے کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ یہاں مسلمانوں کی سب سے بڑی شہری آبادی موجود ہے۔ ان کی کل تعداد دو لاکھ اسی ہزار سے زیادہ ہے جو کہ علاقے کی آبادی کا 15 فیصد ہے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ ڈئیر بورن یا اس کے مضافات میں آباد ہیں۔ ڈئیر بورن ایک ایسا شہر ہے جس کے پبلک سکول منفرد ہیں۔ ڈئیر بورن کے فورڈسن ہائی سکول میں نوے فیصد طلبا مسلمان ہیں۔ جبکہ عملے کی صورتحال اس کے الٹ ہے یعنی ایک سو بیس اساتذہ میں تیرہ مسلمان ہیں۔ تاہم ایک مسلمان اور طلبا معاملات کے فیکلٹی ڈائریکٹر تحسین بزی کے مطابق سکول کمیونٹی مذہب پر کسی جھگڑے کے بغیر موافقانہ تعلقات کی وجہ سے مشہور ہے۔ سکول کی حدود میں باقاعدہ نماز کی اجازت تو نہیں ہے تاہم مسلمان طالب علموں کو جمعہ کی نماز میں شرکت کی اجازت دی گئی ہے۔

1995ء میں پہلی مرتبہ سکول نے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کو منانا شروع کیا۔ نوجوانوں کے مابین ریاست گیر بین المذاہب افہام و تفہیم کو فروغ دینے کے لیے فورڈسن سکول نے حال ہی میں شمالی مشی گن کے سکولوں کے طالب علموں کو سکول کے دورے پر بلایا اور ایک مقامی مسجد میں مذاہب کے حوالے سے تبادلۂ خیال کا اہتمام کیا۔ ڈیئر بورن کے دیگر دو پبلک سکولوں میں مسلمان طالب علم طلباء کی کل تعداد کا تقریباً 25 فیصد ہیں۔

تین سال پیشتر جب لوسیلی اور میں بغداد میں تھے تو ہم نے مسلمانوں کے مشترکہ خاندانوں کی روایت کی ایک اور مثال ملاحظہ کی تھی۔ عراقی دارالحکومت کے ہمارے پہلے دو دوروں کے دوران محمد الخفجی خاندان نے کشادہ دلی کے ساتھ ہماری میزبانی کی تھی۔ وہ غیر شادی شدہ ہیں اور اپنے مرحوم والد کے تعمیر کروائے ہوئے مکان میں سولہ افراد پر مشتمل تین نسلوں کے گھرانے کے سربراہ ہیں۔ ہمارے پہلے دورے کے وقت یہ خاندان ان افراد پر مشتمل تھا: محمد کی والدہ افتخار' دو غیر شادی شدہ بہنیں' دو شادی شدہ بھائی نشاط اور قاسم اور ان کے خاندان' نیز ان کی غیر شادی شدہ بہن ماہا جو ایک مقامی یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینئر نگ کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ نشاط کی دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ قاسم کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

ایک شام وہ خاندان رات کے کھانے پر ہماری میزبانی کر رہا تھا۔ بیشتر عراقی گھروں کی طرح الخفجی کا گھر مکمل طور پر ایک بلند دیوار سے گھرا ہوا ہے۔ اندر ایک سرے پر شہد کی مکھیوں کے چھتے اور سبزیوں کا باغ ہے' جو محمد کے سب سے زیادہ پسندیدہ مشاغل ہیں۔ دوسرے سرے پر ایک بڑا سبزہ زار (لان) ہے' جہاں شام کی مہمان نوازی کا آغاز ہوا۔ ہم چائے اور کیکوں سے لطف اندوز ہوتے رہے جبکہ محمد نے نزدیک ہی الاؤ پر ایک بڑی مچھلی بھونی۔ جب گھر کے کھانے کے کمرے میں رات کا کھانا (ڈنر) پیش کیا گیا تو یہ مچھلی سب سے اہم پکوان تھی۔ ڈنر کے بعد ہم کافی پینے اور گفتگو کے لیے سارے خاندان سمیت مرکزی ہال میں چلے گئے۔ دیر سے سہی محمد نے گھر کا ایک چکر لگوایا۔ سیڑھیوں کے اوپر ایک بڑے ہال کے دونوں اطراف بہت سی خواب گاہیں تھیں۔ ایک سرے پر محمد کی کتابوں سے بھری ہوئی سٹڈی تھی' گرمیوں میں یہ خاندان چھوٹی تیسری منزل کے اوپر چھت پر سونے کو ترجیح دیتا ہے۔ محمد نے ایک جرمن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اور ابھی حال ہی میں گاڑیوں کے کاروبار سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ اب انہوں نے گھر پر پوری توجہ مرکوز

کر دی ہے۔

محمد کے چار بھائی بہن امریکہ میں مڈویسٹ میں رہتے ہیں۔ ان کے بھائی عامر نے میری کتاب They Dare to Speak out پڑھنے کے بعد مجھے پیوریا' الی نائے' روٹری کلب میں خطاب کے لیے مدعو کیا تو ان کے ذریعے میرا الخفجی خاندان سے ابتدائی تعارف ہوا۔ انہوں نے پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اور بریڈلے یونیورسٹی کے شعبۂ انجینئر نگ کے سربراہ ہیں۔ دوسرے بھائی شاکر ڈیٹرائٹ میں آرکیٹکٹ ہیں اور انہوں نے نزدیک واقع این آربر میں یونیورسٹی آف مشی گن میں میرے خطاب کا اہتمام کروایا تھا۔ ایک بہن عین (ANN) ڈیٹرائٹ میں وکیل ہیں اور ان کے بھائی فارس' جنہوں نے حال ہی میں یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے' ڈیئربورن میں فورڈ موٹر کمپنی میں ملازم ہیں۔

مسلمان جہاں کہیں بھی رہتے ہوں بغداد اور ڈیئربورن کی طرح مشترکہ خاندان ان کی مشترک خاصیت ہیں۔ محمد الخفجی نے مجھے بتایا کہ بزرگ مسلمان الگ رہنے کو شاذونادر ہی پسند کرتے ہیں۔ وہ روایت کے مطابق اپنی کسی اولاد کے ساتھ یا کسی قریبی رشتہ دار یا دوست کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہمیں اس روایت کے بارے میں پہلی مرتبہ اس وقت علم ہوا جب ایک کویتی طالب علم ہمارے گھر آیا۔ جب ہماری گفتگو کا رخ اس امریکی رجحان کی طرف ہوا جس کے تحت بوڑھے لوگ ''ریٹائرمنٹ ہومز'' میں رہتے ہیں تو ہمارے مہمان نے گہری فکر کا اظہار کیا۔ شاید اپنے موقف پر زور دینے کے لیے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہوئے اس نے کہا: ''کویت میں جو کوئی بھی اپنے بوڑھے والدین کو نرسنگ ہوم میں بھیج دیتا ہے' اس کا مقاطعہ کردیا جاتا ہے۔ کوئی معزز کویتی کسی ایسے شخص سے تعلق نہیں رکھتا۔''

1988ء میں میرے دبئی کے پہلے دورے کے دوران ایک کاروباری (بزنس مین) عیسٰی الگرگ نے' جو بعد میں میرے قریبی دوست بن گئے' ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ انہوں نے میرا تعارف اپنی والدہ سے کرایا اور کہا کہ ان کا اصرار ہے کہ وہ اپنی باقی ماندہ عمر ان کے ساتھ رہ کر ہی بسر کریں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میری بیوہ والدہ نے کئی برس میری ایک بہن کے ہاں رہنے کے بعد اعلان کیا کہ انہوں نے اپنی ایک بیٹی اور پوتی کے خاندانوں کے قریب واقع ایک ریٹائرمنٹ ہوم میں رہنے کا منصوبہ بنایا ہے تو عیسٰی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا' ''انہیں ایسا مت کرنے دیجئے۔ آپ کو اس پر ساری زندگی پچھتاوے کا شکار رہیں گے۔ آپ کو اصرار کرنا چاہیے کہ وہ اپنے کسی بچے کے ہاں زندگی بسر

کریں۔" جب انہوں نے یہ بات کی تو مجھے پہلے ایک موقع پر کیا گیا لوسیلی کے والد اوویلا جیم کا تبصرہ یاد آ گیا۔ بوڑھے والدین کو ریٹائرمنٹ ہومز میں بھیجنے کے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا: "ایک ماں دس بچوں کا خیال رکھ سکتی ہے لیکن دس بچے ایک ماں کا خیال نہیں رکھ سکتے!" تاہم میرے مشورے کے باوجود میری والدہ نے ریٹائرمنٹ ہوم میں ہی رہنے پر اصرار کیا۔ اس وقت سے مجھے خطا کا احساس ستاتا رہتا ہے اور میں کبھی الگرگ اور اپنے سسر کے تبصرے فراموش نہیں کر پایا۔

کبھی امریکہ میں بھی مشترکہ خاندان کی روایت موجود تھی۔ ایک صدی سے بھی کم مدت پہلے کی بات ہے کہ یہ استثنا نہیں قانون ہوا کرتی تھی۔ میرے لڑکپن کے دوران میری دادی ہمارے سات افراد کے خاندان کے ساتھ ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہا کرتی تھیں۔ ایک دوسرے شہر میں میری ایک خالہ نے اپنے والدین کی وفات تک ان کی خدمت کی۔ بوڑھے لوگوں کو ریٹائرمنٹ اور نرسنگ ہومز میں بھیجنے کے مستحکم رجحان کے باوجود بہت سے امریکی اپنے معذور اور بوڑھے والدین کو اپنے گھروں میں ہی رکھ کر ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

ایک مسلمان فزیشن عنایت لالانی نے مجھے قبل ازیں بتایا تھا کہ ان کی ایک غیر مسلم بوڑھی مریضہ کا اصرار تھا کہ وہ تنہا ہی رہے گی۔"اس خوش طبع چوہتر سالہ مریضہ نے میری اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ یہ اس کے بچوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں اپنے ہاں رہنے کی دعوت دیں۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اس سے ان کی سماجی زندگی (سوشل لائف) متاثر ہوگی بشمول اس کی جنسی آزادی کے اور یہ کہ وہ کسی کی طرف سے اس طرح کی مداخلت کی پروا نہیں کرتی۔" اپنا تجربہ بتانے کے بعد لالانی نے جذباتی انداز میں پوچھا: "کسی انسان کے لیے کس شے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے' تحفظ اور تعاون یا آزادی' ہاں کبھی کبھی غلط روی کی آزادی بھی' تاوقتیکہ کسی کو نقصان نہ ہو؟"

ایسا لگتا ہے کہ ڈیئربورن کے مسلمان مشترکہ خاندان کی اسلامی روایت کو زندہ رکھنے میں کامیاب رہے ہیں تاہم انہیں زبردست چیلنجوں کا سامنا ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافے کے باوجود رمزے بزی کے غیر مسلم ہمسائے اسلام کے بارے میں معمولی سا علم رکھتے ہیں اور بین المذاہب یا بین البرادری (انٹرکمیونٹی) تبادلۂ خیال بہت کم کرتے ہیں۔

رابطے کے اس خلا کا باعث کئی عوامل ہیں۔ بڑی کی طرح بہت سے مسلمان پہلی اور دوسری نسل کے مسلمان ہیں۔ حالیہ عشروں میں امریکہ آنے والے دوسرے مذہبی اور نسلی گروپوں کی روایت پر عمل کرتے ہوئے بیشتر مسلمان دوسرے عقیدوں کے لوگوں سے الگ تھلگ اور قریبی باہمی روابط والی برادریوں کی صورت میں اکٹھے ہوگئے ہیں۔ جس چیز نے انہیں باہم اکٹھا کیا ہوا ہے اُسی نے انہیں غیر مسلموں سے الگ کردیا ہے۔ یہ چیز ایک امتزاج ہے زبان، ثقافت، لباس اور مذہب کا۔

زبان ایک ٹھوس رکاوٹ ہے کیونکہ بہت سے تارکین وطن روانی سے انگریزی نہیں بول سکتے اور انھوں نے اپنی مادری زبان بولنا جاری رکھا ہے۔ ڈیئربورن میں عربی پاس پڑوس میں اکثر بولی جانے والی زبان ہے اور نئی اور دوسری نسل کے تارکین وطن کے پسندیدہ اخبارات میں ایک پندرہ روزہ اخبار ''دی عرب امریکن'' ہے جس کے مدیر نوہاد انجی ہیں اور دوسرا اسامہ سبلانی کی ادارت میں شائع ہونے والا ہفت روزہ ''صدا الوطن'' ہے۔ ان دونوں اخباروں میں آدھے آدھے حصوں پر انگریزی اور عربی میں خبریں شائع کی جاتی ہیں۔

دوسرے امریکیوں کی طرح مسلمان بھی اپنے مذہب کے بارے میں شاذونادر ہی بات کرتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے غیر مسلم ہمسایوں اور کام کے ساتھیوں سے بھی گفتگو میں مذہب پر بات نہیں کرتے۔

امریکہ پر تنی ہوئی اسلام دشمن یک رُخے تصورات کی مایوس کن کہر کے باوجود تقریباً تمام مسلمان تارکین وطن یہیں رہ رہے ہیں اور دوسرے تارکین وطن کی طرح انہوں نے امریکہ چھوڑنے کے کسی رجحان کا اظہار نہیں کیا۔

میں صرف ایک ہی مثال پیش کرسکتا ہوں جس میں تارکین وطن نے امریکہ چھوڑنے کو ترجیح دی۔ ایک فزیشن، اس کی بیوی اور تین بچوں پر مشتمل ایک مسلمان خاندان پانچ برس امریکہ میں بسر کرنے کے بعد واپس پاکستان چلا گیا۔ مڈویسٹ کے ایک چھوٹے سے شہر میں وہ ایک ہندو خاندان کے دوست بن گئے جبکہ وہ خاندان بھی ایک فزیشن، اس کی بیوی اور تین بچوں پر مشتمل تھا۔ ان کے بچے مسلمان بچوں کے ہم عمر تھے۔

چھٹے برس میں یہ تعلق دفعتاً تبدیل ہوگیا جب باپ اس فکر میں مبتلا ہوگیا کہ اس کا خاندان اسلامی اور پاکستانی روایات کھو رہا ہے اور اس نے فیصلہ کیا کہ انہیں پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔ روانہ ہونے سے پہلے کے ہفتوں میں دونوں خاندانوں کے بچوں نے تو

1999ء کے آخری دنوں میں بہت سے امریکی بہت زیادہ تشدد کی بہت زیادہ حمایت کرنے لگے۔ ان کے ذہنوں میں اوکلاہوما کی خونریزی کی یادیں تازہ تھیں اور کلنٹن انتظامیہ نے انہیں خبردار کیا تھا کہ نئے سال کے دن یا جلد ہی مسلمان دہشت گردوں کا ایک اور حملہ متوقع ہے۔ خوف اس وقت بڑھ گیا جب امریکہ میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے ایک الجیریائی مسلمان کو کسٹم حکام نے کینیڈین سرحد پر سیٹل کے نزدیک مبینہ طور پر بم بنانے والے آلات سمیت پکڑ لیا۔ اس کی گرفتاری کا تذکرہ کئی روز تک تمام نیٹ ورکس سے نشر کیا جاتا رہا اور تمام اہم امریکی اخباروں کی شہ سرخیوں میں چھایا رہا۔ امریکی اس وقت بہت زیادہ مضطرب اور تشویش زدہ ہو گئے جب دو مزید مسلمانوں کو سیٹل میں پکڑے جانے والے الجیریائی یا اسامہ بن لادن سے روابط کے حوالے سے تفتیش کے لیے نیویارک سٹی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت براعظم افریقہ میں واقع دو امریکی سفارت خانوں پر 1998ء میں ہونے والے بم حملوں کے ماسٹر مائنڈ ہونے کے الزامات کے تحت مطلوب اسامہ بن لادن افغانستان میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا تاہم گرفتاریوں کی خبریں، دھمکیاں دیتے ہوئے اسامہ بن لادن کی تصویروں کے ساتھ شائع کی گئیں۔ جنہوں نے غیر ملکی دہشت گردی کا خوف پورے ملک میں پھیلا دیا۔

ان واقعات نے سینٹ لوئیس کے ایک مسلمان رہنما اور ایم ایس این بی سی کے ایک شریک کار محمد البندری کو یہ لکھنے کی تحریک دی: ''بہت سے امریکی مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ قوم دہشت گردی کے الزامات لگا رہی ہے جس سے مسلمانوں کو خوف لاحق ہو گیا ہے کہ ان کے اور ان کے مذہب کے منفی تصورات امریکی ذرائع ابلاغ پر ایک بار پھر نمایاں ہو رہے ہیں۔'' انہوں نے ایک سروے کا حوالہ دیا جس کے مطابق دسمبر 1999ء میں یہ اضافہ 51 فیصد تھا۔ اسلام کے دہشت گردی سے روابط کی خبروں کی اشاعت اور اس کے ساتھ ہی امریکی محکمۂ خارجہ کی طرف سے بیرون ملک سفر کرنے والے امریکیوں کو تنبیہ کے بعد یہ اضافہ رونما ہوا۔ البندری نے واضح کیا کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے والے یک رُخے تصورات نے ''گہرے گھاؤ لگائے ہیں''۔ [24]

اوکلاہوما سٹی میں ہونے والے بم دھماکوں اور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی ڈاکیومنٹریوں کے نتیجے میں لگ بھگ چار برس تک امریکی مسلمانوں نے انتہائی جھوٹے یک رُخے تصورات کا سامنا کیا۔ آخر کار چند ہفتے قبل امریکی ایوانِ نمائندگان کی قیادت نے فیصلہ

حواشی

1. ''ہمارے پہلے پانچ سال'' اے ایم سی' صفحہ 8
2. ایضاً ۔ صفحہ 12۔
3. عبدالرحمٰن لعموری کا انٹرویو' مورخہ 2000-1-18۔
4. دی آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ۔ جلد چہارم' صفحہ 278۔
5. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' سی ایم آر آئی۔ 1998ء' صفحہ 8-7
6. سلیمان نیانگ کا انٹرویو' مورخہ 2000-1-19۔
7. ڈاکٹر موسیٰ قطب کی ای میل مورخہ 1999-3-22
8. صفحہ 692
9. صفحہ 684
10. دی آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ۔ جلد چہارم' صفحہ 277۔
11. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' سی اے ایم آر آئی' صفحہ 19 اور ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' اے ایم سی' صفحہ 15۔
12. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' سی اے ایم آر آئی۔ صفحہ 16
13. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' اے ایم سی صفحہ 19۔ 1992ء۔
14. ''امریکہ میں مسلمان'' از عامر لشید علی محمد (آمنہ پبلی کیشنز) صفحہ 3۔
15. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' سی اے ایم آر آئی۔ صفحہ 18
16. ''ہمارے پہلے پانچ سال'' اے ایم سی' صفحہ 8
17. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' سی اے ایم آر آئی۔ صفحہ 55
18. ''امریکہ میں مسلمان آبادی'' اے ایم سی' صفحہ 12

19 "اسلام کا ایک خاکہ" (اسلامک پبلیکیشنز میلبورن) صفحہ 95۔

20 یو ایس اے ٹوڈے۔ 10-12-1999۔ صفحات A1-2 اور C11-13 نیز نیو یارک ٹائمز' 3-4-2000' صفحہ 9

21 "مسلم جرنل" 29-9-2000' صفحہ 1

22 "مسلمان اور اسلامائزیشن" از عنبر حق (آمنہ پبلیکیشنز' بیلٹس وائل) صفحہ 274۔

23 یو ایس اے ٹوڈے' 28-2-2000' صفحہ 3A' اے پی 28-2-2000 صفحہ 5' جرنل کوریئر' جیکسن وائل' الی نائے اور شکاگو ٹریبیون 3-9-2000 صفحہ 34۔

24 سید ایم۔ سعید کا انٹرویو 1-3-2000

25 "امریکہ میں مسلمان آبادی" سی اے ایم آر آئی' صفحہ 34

26 ایضاً صفحہ 35

27 "ہمارے پہلے پانچ سال" اے ایم سی' صفحہ 17

28 انٹرویو۔ 19-5-1999

29 "امریکہ میں مسلمان آبادی" سی اے ایم آر آئی۔ صفحہ 35

30 "سورج مغرب میں طلوع ہو رہا ہے" از مظفر حلیم (آمنہ پبلیکیشنز' بیلٹس وائل) صفحات 106-107

تیسرا باب

کیا مسلمان واقعی دہشت گرد ہیں؟

مسلمانوں کے ساتھ برسوں خط کتابت اور اسلامی دنیا کے بہت سے حصوں میں تبادلہ خیال کرنے سے میں اسلام پرسند تو نہیں بن گیا تاہم مجھے یقین ہے کہ اس تجربے نے مجھے امریکہ میں اسلام کے تاثر (Image) کے مسئلے کا حقیقت پسندانہ فہم ضرور عطا کیا ہے۔

مسلمانوں کے حوالے سے قائم کیے گئے بعض یک رُخے تصورات خوف پیدا کرتے ہیں۔

جولائی 1999ء میں نیویارک این جے میں اس کی ایک مثال سامنے آئی' جب ہیروئن کے لیے پیسے کے طلب گار ریجنالڈ کیوری نے خود کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے ایک بینک کے کیشیئر کو اس مضمون کی پرچی تھمائی: ''شروع اللہ کے نام سے' میرے پاس ایک بم ہے اور میں اسلام کے لیے اپنی جان دینے پر تیار ہوں۔ ساری رقم اس تھیلے میں ڈال دو اور ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا۔'' خوف زدہ کیشیئر نے اس کی ہدایت پر فوری عمل کیا۔ یہ فریب اس وقت کھلا جب کیوری کو گرفتار کرلیا گیا۔ [1]

دیگر مواقع پر جھوٹے تصورات نے کمیونٹی کی سطح پر تعصب اور مذہبی عدم رواداری' حتیٰ کہ تباہ کن تشدد کو ابھارا۔ حالیہ برسوں میں یوبا سٹی' کیلیفورنیا' سپرنگ فیلڈ' الی نائے' گرین وائل' جنوبی کیلی فورنیا اور منی پولس میں مسجدوں کو آتش زنی کا نشانہ بنایا گیا اور مشی گن' انڈیانا' میساچوسٹس' نیوجرسی اور جارجیا میں مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔

مئی 1999ء میں صبح سویرے گشت کرنے والے ایک چاق و چوبند پولیس مین نے دیکھا کہ ایک کار ہیڈلائٹس بجھائے آہستہ آہستہ ڈینور میں کولوراڈو اسلامک سنٹر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جونہی پولیس افسر ٹیری رائٹنگ کار کی طرف بڑھے' ڈرائیور نے' جسے

بعد میں جیک مرلن موڈگ کے طور پر شناخت کیا گیا' کار بھگا دی۔ پورے شہر میں تعاقب کرنے کے بعد پولیس نے موڈگ کو اس وقت گرفتار کرلیا جب اس نے ایک رہائش گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ موڈگ گرفتاری سے بچنے کے لیے مزاحمت کرتے ہوئے چیخا ''میں مسلمان قوم کا دشمن ہوں اور میں ان کی مسجدیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔'' پولیس افسروں نے اس کی کار سے ایک شاٹ گن' ایک رائفل' بہت سے ریوالور' ایمونیشن اور بم بنانے کے آلات برآمد کیے۔ [2]

جون 2000ء میں ایک بندوق بردار نے ممفس' ٹینی سی میں ایک مسجد پر گولیاں برسا کر ایک مسلمان کو زخمی کر دیا اور مسجد کے دروازوں میں بڑے بڑے سوراخ کر دیئے۔ وہاں کے نمازی ایسی توڑ پھوڑ اور زبانی کلامی تصادمات کے عادی ہو چکے ہیں۔

یونیورسٹی آف ممفس کی مسلمان طالب علموں کی ایسوسی ایشن کے صدر دانش صدیقی نے کہا: ''ہم پر بہت گند اچھالا جا چکا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ماری جوانا اور شراب پینے سے لے کر کتوں کے ساتھ ہمارا تعاقب تک کر چکے ہیں۔'' [3]

اسی مہینے اسلام کے حوالے سے ایک کمیونٹی لیڈر نے شکاگو کے ایک مضافاتی علاقے میں تنازعے کو ہوا دے دی' جس نے مہینوں جھگڑا کھڑا رکھوا کر اخباروں کی شہ سرخیوں کو جنم دیا۔ جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب ''قومی یوم عبادت'' کی رابطہ کار کیرن ہیمز نے شکاگو کے نزدیک واقع بارہ ہزار آبادی والی بستی پیلوس ہائٹس میں اسلام کو ''جھوٹا مذہب'' قرار دیا کیونکہ ان کے بقول یہ ان کے تصور خدا کو تسلیم نہیں کرتا۔

انہوں نے السلام مسجد فاؤنڈیشن کے اس فیصلے کے خلاف شکاگو پبلک ٹیلی ویژن پر اختلافی بیان دیا جس کے تحت یہ ادارہ ان کے آبائی قصبے جنوب مغربی شکاگو میں ایک چرچ کی عمارت خرید کر اسے ایک مسجد اور اسلامی سکول میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ پیلوس ہائٹس لگ بھگ چار سو مسلمان خاندانوں کا گھر ہے' جو کہ شکاگو کے علاقے میں بسنے والے تین لاکھ پچاس ہزار مسلمانوں کا بہت معمولی سا حصہ ہیں۔

میئر ڈین کولڈن ہوون نے ہیمز کے تبصرے کو ''توہین انگیز'' قرار دیا اور کہا کہ ''یہ عیسائی عقیدے کی ترجمانی نہیں ہے۔'' انہوں نے پوچھا ''مسلمانوں نے آخر کیا بگاڑا ہے؟'' تاہم مسجد پراجیکٹ کے خلاف احتجاج کے سیلاب کا سامنا کرتے ہوئے شہر کی کونسل نے ''مسلم فاؤنڈیشن'' کو منصوبہ ترک کرنے کے عوض دو لاکھ ڈالر دینے کی تجویز کے حق میں

ووٹ دیئے۔ 4 کولڈن ہوون نے اس پیشکش کو مسلمانوں کی توہین قرار دیا لیکن ''مسلم فاؤنڈیشن'' کی وکیل روحی شلبی نے اسے ''خیر سگالی کی علامت'' قرار دیا۔ پیلوس ہائٹس میں رہنے والے ایک مسلمان ایڈ حسن نے ایک مصالحانہ رائے کا اظہار کیا: ''میرا خیال ہے کہ ہم جیسے لوگ اپنے مذہب سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ وہ دوسرے مذاہب کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں بھی جنونی لوگ موجود ہیں۔ تاہم حقیقت میں ہر مذہب کا خدا ایک ہی ہے.....'' انہوں نے سٹی کونسل کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس طرح کام کر رہی تھی ''گویا ستر سالہ بوڑھے بدمعاشوں کا گروپ اپنے دھندے کے تحفظ کی کوشش کر رہا ہو۔'' الیگزینڈر کیتھولک چرچ کے ریورنڈ ایڈورڈ کرونن نے' جنہوں نے مسجد پراجیکٹ کے سرپرستوں کے لیے ایک بین المذاہب استقبالیے کا اہتمام کیا تھا' کہا: ''ہمیں یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ عیسائیت دروازے بند نہیں کرتی۔'' 5

میئر کولڈن ہوون نے دو لاکھ ڈالر کی تجویز کے خلاف ووٹ دیا اور فاؤنڈیشن کو تحریک دی کہ وہ میونسپلٹی کے خلاف 35 لاکھ ڈالر ہرجانے کا مقدمہ دائر کرے۔ موسم گرما کے اواخر میں ہرجانے کی رقم بڑھا کر باسٹھ لاکھ ڈالر کر دی گئی۔ شلبی نے کہا: ''یہ مقدمہ ایک پیغام ہے کہ آئندہ مسلمانوں کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے۔'' گریٹر شکاگو کی اسلامی تنظیموں کی کونسل نے ''مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حمایت کرنے والے پیلوس ہائٹس اور اس کے باہر رہنے والے لوگوں کے لیے شکریئے کا بیان جاری کیا۔'' 6

برسوں پہلے بھی اس علاقے کے مسلمانوں کو ایسے ہی مسائل کا سامنا تھا۔

1981ء میں ولا پارک کی اسلامی فاؤنڈیشن کے خلاف وہاں رہنے والے دو ہزار افراد نے ایک پٹیشن پر دستخط کیے جو اسلامی فاؤنڈیشن کی ایک سکول کی عمارت خرید کر اسے مسجد میں تبدیل کرنے کی تجویز کے خلاف تھی۔ مقامی مسلمان مقامی انتظامیہ کو عدالت میں لے گئے اور اکاون ہزار ڈالر کے قانونی اخراجات کے بعد انہوں نے عمارت کو خریدنے کا حق حاصل کر لیا تاہم انہوں نے بعد میں ایک دوسری عمارت خریدنے کا فیصلہ کیا۔ فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر عبدالحمید ڈوگر کے مطابق اس وقت سے توڑ پھوڑ کے چند واقعات کے علاوہ کمیونٹی روابط میں بہتری واقع ہوئی ہے۔

1989ء میں مورٹن گروو کے شہریوں نے اس وقت احتجاج کیا جب مسلم ایجوکیشن سنٹر نے مقامی پبلک سکول ڈسٹرکٹ کی ملکیتی زمین کو اسلامی سکول بنانے کے لیے خریدنے کی

خواہش کی۔ شکاگو میں قائم اسلامی تنظیموں کی کونسل کے سابق صدر محمد قیصر الدین کی مدد سے مقامی مسلمان احتجاج کرنے والوں پر غالب آ گئے اور انہوں نے سکول قائم کر لیا۔

پیلوس ہائٹس جھگڑے کے شروع میں قیصر الدین نے مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ وہ مقامی مسجد کے اپنے منصوبے پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہیں۔ انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ اختلاف زیادہ تر ایسے لوگ کر رہے ہیں جو نامعلوم خوف کا شکار ہیں' تجویز دی کہ پیلوس ہائٹس کے مسلمان اپنے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیں اور اپنے مخالفوں کو مشاہدہ کرنے دیں کہ وہ کس طرح رہتے ہیں۔" وہ نہیں جانتے کہ کس قسم کے لوگ آئیں گے اور انہیں ڈر ہے کہ جائیدادوں کی قیمتیں گر جائیں گی۔ یہ خوف بے بنیاد ہیں۔ 7

شکاگو کے علاقے کے مسلمان امریکیوں کے شہری حقوق اور قانونی دفاع کی تنظیم کے صدر عبداللہ مجل نے کہا: "بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ امریکی کمیونٹی میں مسلمانوں کے بارے میں علم کی کمی ہے۔ مسلمانوں کو دہشت گرد یا پردیسی (آؤٹ سائیڈرز) قرار دیا جا رہا ہے اور اس کی وجہ یہ خوف ہے کہ وہ امریکیوں کے طرز حیات کو خراب کر دیں گے۔ حالانکہ اصل مسئلہ لاعلمی ہے۔ مورٹن گروو میں یہی مسئلہ تھا اور پیلوس ہائٹس میں بھی ہمیں یہی مسئلہ درپیش ہے۔ 8

سال کے آخر تک شکاگو کے نواحی علاقوں میں مسجدیں ہی مسجدیں تعمیر ہونے لگیں۔ شوامبرگ میں پندرہ لاکھ ڈالر کی لاگت سے مسجد تعمیر ہو رہی تھی اور ڈیس پلینز میں پینتیس لاکھ کی لاگت ہے۔ ہنسڈیل میں ایک نئی جائے عبادت کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے اور شکاگو کے علاقے لوپ میں ایک عمارت کو مسجد میں بدلا جا رہا ہے۔

سلام المریعتی کو' جو لاس اینجلس میں قائم "مسلم پبلک افیئرز کونسل' کے قومی ڈائریکٹر ہیں' ذاتی طور پر اسلام کے حوالے سے یک رُخے تصورات کا تجربہ ہوا ہے: "جب نئے شناساؤں کو علم ہوتا ہے کہ میں ایک باعمل مسلمان ہوں تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ نہ تو میرے سر پر سینگ ہیں اور نہ ہی ان سے خون رس رہا ہے اور نہ دھواں اٹھ رہا ہے۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور اس سے محبت کرتا ہوں' سوٹ پہنتا اور ٹائی باندھتا ہوں اور اکثر اوقات لاس اینجلس لیکرز میں خطاب کرتا ہوں اور ایسا صرف اس لیے نہیں کرتا کہ ان کا عظیم ترین کھلاڑی بھی ایک مسلمان ہے۔ 9

غلط فہمی بعض اوقات تخریب کاری کو جنم دیتی ہے۔ اکتوبر 2000ء میں اسرائیل اور

مقبوضہ علاقوں میں تشدد بھڑکنے کے دوران جنوبی کیلی فورنیا میں ڈیڑھ سو سے زیادہ بچوں کو سکول جانے سے پہلے سے لے کر چھٹے درجے تک تعلیم دینے والے اسلامی سنٹر کو تین الگ الگ مواقع پر توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک موقع پر جب مسلمان نماز ادا کر رہے تھے تو داخلی دروازے کے شیشے کو توڑتا ہوا ایک بڑا پتھر اندر آن گرا۔ دوسرے موقع پر سنٹر کے پارکنگ لاٹ میں متعین محافظ اور قریب کھڑی وین پر روغن انڈیل دیا گیا۔ تیسرے واقعے میں ایسا لگتا ہے کہ یہودیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ سنٹر کے داخلی ستونوں پر سیاہ رنگ سے سواستیکا کے نشانات بنائے گئے اور مرکزی دروازے پر ''یہودیو! دفع ہو جاؤ'' لکھا گیا۔

سنٹر کے منتظم محمد جے۔ این۔ قریشی نے توڑ پھوڑ کو ''جرم نفرت'' قرار دیا۔ انہوں نے کہا: ''ہم چاہتے ہیں لوگ جانیں کہ ہم کون ہیں اور ہمیں قبول کریں۔ بظاہر اس قسم کے واقعات مشرق وسطیٰ میں تنازعے کھڑے ہونے کے فوری بعد رونما ہوتے ہیں۔ وہ تنازعات ہمارے خلاف اقدامات کو تحریک دیتے ہیں۔'' 10

لاس اینجلس کے انسانی روابط کمیشن (Human Relations Commission) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جو۔ آر۔ ہکس (Joe R.Hicks) نے سنٹر میں ایک اخباری کانفرنس کے دوران تخریب کاری کی مذمت کی اور مسلمان برادری کی حمایت کا اعلان کیا: ''جن لوگوں نے بھی یہ حرکت کی ہے، وہ اپنے نشانہ بننے والوں کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں۔ کمیونٹی کو آگے آنا اور صورتحال کو بہتر بنانے میں معاونت کرنا چاہیے۔'' اخباری کانفرنس کے شرکاء میں یہودی فیڈریشن (Jewish Federation) کے ہاورڈ ویلنسکی بھی موجود تھے۔

الرعیتی نے تخریب کاری کا ایک روشن پہلو پایا۔ انہوں نے پولیس اٹارنی جنرل اور یہودی لیڈروں کی طرف سے بہت زیادہ تعاون کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''اگر آج سے دس سال پہلے ایسا کچھ واقع ہوتا تو اس طرح کی مدد نہیں ملتی تھی۔'' لاس اینجلس کاؤنٹی میں دو لاکھ پچاس ہزار مسلمان رہتے ہیں جبکہ 75 مسجدیں اور اسلامی سنٹر موجود ہیں۔

کیپٹل ہل میں بھی اسلام کے بارے میں یک رُخے تصورات موجود ہیں۔ 1992ء میں اسلامی موضوعات کے ممتاز عالم اور مصنف رالف بریبنٹی نے کیپٹل ہل کے ایک دفتر میں ''اسلام کے ساتھ امریکہ کے دشمن کے طور پر انتہائی خوفزدہ برتاؤ'' ہوتا پایا۔ ان کا اشارہ دہشت گردی اور غیر روایتی جنگ پر مطالعے کے لیے قائم کی گئی ری پبلکن ٹاسک فورس کے سٹاف ڈائریکٹر یوسف بوڈنسکی کی کتاب کی طرف تھا۔ اس پینل کے سربراہ امریکی رکن

کانگرس فلوریڈا کے بل مکولم ہیں۔ 1993ء میں نیویارک سٹی میں واقع ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت پر ہونے والے بم حملے کے حوالے سے لکھی گئی ایک کتاب میں رسالے ''اسرائیلی ایئر فورس'' کے سابق ٹیکنیکل مدیر بوڈنسکی نے تخیل کی پرواز کا مظاہرہ کیا۔ بوڈنسکی نے تحریر کیا: ''اسلامی دہشت گردی مغرب خصوصاً امریکہ کے خلاف ایک مقدس جنگ ــــ جہاد ــــ کا آغاز کر چکی ہے' جو ابتدائی طور پر بین الاقوامی دہشت گردی کے ذریعے لڑی جا رہی ہے۔'' [11]

اس انداز کی مشہوری کچھ امریکیوں کے ایسا یقین کرنے کا باعث بنتی ہے کہ امریکہ میں ایک اسلامی خطرہ واقعتاً ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ امریکی مسلمانوں کی آبادی میں مستقل اضافے سے ڈرتے ہوئے وہ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ یہ رجحان امریکہ کی اسرائیل کے لیے طویل المدتی اور غیر مشروط حمایت کو کمزور کر دے گا۔ چرچ اور ریاست کی آئینی طور پر علیحدگی کے باوجود ٹیلی ویژن ایونجلسٹ پیٹ رابرٹسن کی سربراہی میں شہریوں کے ایک گروپ کا خیال ہے کہ امریکہ ایک عیسائی قوم ہے اور اس کو یقین ہے کہ مسلمان اس تصور کے لیے ایک خطرہ ہیں۔

پیشہ ورانہ اور مذہبی مفادات کے لیے یک رُخے تصورات گھڑنے اور خام جذبات کا استحصال کرنے والے لوگوں پر مستزاد وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ تو فقط حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکی یونیورسٹی کے پروفیسر ایموس پرلمٹر نے 1984ء میں انتباہ کیا ''مغرب' عیسائیت' جدید سرمایہ داری' صیہونیت اور کمیونزم سب کے خلاف بیک وقت ایک عمومی اسلامی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ [12] پرلمٹر کے ظاہر کردہ خوف کی بازگشت تعلیمی حلقوں میں موجود دوسرے افراد کے ہاں بھی سنائی دیتی ہے جو عیسائیت اور یہودیت دونوں سے اسلام کے بنیادی رشتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ اسلام کو مغرب کے لیے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں اور تخیل کے قابل غور جغرافیائی پھیلاؤ میں وہ اسرائیل کو ایک مغربی قوم اور مغربی کلچر کے ایک حصے کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

تخیلاتی غیر ملکی ولنوں پر حملے کرنا امریکہ میں نیا نہیں ہے۔ برسوں پہلے' شہرت کے بھوکے سیاست دانوں نے چین سے آنے والے تارکین وطن کو روکنے کی غرض سے ''پیلے خطرے'' سے ڈرایا۔ بعدازاں جب نیویارک کے گورنر ایل سمتھ پہلے رومن کیتھولک امیدوار برائے صدارت بنے تو کچھ لوگوں نے ــــ باآواز بلند نہیں بلکہ سرگوشیوں میں ــــ انتباہ دیا کہ وہ براہ راست وائٹ ہاؤس میں سنسنی پاپائیت کے اثرات لے آئیں گے۔ اس سے پہلے

سوویت یونین کو ''سرخ خطرے'' کے طور پر پیش کیا گیا۔ آج سوویت یونین کی جگہ اسلام کو افق پر منڈلاتا ہوا خطرہ قرار دیا جا رہا ہے۔ تاہم بدگوئی کرنے والوں کے مطابق باقی ماندہ روس بھی سوویت یونین کی طرح خطرناک ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی' نیویارک کے پروفیسر اور فلسطینیوں کے لیے کام کرنے والے ایڈورڈ ڈبلیو سعید واضح کرتے ہیں: ''جوڈتھ ملر' سیموئیل ہنٹنگٹن' مارٹن کریمر' برنارڈ لوئیس' ڈینیل پائپس' سٹیون ایمرسن اور بیری روبن جیسے ''ماہروں'' نیز اسرائیلی دانشوروں کے ایک پورے جتھے کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے اسلام کے خطرے کو یقینی بنا دیں' اس مقصد کے لیے وہ اسلام کو دہشت' جبر واستبداد اور تشدد سے خلط ملط کر دیتے ہیں اور اپنے لیے منافع بخش مشاورتیں' ٹی وی پر متواتر پروگرام اور کتابوں کے معاہدے یقینی بنا لیتے ہیں۔ اسلامی خطرے کو نامناسب حد تک خوف انگیز بنا دیا گیا لگتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس مفروضے سے کام لیا جا رہا ہے۔ (جو کہ سامیت دشمن خوف کا دلچسپ مترادف ہے) کہ ہر دھماکے کے پیچھے ایک عالمگیر سازش موجود ہے۔''[13]

المرعیتی اسلام کے حوالے سے عوامی حوالوں میں نامنصفانہ دہرے معیارات کی نوحہ خوانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اسلام نوع انسان کو شائستگی کا درس دیتا ہے تاہم یہ ناشائستگی کی حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ اسلام کا مطلب ہے امن وسلامتی اور یہ پوری دنیا میں امن کو عام کرنے کے لیے کوشاں ہے (اور) رواداری کو فروغ دیتا ہے۔ سلمان رشدی نے ''شیطانی آیات'' میں اسلام کو مسخ کیا' جس سے مجھے رنج ہوا ہے تاہم میں رشدی کے قتل کے نعروں کی بھی مذمت کرتا ہوں ...... اسلام ایک امن پسند' رواداری برتنے والا مذہب ہے۔ لوگ پھر بھی سے تشدد اور عدم رواداری سے جوڑ دیتے ہیں۔

''عیسائی رہنماؤں میں بھی بہت سے منافق شامل ہیں۔ خبروں اور مضامین میں دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام کو عمومی طور پر تشدد سے جوڑ دیا جاتا ہے لیکن جب دوسرے مذاہب کے لوگ دہشت انگیز کام کرتے ہیں تو ان کی مذہبی شناخت بیان نہیں کی جاتی ہے۔ خبروں میں کوسووو کے البانویوں کے قتل عام کو مشرقی آرتھوڈوکس سربوں کے ہاتھوں خونریزی یا برمیوں کی ہلاکتوں کو بدھ مت کے پیروکاروں کے ہاتھوں قتل وغارت یا فلسطینیوں کا یہودیوں کے ہاتھوں قتل عام نہیں لکھا جاتا۔ مسلمانوں کے سوا ہر مرتکب کو عموماً مذہب نہیں بلکہ قومیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔ عیسائیت کی تحقیر کے لیے متشدد عیسائی نہیں لکھا جاتا۔ لیکن اگر کوئی

مسلمان کسی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے بلا امتیاز امریکہ میں ''اسلامی خطرے'' کے ایک نمائندہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جب ہم توقف کریں اور ''یہودی'' ریاست کی ہلاکت انگیزی پر غور کریں جس نے لبنان پر چڑھائی کردی اور ہزاروں لوگوں کو قتل کر دیا' جو فلسطینیوں کے گھروں کو بموں کا نشانہ بناتی ہے اور فلسطینیوں کو ان کی مادر وطن سے نکال باہر کرتی ہے تو ہم ایسا سوچنے سے باز رہتے ہیں کہ یہودیت تشدد یا عدم رواداری کی تاکید کرتی ہے۔ یہاں واضح طور پر دہرا معیار برتا جاتا ہے جس میں اسلام کو بین الاقوامی تنازعوں پر بدنام کیا جاتا ہے۔ [14]

یہ دہرا معیار اسلام کے بارے میں سب سے زیادہ عام اور زہریلے یک رُخے تصور کو فروغ دیتا ہے یعنی مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑنا۔ میں نے جہاں بھی عام سامعین سے خطاب کیا اسی یک رُخے تصور کو تقریباً ہر شخص کے ذہن پر نقش پایا۔ میں نے جب کبھی سوال کیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے ذکر پر کون سا لفظ ذہن میں ابھرتا ہے تو سامعین میں سے کئی لوگوں نے عام طور پر لفظ دہشت گردی بولا اور دوسرے لوگوں نے اس پر آواز احتجاج نہیں کیا۔

مجھے یقین نہیں ہے کہ دہشت گردی والا یک رُخا تصور کسی جناتی بین الاقوامی یا قومی اسلام دشمن سازش کی پیداوار ہے بلکہ میں یہ مانتا ہوں کہ جھوٹے یک رُخے تصورات محدود اور متعصبانہ مفادات کے حصول کے لیے پھیلائے گئے ہیں۔

بعض اوقات اسلام کے حوالے سے جھوٹے تصورات کینے سے ابھرتے ہیں اور بعض اوقات بقول ولیم شیکسپیئر ''برتری کی خواہش'' سے۔

ذاتی شہرت اور آمدنی کی خواہش سٹیون ایمرسن جیسے دہشت گردی کے خودساختہ مبصروں کو امریکی مسلمانوں کو بدنام کرنے پر اکسا سکتی ہے۔ وہ اور ان جیسی ذہنیت رکھنے والے شہرت پرست لوگ بڑی چالاکی کے ساتھ مذہبی تعصبات اور کچے جذبات سے کھیلتے ہیں۔

نیویارک سٹی میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر انقلابیوں کے بم حملے کے ایک سال بعد 1994ء میں پورے ملک میں ایمرسن کی ایک ذاتی فتح یعنی ایک ڈاکیومنٹری فلم کو عوامی ٹیلی ویژن سٹیشنوں نے نشر کیا' جس کا نام تھا ''امریکہ میں جہاد: امریکہ میں مسلمان انتہاپسندوں کی سرگرمیوں کی تفتیش''۔

یہ تاریک پیش گوئیوں' طعنوں اور ہیجان زدہ اجنبی لوگوں کی فلم ہے جو ایک غیر ملکی زبان میں نعرے لگا رہے ہیں۔ اس فلم نے پوری قوم پر خوف کا بادل تان دیا اور امریکی مسلمانوں کے بارے میں بے اعتمادی پھیلانے کے لیے میری یادداشت میں محفوظ ہر واقعے سے زیادہ کام دکھایا۔

اس فلم کے بنانے والوں نے جہاد کی ایک جھوٹی تعریف کو استعمال کرتے ہوئے اس اصطلاح کو یوں پیش کیا ہے۔ گویا یہ ایک ٹک ٹک کرتا ہوا ٹائم بم ہے جو ہر جگہ کے معصوم لوگوں کے لیے خطرہ ہے۔ انہوں نے یہ تاثر پیدا کیا کہ "بنیاد پرست" مسلمان خطرناک اور جنونی لوگ ہیں جو امریکہ میں داخل ہو چکے ہیں اور انہوں نے ایک ایسا نیٹ ورک بنا لیا ہے جس کا مقصد امریکہ کی تباہی ہے۔ جہاد صرف تین مقاصد کا حامل ہے' دو کے بارے میں تو تقریباً سارے امریکی جوش وخروش سے بات کرتے ہیں۔ پہلا مقصد ہے انسان کا نیک زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے نفس سے کشمکش کرنا اور دوسرا مقصد ہے ناانصافی کے خلاف لڑنا۔ دونوں مقاصد دوسرے مذاہب کے اصولوں کی طرح اسلامی تعلیمات میں انسانی کوششوں کے اعلیٰ ترین مقاصد کے طور پر شامل ہیں۔ ایک تیسرا مقصد اور ہے: جب بھی اسلام پر حملہ ہو تو اس کا دفاع کرنا۔ "امریکہ میں جہاد" میں پیش کیے گئے متشددانہ تصور کے برعکس اسلام دہشت گردی اور جنون پسندی کی مذمت کرتا ہے۔ اینڈریو پیٹرسن لکھتے ہیں "اسلام کے نام پر تشدد غیر اسلامی عمل ہے۔ یہ مکمل طور پر اسلام کے الٹ ہے۔ اسلام کا مطلب امن ہے تشدد نہیں۔" وہ لکھتے ہیں کہ "امریکہ میں جہاد" خالصتاً پروپیگنڈا ہے جسے مسلمان دشمن جذبات کو بھڑکانے کے لیے گھڑا گیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ پروپیگنڈا کامیاب ہوا ہے۔

ڈاکیومنٹری میں پیش کیے گئے اشتعال انگیز تصورات کی وجہ سے ایمرسن کئی مہینوں سے قومی سطح پر نمایاں ہو گئے ہیں' بدنامی جو کہ 1950ء کی دہائی میں سینیٹر جوزف میکارتھی کی بری شہرت کی یادگار ہے۔ میکارتھی نے امریکی محکمۂ خارجہ کے ملازمین' اعلیٰ تعلیم کے رہنماؤں اور تفریحی صنعت کے ممتاز لوگوں کی وفاداری کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائے تھے۔ ان کی الزام تراشی نے ہزاروں محب وطن امریکیوں کو ہراساں کیا۔ آخر کار ڈکشنری میں ایک لفظ "میکارتھی ازم" شامل ہوا' جو کہ کردار کشی کے مترادف تھا۔

مجھے شبہ ہے کہ اصطلاح "ایمرسن ازم" ڈکشنری میں شامل نہیں ہو پائے گی۔ تاہم ایمرسن نے "امریکہ میں جہاد" کے ذریعے امریکی معاشرے کو جو نقصان پہنچا دیا ہے۔ وہ میکارتھی ازم

سے زیادہ دیرپا ہے۔ میکارتھی کا نشانہ بننے والوں کی عزت نفس کو تو امریکی سینٹ نے اس کے غلط رویے کی مذمت کر کے بحال کر دیا تھا لیکن ایمرسن کا نشانہ بننے والے اتنے خوش نصیب نہیں ہیں۔ اگرچہ ایمرسن معلومات اور تجزیے کے ایک وسیلے کی حیثیت سے اپنا اعتبار کھو چکے ہیں تاہم انہوں نے جو نقصان پہنچا دیا ہے وہ برقرار رہے گا۔ ''امریکہ میں جہاد'' کے چھ سال بعد ان کا نشانہ بننے والوں نے بمشکل مدافعت شروع کی ہے جبکہ جتنا زیادہ زہر انہوں نے پھیلا دیا ہے، وہ اب بھی قوم کو مسموم کر رہا ہے۔ احمد یوسف اور کیرولین ایف۔ کیبل نے مل کر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: ''گماشتہ: امریکہ میں مسلمان دشمن مہم کی پس پردہ حقیقت'' (The Agent: The Truth Behind The Anti-Muslim Campaign In America) اس کتاب میں ایمرسن کی بداخلاقی کو عیاں کیا گیا ہے تاہم امریکی کانگرس میں ان کی مذمت کی قرارداد پیش نہیں کی گئی۔ 15

مجھے دو مرتبہ ایمرسن کے ساتھ ملاقات کا تجربہ ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ 1984ء میں اس وقت ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی جب میں اپنی کتاب They Dare to speak out کا اختتامی کام کر رہا تھا۔ انہوں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ ''سعود کا امریکی گھر'' (The American House of Saud) لکھ رہے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے سعودی شاہی خاندان پر کیچڑ اچھالنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ وہ امریکی رائے عامہ کو غلط استعمال کرنے والی بڑی قوت ہے۔ وہ مجھ سے 1982ء کی کانگرس کی انتخابی مہم میں سعودی عرب میں کاروباری مفادات کے حامل لوگوں کی طرف سے دیے گئے عطیات کے بارے میں سوالات کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ کچھ افراد نے ذاتی طور پر دل کھول کر عطیات بھیجے تھے مگر وہ اتنی دیر سے موصول ہوئے کہ میری اس برس ناکام ہو جانے والی دوبارہ انتخاب کی کوشش میں کام نہیں آئے۔ بعد میں 1986ء میں ایمرسن سے میں ذاتی طور پر اُس وقت ملا جب ہم نے سی این این کے پروگرام ''کراس فائر'' میں اکٹھے شرکت کرنا تھی۔ پروگرام کے پہلے حصے میں ایمرسن اور میں نے ایک دوسرے کے ساتھ ضرور نرمی برتی ہوگی کیونکہ کمرشل بریک کے دوران ہمارے میزبانوں نے ہم سے اصرار کیا کہ ہم زیادہ جارحانہ پن اپنائیں۔ میں نے اس درخواست پر عمل کرنے کی اپنی سی بہترین کوشش کی۔

ایمرسن نے ''امریکہ میں جہاد'' یا اس دستاویزی فلم کے نشر ہونے سے پہلے اور بعد ٹیلی ویژن پر مسلسل پروگراموں اور ممتاز جرائد میں شائع ہونے والے مضامین میں اسلام کے

خلاف جو الزامات عائد کیے وہ غیر مہذبانہ تھے۔ وہ بعض اوقات نرم اور تقریباً معذرت خواہانہ انداز میں حملے کرتے ہیں گویا کوئی مہربان فزیشن لب مرگ مریض کو بری خبر نرمی سے سنانے کی کوشش کر رہا ہو۔ بعض اوقات یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایمرسن طمانچہ مار رہے ہیں یا رخسار پر نرمی سے ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکی مسلمانوں کی سخت الفاظ میں مذمت کرنے سے پہلے ایمرسن کی ڈاکیومنٹری میں کہا گیا کہ ''مسلمانوں کی کثیر تعداد عسکری گروپوں کی رکن نہیں ہے'' اور مزید کہا کہ ''اسلام مذہب کی حیثیت میں تشدد کو معاف نہیں کرتا۔'' تاہم وہ واضح طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان تردیدوں نے عمومی طور پر انہیں مسلمانوں پر عسکریت اور تشدد پسندی کے الزامات عائد کرنے کا لائسنس دے دیا ہے' حالانکہ تھوڑی دیر قبل وہ انہیں بری الذمہ قرار دے چکے تھے۔

ڈاکیومنٹری کا مواد واضح کرتا ہے کہ ''ان گنت کمانڈ سنٹر اور مواصلاتی اڈے'' ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جو مسلمانوں کو ''ایک اسلامی سلطنت قائم کرنے میں'' مدد دے رہے ہیں۔ اس میں انتباہ کیا گیا ہے کہ ''اگر امریکہ میں مسلمان انقلابیوں کی سرگرمیاں فروغ پا گئیں تو مستقبل میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر جیسے بم حملے ناگزیر ہیں۔'' کیونکہ ''قانون نافذ کرنے والے امریکی ادارے آئینی پابندیوں کی وجہ سے ملک کو محاذ جنگ بننے سے بچانے میں مشکل پائیں گے۔''

ایمرسن نے ''جیوئش منتھلی'' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں مسلمانوں پر زبردست کیچڑ اچھالا ہے۔ انہوں نے لکھا ''بدقسمتی سے امریکہ میں موجود تقریباً تمام اسلامی تنظیمیں جو اپنے آپ کو مذہبی یا ثقافتی حوالے سے مسلمان کہتی ہیں ان پر انقلابی بنیاد پرست عناصر کا مکمل غلبہ ہو چکا ہے۔ [16] اسی انداز میں انہوں نے سینٹ کی ایک سب کمیٹی کو ''مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے کارکنوں کے باہمی طور پر مربوط وسیع نیٹ ورک'' کی موجودگی سے ڈرایا۔ ''اسلامی بنیاد پرستوں کے روابط قاہرہ سے بروکلین' خرطوم سے بروکلین اور غزہ سے واشنگٹن تک پھیل چکے ہیں۔ [17]

''وال سٹریٹ جرنل'' میں ایمرسن نے لکھا کہ ''اسلامی بنیاد پرست'' اپنے دہشت گردی کے ڈھانچے کو تشکیل دینے کے لیے اپنی مساجد اور اپنے مذہبی رہنماؤں کو استعمال کرتے ہیں۔'' [18] سان ڈیاگو یونین ٹریبیون میں انہوں نے اعلان کیا: ''مغرب سے عسکریت پسند اسلامی بنیاد پرستوں کی نفرت کسی مخصوص عمل یا واقعے تک محدود نہیں۔ بلکہ

1999ء کے آخری دنوں میں بہت سے امریکی بہت زیادہ تشدد کی بہت زیادہ حمایت کرنے لگے۔ ان کے ذہنوں میں اوکلاہوما کی خونریزی کی یادیں تازہ تھیں اور کلنٹن انتظامیہ نے انہیں خبردار کیا تھا کہ نئے سال کے دن یا جلد ہی مسلمان دہشت گردوں کا ایک اور حملہ متوقع ہے۔ خوف اس وقت بڑھ گیا جب امریکہ میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے ایک الجیریائی مسلمان کو کسٹم حکام نے کینیڈین سرحد پر سیٹل کے نزدیک مبینہ طور پر بم بنانے والے آلات سمیت پکڑ لیا۔ اس کی گرفتاری کا تذکرہ کئی روز تک تمام نیٹ ورکس سے نشر کیا جاتا رہا اور تمام اہم امریکی اخباروں کی شہ سرخیوں میں چھایا رہا۔ امریکی اس وقت بہت زیادہ مضطرب اور تشویش زدہ ہوگئے جب دو مزید مسلمانوں کو سیٹل میں پکڑے جانے والے الجیریائی یا اسامہ بن لادن سے روابط کے حوالے سے تفتیش کے لیے نیویارک سٹی میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت براعظم افریقہ میں واقع دو امریکی سفارت خانوں پر 1998ء میں ہونے والے بم حملوں کے ماسٹر مائنڈ ہونے کے الزامات کے تحت مطلوب اسامہ بن لادن افغانستان میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا تاہم گرفتاریوں کی خبریں' دھمکیاں دیتے ہوئے اسامہ بن لادن کی تصویروں کے ساتھ شائع کی گئیں۔ جنہوں نے غیرملکی دہشت گردی کا خوف پورے ملک میں پھیلا دیا۔

ان واقعات نے سینٹ لوئیس کے ایک مسلمان رہنما اور ایم ایس این بی سی کے ایک شریک کار محمد البندری کو یہ لکھنے کی تحریک دی: ''بہت سے امریکی مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہورہا ہے۔ قوم دہشت گردی کے الزامات لگارہی ہے جس سے مسلمانوں کو خوف لاحق ہوگیا ہے کہ ان کے اور ان کے مذہب کے منفی تصورات امریکی ذرائع ابلاغ پر ایک بار پھر نمایاں ہورہے ہیں۔'' انہوں نے ایک سروے کا حوالہ دیا جس کے مطابق دسمبر 1999ء میں یہ اضافہ 51 فیصد تھا۔ اسلام کے دہشت گردی سے روابط کی خبروں کی اشاعت اور اس کے ساتھ ہی امریکی محکمۂ خارجہ کی طرف سے بیرون ملک سفر کرنے والے امریکیوں کو تنبیہ کے بعد یہ اضافہ رونما ہوا۔ البندری نے واضح کیا کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے والے یک رُخے تصورات نے ''گہرے گھاؤ لگائے ہیں''۔ [24]

اوکلاہوما سٹی میں ہونے والے بم دھماکوں اور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی ڈاکیومنٹریوں کے نتیجے میں لگ بھگ چار برس تک امریکی مسلمانوں نے انتہائی جھوٹے یک رُخے تصورات کا سامنا کیا۔ آخرکار چند ہفتے قبل امریکی ایوانِ نمائندگان کی قیادت نے فیصلہ

نیٹ ورک پر سنا کہ جائے واردات سے ایسے افراد کو فرار ہوتے دیکھا گیا ہے جنہوں نے سروں پر عربوں کے روایتی رومال باندھے ہوئے تھے۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر اندر صدر بل کلنٹن نے ٹیلی ویژن کے ذریعے سکون کی درخواست کی اور اعلان کیا کہ دھماکے کی وجہ اور ملزموں کا علم نہیں ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اس قسم کی افواہ سازی کا سلسلہ نہیں رکا جس کے تحت نامعلوم مسلمانوں کو مجرم ٹھہرایا گیا' جنہیں اوکلاہوما میں واقع دہشت گردوں کے مرکز سے بھیجا گیا تھا۔

خوفزدہ امریکہ تشویشناک سوالوں پر سوچ میں غلطاں تھا۔ اگلا ہدف کون سا ہوگا؟ وائٹ ہاؤس؟ کانگرس کی عمارت؟ سکول؟ شاپنگ مالز؟ ہر کوئی زوردار اور فیصلہ کن اقدامات کے لیے تیار ــــ بلکہ مشتاق دکھائی دیتا تھا۔ عوامی ایجنڈے پر جائز عمل کہیں نہیں تھا۔ امریکہ اور دہشت گردی کے موضوع پر ایک کتاب The Terrorist Trip: America's Experience With Terrorism کے مصنف جیفری ڈی سائمن نے 1996ء کے ''ورلڈ المانک'' میں بم باری کے بعد پیدا ہونے والے ہسٹیریا کا اندازہ لگایا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ''اس نے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا...... کیونکہ لاکھوں امریکیوں نے ملبے سے لاشوں کے نکالے جانے کا روح فرسا منظر دیکھا......'' انہوں نے مزید لکھا: ''یہ کوئی بڑا عالمی شہرت یافتہ مہانگر ((میٹروپولس)) نہیں تھا' جس پر حملہ ہوٗ بلکہ ملک کے وسط میں واقع ایک چھوٹا شہر تھا۔ اب پورے امریکہ میں ہر قصبہ اور شہر دہشت گردی کا ممکنہ ہدف تصور کیا جا سکتا ہے۔''

بم دھماکے کا مجرم ٹھہرائے جانے والے ٹموتھی میکوائی کی گرفتاری سے پہلے بے شمار ''مشرق وسطیٰ کے لوگوں سے مشابہہ'' افراد کو قانون نافذ کرنے والے افسروں کے ہاتھوں زحمت' شرمندگی اور ذلت برداشت کرنا پڑی۔ معاندانہ تصادم ہوئے۔ پورے ملک میں مسلمانوں اور عرب امریکیوں کو افسران قانون نے ڈرایا دھمکایا۔

یہ امریکہ کے لیے اچھا وقت نہیں تھا۔ اوکلاہوما سٹی میں ایک مسجد پر فائرنگ کی گئی اور ایک واقعے میں مشتعل ہجوم نے ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ سی بی ایس نیٹ ورک ٹیلی ویژن پر سٹیون ایمرسن کے اس بیان کے چند گھنٹوں بعد' کہ دھماکہ مسلمانوں نے کیا ہے' ایک مشتعل ہجوم نے ایک عراقی مسلمان مہاجروں کے خاندان کو مسلمان مخالف نعرے لگا کر اور پتھراؤ سے ان کے گھر کی کھڑکیاں توڑ کر ہراساں کیا۔ یہ احتجاج اتنا دہشت انگیز تھا کہ گھر میں موجود ایک حاملہ عورت کے ہاں وقت سے پہلے بچہ پیدا ہو گیا۔ نومولود لڑکے کا نام طنزیہ طور پر سلام رکھا

گیا' جو عربی میں امن کا مترادف ہے۔ بچہ پیدائش کے فوری بعد فوت ہو گیا۔ 22

اوکلاہوماسٹی کے ایک شہری ابراہیم احمد کو' جو اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے اردن جارہے تھے' لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر گرفتار کرلیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا نام عرب تھا' ان کی روانگی کا مقام اوکلاہوماسٹی تھا اور ان کے سوٹ کیس سے تاریں اور آلات برآمد ہوئے تھے۔ ہوائی اڈے پر ہی انہیں ہتھکڑی لگا دی گئی اور ایف بی آئی کی درخواست پر تفتیش کے لیے پولیس کی نگرانی میں واشنگٹن لے جایا گیا۔ جو چیزیں ان کے سوٹ کیس سے برآمد کی گئی تھیں' وہ ان کے اردن میں موجود رشتہ داروں کے لیے خریدے گئے بے ضرر تحائف ثابت ہوئے۔ بعدازاں وہ بالکل بے قصور نکلے اور انہیں رہا کر دیا گیا۔ لیکن ہراسانی' زحمت اور وسیع پیمانے پر مشہور کی گئی گرفتاری کی بنا پر انہوں نے امریکی حکومت کے خلاف مقدمہ دائر کردیا اور ہرجانہ حاصل کیا۔

دھماکے کے بعد والے تناؤ زدہ مہینوں میں بیشتر غیر مسلم امریکی متفق دکھائی دیتے تھے کہ یہ المناک کارروائی امریکہ میں گھس آنے والے غیر ملکی جنونیوں کا کام ہے۔ نیویارک سٹی میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ہلاکت انگیز بم دھماکے کی تازہ یادوں اور سٹیون ایمرسن کے جعلی اندازوں کی وجہ سے مضطرب ملک عربوں' ایرانیوں یا مسلمانوں کو مجرم سمجھنے پر تیار دکھائی دیتا تھا ـــــ ان اصطلاحوں کو مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا۔

کچھ مبصروں نے اس بم دھماکے کو مغرب کے خلاف مشرق کی شرانگیز اجنبی قوتوں کی بہت بڑی کوشش کا ابتدائی مرحلہ تصور کیا۔ دوسروں نے اس کو فلسطینیوں پر اسرائیلی جبر واستبداد کی امریکیوں کی طویل مدت سے جاری حمایت کا ردعمل جانا۔ نورمن اوکلاہوما کے اٹارنی ڈیوڈ میکرڈی نے دھماکے کے تھوڑی ہی دیر بعد ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ یہ بم دھماکہ ''مشرق وسطیٰ کے دہشت گردوں کی کارروائی ہے۔'' ان کے قیاس پر خصوصاً اعتبار کیا گیا کیونکہ کانگرس کے ایک حالیہ رکن کے طور پر وہ امریکی ایوانِ نمائندگان میں انٹیلی جنس کی مستقل کمیٹی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔

وسیع پیمانے پر یہ بات فرض کرلی گئی کہ کوئی امریکی شہری اپنے ملک کے معصوم شہریوں پر اس طرح کی ہولناک تباہی و بربادی مسلط نہیں کرسکتا۔ یہ بیرونی شرانگیز قوتوں کی کارروائی ہوگی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ جب میں نے بم دھماکے کی خبر سنی تو فوری طور پر زندگی میں سب سے بدترین جذبات مجھ پر طاری ہوگئے۔ امریکہ میں بین المذاہب تعاون

اور مشرق وسطیٰ میں انصاف کے لیے برسوں سے جدوجہد کرنے والے فرد کی حیثیت سے مجھے دلی صدمہ ہوا۔ سب سے پہلے تو مجھے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کے خاندانوں کا دکھ تھا لیکن مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ یہ حادثہ مسلمانوں اور عرب امریکیوں کے خلاف عداوت میں شدت پیدا کر دے گا۔

جب افواہیں پھیلیں تو میں سوچنے لگا کہ میں اس قومی مسئلے سے نمٹنے میں کیا کردار ادا کرسکتا ہوں۔ میں تخیل کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ معصوم شہریوں کو محض ان کی مذہبی وابستگیوں' ان کے ناموں کے ہجوں یا ان کی جلد کی رنگت کی وجہ سے ایف بی آئی تفتیش کے لیے گرفتار یا دوسرے طریقوں سے ہراساں کر رہی ہے۔ مجھے اس وقت بے حد سکون وطمانیت محسوس ہوئی جب ٹموتھی میکوائی کو گرفتار کر کے ملزم قرار دیا گیا اور اس کے مسلمانوں یا عربوں سے کوئی روابط دریافت نہیں ہوئے۔

اس بم دھماکے سے پیدا ہونے والے نتائج ہر اس شخص کے لیے غور وفکر کا سامان فراہم کرتے ہیں جو بین المذاہب افہام وتفہیم اور تعاون میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ اگر میک وائی گرفتار نہ ہوا ہوتا تو کس نوع کی المناک صورتحال رونما ہوتی؟ تمام شہریوں خصوصاً مسلمانوں کو افسر چارلس ہینگر کی چوکسی اور اعلیٰ کارکردگی پر ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ وہ ہائی وے پٹرول مین ہیں اور دھماکے کے فوری بعد اوکلاہوماسٹی سے 80 میل دور شمال میں ٹریفک کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک کار کو روکا' جس کو میک وائی ڈرائیو کر رہا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ کار پر لائسنس پلیٹ نہیں تھی۔ تلاشی لینے پر کار میں سے ایک ہتھیار برآمد ہوا اور میک وائی کو گرفتار کرلیا گیا۔ یہ پہلا قدم تھا اس سفر کا جو اسے کال کوٹھڑی تک لے گیا۔

میک وائی آسانی سے فرار ہوسکتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ جب میکوائی اوکلاہوماسٹی کے شمال میں جا رہا تھا تو ہینگر اور ان کے ساتھی افسر ٹریفک کی دوسری خلاف ورزیوں کی وجہ سے مصروف ہوتے۔ یا بہت ممکن ہے ہینگر چھپایا گیا ہتھیار برآمد نہیں کر پاتے۔ وہ ضرور میکوائی کو چالان اور وارننگ دے کر اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دیتے۔

اگر میکوائی گرفتار نہ ہوا ہوتا تو ایمرسن جیسے دہشت گردی کے خودساختہ ماہرین نیوز ایڈیٹروں کو اسلام دشمن تصورات فراہم کرتے رہتے۔ ملک میں جھوٹی افواہیں گشت کرتی رہتیں اور [illegible] مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ

انہوں نے اسے ملک گیر سطح پر قائم کر رکھا ہے' وہ اخباروں کی شہ سرخیوں میں موجود رہتا۔ دہشت زدہ امریکی مسلمانوں کو دہشت گرد جان کر مشکوک رہتے کہ وہی اوکلاہوماسٹی میں ہولناک تباہی کے ذمہ دار ہیں۔

ہزاروں معصوم شہری اپنے آپ کو مدافعتی حالت میں بے بس و لاچار پاتے۔ ہوسکتا ہے خوفزدہ لوگوں کے دباؤ پر کانگرس 1996ء کے دہشت گردی مخالف اور مؤثر سزائے موت کے قانون سے زیادہ وسیع اور خطرناک قانون سازی کرتی' مذکورہ قانون میں تارکین وطن کے لیے منصفانہ طریقۂ کار کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ ایمرسن کی ڈاکیومنٹری ''امریکہ میں جہاد'' کی ویڈیو ٹیپیں ایسی قانون سازی کروانے کی مہم کے دوران کانگرس کے دفاتر میں تقسیم کی جاتیں۔

میک وائی کی جلد گرفتاری کے باوجود عوامی تشویش و اضطراب میں کمی نہیں ہوئی۔ بم دھماکے کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو موت کی دھمکیوں سمیت ہراساں کرنے کے دوسو واقعات کی اطلاعات ملیں۔ [23]

اوکلاہوماسٹی بم دھماکے کے چار سال اور ''امریکہ میں جہاد'' کے پانچ سال بعد ٹیلی ویژن سے نشر کی گئی ایک اور ڈاکیومنٹری نے عوام کو دوبارہ پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس ڈاکیومنٹری میں اس نقصان کو دکھایا گیا ہے جو اسلام کی ساکھ کو صرف مسلمان کہلانے والا ایک شخص پہنچا سکتا تھا۔ پی بی ایس نیٹ ورک نے بظاہر ''امریکہ میں جہاد'' کے تسلسل کے طور پر ''فرنٹ لائن'' نامی سیریز میں ''دہشت گرد اور سپر پاور'' کے عنوان سے ایک فیچر نشر کیا۔ اس میں ایک سعودی منحرف اسامہ بن لادن کی اساطیری کہانی نشر کی گئی تھی' جو خود کو اسلام کا دفاع کرنے والے کے طور پر پیش کرتا ہے۔

اس نشریئے میں الزام لگایا گیا تھا کہ کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں 1998ء میں کیے گئے بم حملوں میں اہم کردار اسامہ بن لادن نے ادا کیا تھا۔ یاد رہے کہ ان دھماکوں میں امریکی عملے کے ساتھ ساتھ بہت سے مقامی شہری بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں بعدازاں اسی برس امریکی افواج کی طرف سے سوڈان اور افغانستان پر جوابی بمباری کا بھی تجزیہ کیا گیا تھا۔ پروگرام میں واشنگٹن کا یہ بے بنیاد دعویٰ بھی دہرایا گیا کہ سوڈان پر کیے گئے حملے میں ایک ایسے کارخانے کو تباہ کیا گیا جس میں وسیع پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے کیمیکل تیار کیے جاتے تھے۔

ڈاکیومنٹری میں اسامہ بن لادن نے اسلام کے نام پر مسلمانوں سے کہا کہ ''

جہاں بھی اور جب بھی امریکیوں کو دیکھیں انہیں قتل کر دیں۔'' یہ اپیل انصاف کے ممتاز ترین اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی تھی۔ انہوں نے امریکہ کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا اور کہا کہ تمام مسلمانوں کو امریکہ سے جنگ کرنی چاہیے۔

بے وردی یا باوردی امریکیوں کی موت کے اس عمومی نعرے نے امریکی مسلمانوں میں بہت زیادہ بے چینی پیدا کر دی۔ خصوصاً ان ہزاروں مسلمانوں کے لیے جو امریکی افواج میں خدمات انجام دے رہے تھے۔

اسامہ بن لادن کا مقصد کچھ بھی رہا ہو ڈاکیومنٹری کے پروڈیوسروں نے اس ڈاکیومنٹری کے لیے مواد جمع کرنے والے ''فرنٹ لائن'' کے عملے کی طرف سے اسامہ بن لادن کے اس طویل انٹرویو کو فراموش کر دیا جس میں انہوں نے امریکی حکومت کے خلاف غم و غصے کا جذبات سے بھرپور اظہار کیا تھا۔

جن حصوں کو پروڈیوسروں نے نظرانداز کر دیا ان میں اسامہ بن لادن نے امریکیوں کو قتل کرنے کی ہدایت میں بہتری پیدا کرنے کی کوشش میں دھمکی کو فوجیوں تک محدود کر دیا تھا۔ انہوں نے امریکی حکومت کی فلسطینی مسلمان عورتوں، مردوں اور بچوں پر ظلم و ستم کرنے والے اسرائیل کی طویل مدت سے حمایت کرنے پر بھی اس کی مذمت کی۔ اگرچہ انہوں نے اس امر پر غم و غصے کا اظہار نہیں کیا تاہم وہ افغانستان میں اسامہ بن لادن کے تربیتی کیمپ پر امریکی فوجوں کے داغے گئے کروز میزائلوں کا حوالہ دے سکتے تھے۔ اس حملے میں واضح طور پر اسامہ بن لادن اور ان کے حامیوں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

تاہم پروڈیوسروں کی دیانت داری ہے کہ انہوں نے انٹرویو کا سارا متن انٹرنیٹ پر جاری کر دیا اور متجسس ناظرین کو اس قابل بنا دیا کہ وہ امریکی حکومت کے خلاف اسامہ بن لادن کے خدشات اور امریکیوں کو قتل کرنے کی دھمکی میں کی گئی ترمیم کو ملاحظہ کر سکیں۔ تاہم یہ ان کی بددیانتی ہے کہ انہوں نے ٹیلی ویژن نشریئے سے انہیں نکال دیا اور ٹیلی ویژن کے ناظرین کو مخمصے میں چھوڑ دیا کہ امریکیوں کے خلاف اسامہ بن لادن کے لفظی آتشیں حملے کی وجہ کیا تھی؟ جن لوگوں نے ٹیلی ویژن پر نشر کی گئی ڈاکیومنٹری دیکھنے کے بعد انٹرنیٹ پر اسامہ بن لادن کے انٹرویو کے مکمل متن کا تجزیہ کیا وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ''فرنٹ لائن'' کے پروڈیوسروں نے اسرائیل کو تنقید سے محفوظ رکھنے کے لیے اسامہ بن لادن کے بیانات کو سنسر کر دیا تھا۔

1999ء کے آخری دنوں میں بہت سے امریکی بہت زیادہ تشدد کی بہت زیادہ حمایت کرنے لگے۔ ان کے ذہنوں میں اوکلاہوما کی خونریزی کی یادیں تازہ تھیں اور کلنٹن انتظامیہ نے انہیں خبردار کیا تھا کہ نئے سال کے دن یا جلد ہی مسلمان دہشت گردوں کا ایک اور حملہ متوقع ہے۔ خوف اس وقت بڑھ گیا جب امریکہ میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے ایک الجیریائی مسلمان کو کسٹم حکام نے کینیڈین سرحد پر سیئٹل کے نزدیک مبینہ طور پر بم بنانے والے آلات سمیت پکڑ لیا۔ اس کی گرفتاری کا تذکرہ کئی روز تک تمام نیٹ ورکس سے نشر کیا جاتا رہا اور تمام اہم امریکی اخباروں کی شہ سرخیوں میں چھایا رہا۔ امریکی اس وقت بہت زیادہ مضطرب اور تشویش زدہ ہو گئے جب دو مزید مسلمانوں کو سیئٹل میں پکڑے جانے والے الجیریائی یا اسامہ بن لادن سے روابط کے حوالے سے تفتیش کے لیے نیویارک سٹی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت براعظم افریقہ میں واقع دو امریکی سفارت خانوں پر 1998ء میں ہونے والے بم حملوں کے ماسٹر مائنڈ ہونے کے الزامات کے تحت مطلوب اسامہ بن لادن افغانستان میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا تاہم گرفتاریوں کی خبریں دھمکیاں دیتے ہوئے اسامہ بن لادن کی تصویروں کے ساتھ شائع کی گئیں۔ جنہوں نے غیر ملکی دہشت گردی کا خوف پورے ملک میں پھیلا دیا۔

ان واقعات نے سینٹ لوئیس کے ایک مسلمان رہنما اور ایم ایس این بی سی کے ایک شریک کار محمد البندری کو یہ لکھنے کی تحریک دی: ''بہت سے امریکی مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ قوم دہشت گردی کے الزامات لگا رہی ہے جس سے مسلمانوں کو خوف لاحق ہو گیا ہے کہ ان کے اور ان کے مذہب کے منفی تصورات امریکی ذرائع ابلاغ پر ایک بار پھر نمایاں ہو رہے ہیں۔'' انہوں نے ایک سروے کا حوالہ دیا جس کے مطابق دسمبر 1999ء میں یہ اضافہ 51 فیصد تھا۔ اسلام کے دہشت گردی سے روابط کی خبروں کی اشاعت اور اس کے ساتھ ہی امریکی محکمۂ خارجہ کی طرف سے بیرون ملک سفر کرنے والے امریکیوں کو تنبیہ کے بعد یہ اضافہ رونما ہوا۔ البندری نے واضح کیا کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے والے یک رُخے تصورات نے ''گہرے گھاؤ لگائے ہیں''۔[24]

اوکلاہوما سٹی میں ہونے والے بم دھماکوں اور ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والی ڈاکیومنٹریوں کے نتیجے میں لگ بھگ چار برس تک امریکی مسلمانوں نے انتہائی جھوٹے یک رُخے تصورات کا سامنا کیا۔ آخرکار چند ہفتے قبل امریکی ایوانِ نمائندگان کی قیادت نے فیصلہ

کیا کہ امریکہ کی مسلمان برادری کے لیے خیر سگالی کے جذبات کے اظہار اور ''اسلام دشمن عدم رواداری اور امتیاز'' کے خلاف قرارداد منظور کی جائے۔

دونوں جماعتوں کے کانگرس کے ارکان پر مشتمل گروپ کی ترتیب دی گئی قرارداد کے اصل الفاظ میں واضح کیا گیا ہے کہ ''جو تنظیمیں اس قسم کی عدم رواداری پیدا کرتی ہیں وہ نفرت کے ماحول کو جنم دیتی ہیں۔'' انہوں نے حکومتی اداروں اور شہریوں پر زور دیا کہ وہ اوکلاہاماسٹی بم دھماکوں کے بعد مسلمانوں کے خلاف ''فوری فیصلے'' جیسے اقدامات سے گریز کریں۔ اس قرارداد کے ایک حامی سینیٹر جوزف آئی لائبرمین نے' جو ایک یہودی ہیں' کہا کہ یہ مسلمانوں کو ''ہماری قوم کے آدرشوں'' کی طرف لانے کا وقت تھا۔ بعدازاں لائبرمین کو نائب صدر ایل گور (Al Gore) نے 2000ء کی اپنی ناکام ہوجانے والی صدارتی کوشش میں متبادل امیدوار بنایا۔

تاہم بنیاد پرست عیسائیوں اور چند یہودی تنظیموں کی طرف سے اعتراضات کے بعد ایوان کی عدلیہ کمیٹی کے ری پبلکنوں نے قرارداد میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔

انہوں نے درج ذیل باتوں کو حذف کردیا:

- اوکلاہوماسٹی کا حوالہ۔
- قانون سازوں کو پسند آنے والا ایک جملہ ''ایک سیاسی مباحثہ کیا جائے جس میں کسی پورے مذہب کو قربانی کا بکرا نہیں بنایا جائے۔
- ''عدم رواداری کو فروغ دینے والی تنظیموں'' کی مذمت کرنے والے الفاظ۔
- ''نفرت سے پھوٹنے والے تشدد'' کی مذمت۔
- ایک دفعہ (سیکشن) جس میں کہا گیا تھا کہ دہشت گردی پر ہونے والی'' کچھ بحثوں میں'' امریکی مسلمانوں کی ''تصویر کشی منفی انداز میں کی گئی ہے۔''

عرب امریکی انسٹی ٹیوٹ (Arab-American Institute) کے سربراہ' ایک عیسائی' جیمز زوگبی نے اس قلمزنی کو ''پہلے ہی سے محصور'' مسلمانوں کے خلاف جارحیت قرار دیا۔ انہوں نے مزید کہا: ''مسلمان برادری کے زخموں کا مداوا بننے کی بجائے (قرارداد میں ہونے والی یہ ترمیمات) ان مسائل کا ثبوت ہیں جو زخموں کا سب سے پہلا سبب ہیں۔'' انہوں نے نظرثانی شدہ قرارداد کو ''لایعنی'' قرار دے کر مسترد کردیا۔

امریکی مسلمان کونسل (American Muslim Council) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر

علی ابوزا کوک نے ان ترمیموں پر صدمے کا اظہار کیا اور کہا: ''اسے ایک متنازعہ قرارداد نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے تو صرف حقائق کو بیان کرنا چاہیے تھا۔''

رپورٹر فلپ شینن نے ''نیویارک ٹائمز'' میں لکھا کہ ری پبلکن نمائندوں عدلیہ کمیٹی کے چیئرمین ہنری ہائیڈ اور کمیٹی کے ایک رکن تھامس ایم۔ ڈیوس سوم نے ترجمان کے ذریعے اس امر کی تردید کی کہ ترمیموں کا مقصد قرارداد کو مسخ کرنا تھا۔ ''تبدیلیوں کے خواہشمند گروپوں کی نشاندہی سے انکار کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ قرارداد کو دوبارہ تحریر کرنے کے لیے روابط اثر انداز نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اوکلاہوما سٹی کا حوالہ اس لیے خارج کر دیا گیا'' کیونکہ اس کی وجہ سے ایوان میں بم دھماکے کے بعد متشددانہ ہراسانی کے حوالے سے مفصل اور وقت ضائع کرنے والی بحث کا امکان تھا۔''[25]

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایوان میں وقت ضائع کرنے یا نہ کرنے والی کسی قسم کی کوئی بحث سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ نہ تو یہ قرارداد ایوان میں پہنچی اور نہ ہی اس پر مزید غور کیا گیا۔ کانگرس اجلاس کے آخری دنوں میں ترمیم شدہ قرارداد کو خاموشی سے قانون سازی کی فہرست سے ہٹا لیا گیا۔

اگرچہ مرکزی فرقوں کی نمائندگی کرنے والی تنظیم ''دی واشنگٹن سٹاف آف دی نیشنل کونسل آف دی چرچز آف کرائسٹ ان یو ایس اے'' نے عوامی سطح پر کوئی احتجاج نہیں کیا تاہم اس کا گورننگ بورڈ 1986ء میں ایک تعمیری قرارداد منظور کر چکا تھا۔ اس قرارداد میں امریکہ میں اسلام دشمن' مسلمان دشمن اور عرب دشمن تعصب کی مذمت کی گئی تھی اور عیسائیوں' گرجا گھروں اور گرجا گھروں سے وابستہ اداروں کو کہا گیا تھا کہ: ''مسلمانوں اور عربوں کے شہری حقوق کی وکالت اور دفاع کریں۔'' اور ''مشرق وسطیٰ سے متعلقہ واقعات کی رپورٹنگ میں ظاہر ہونے والی سیاسی اور مذہبی ساز باز اور لفظی ہیرا پھیری کو مسترد کریں۔'' اس کے علاوہ قرارداد میں تمام جماعتوں کو تاکید کی گئی کہ وہ ''دہشت گردی قرار دیئے جانے والے واقعات کی پس پردہ وجوہات کی آگاہی حاصل کریں۔''

ہالی وڈ میں' جہاں بیشتر فلمیں اور بہت سی ڈاکومنٹری فلمیں تیار کی جاتی ہیں مسلمان ''دہشت گردی'' کا تصور بار بار ابھرتا ہے۔ 2000ء کے شروع میں پیراماؤنٹ پکچرز نے ''دشمنی کے قوانین'' (Rules of Engagement) کے ذریعے بہت زیادہ منافع کمایا۔ اس فلم میں عمومی طور پر مسلمانوں اور خصوصی طور پر یمنیوں کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا تھا جبکہ چا

کروڑ تیس لاکھ ڈالر سے زیادہ لاگت آئی۔ اگرچہ فلم کمپنی نے تردید کی کہ یہ فلم ''کسی حکومت' ثقافت یا افراد پر الزام تراشی نہیں تھی۔'' اس فلم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ مشتعل یمنی مسلمانوں کا ایک ہجوم جمہوریہ یمن کے دارالحکومت صنعا میں امریکی سفارت خانے پر فائرنگ کرتا ہے اور امریکی میرینز سفارت خانے کے عملے کو بچانے کے لیے خونریز جوابی حملہ کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہالی وڈ کے کسی سکرپٹ رائٹر کے زرخیز تخیل کی پیداوار تھی۔

فلم کا سب سے زیادہ گمراہ کن اور اشتعال انگیز حصہ ایک آواز تھی جو کہ جوابی حملے کا حکم دینے والے میرینز پر تخیلاتی امریکی کورٹ مارشل مقدمے کے دوران سنوائی جاتی ہے۔ یہ آواز مشتعل یمنی ہجوم کے لیڈر کی ہے' جو اپنے مسلمان پیروکاروں کو کہہ رہا ہے ''امریکیوں کو قتل کردو۔'' فلم دیکھنے کے دوران میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا ''فرنٹ لائن' کے کیمروں کے سامنے اسامہ بن لادن کی آتش بیانی نے فلم کے مصنف کو تحریک دی کہ وہ ڈرامے کے سکرپٹ میں یہ آواز شامل کرے' جو کہ اسلام کا پریشان کن اور جھوٹا تاثر دے۔ فلم کے اختتام پر دی گئی تحریر سامعین کو گمراہ کرتی ہے کہ یہ متنازعہ ڈراما حقیقی واقعات پر مبنی تھا۔

واشنگٹن میں یمن کے سفیر عبدالوہاب الحجری نے رسالے ''چیپل'' کو بتایا: ''فلم میں جو کچھ دیا گیا ہے اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ یمن میں رونما نہیں ہوا' پھر بھی مجھے کئی دوستوں نے' جو بہتر جانتے ہیں' فون کیا اور پوچھا: کیا واقعتاً ایسا کچھ ہو چکا ہے؟'' واشنگٹن میں یمنی سفارتخانے کے عملے کے ایک رکن احمد عاطف نے اسے ''آج تک بنائی جانے والی سب سے زیادہ عرب دشمن فلم'' قرار دیا۔ جب عرب سرپرستی ہی فلم کے بائیکاٹ کی صدا نے تھوڑا سا ہی اثر ڈالا تو الحجری نے فلم کے مرکزی اداکاروں ٹامی لی جونز اور سیموئیل ایل۔ جیکسن' ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کو یمن کا دورہ کرنے اور خود مشاہدہ کرنے کی دعوت دی کہ ان کی قوم امریکیوں کے حق میں امن پسند اور مہمان نواز ہے۔[26]

میں تقریباً روزانہ مسلمانوں کے حوالے سے یک رُخے تصور گھڑے جانے کا کوئی نہ کوئی نیا ثبوت پاتا ہوں۔ ابھی حال ہی میں یہ ثبوت رونالڈ بیکر سے ملا' جو ایک صنعت کار ہیں اور شکاگو کی طرف ایک پرواز میں میرے ہم نشست تھے۔ یہ جان کر کہ میں کانگرس میں خدمات انجام دے چکا ہوں انہوں نے کہا کیا آپ یقین کریں گے کہ جلد ہی مستقبل میں امریکہ کی سلامتی کے لیے ایک خطرہ پیدا ہوسکتا ہے؟ میں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کے سب سے بڑے دشمن سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے نفی میں

جواب دیا۔ انہوں نے مجھ سے بھرپور عدم اتفاق کیا اور پیش گوئی کرتے ہوئے کہا کہ سب سے بڑا اور قریبی خطرہ مسلمان ملکوں کی طرف سے اٹھے گا۔'' ذرا غور تو کیجئے! صرف ایک مسلمان قائد چند ایٹم بموں سے کیا کچھ کرسکتا ہے۔ میں مسلمان دہشت گردوں کی طرف سے حقیقی خطرہ پاتا ہوں۔''

انہوں نے گزشتہ روز ایک ہوائی جہاز میں ہونے والا اپنا تجربہ بیان کیا۔ ''ہم چھ مسافر ایک کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ جب گفتگو کا رُخ دہشت گردی کی طرف ہوا تو ہم چھ کے چھ افراد متفق تھے کہ اگلی عام جنگ مسلمان شروع کریں گے۔ سبھی اس بات پر بھی متفق تھے کہ امریکی عمومی طور پر یقین رکھتے ہیں کہ بیشتر دہشت گرد مسلمان ہیں۔''

انہوں نے کہا کہ وہ 1986ء میں اس وقت پہلی مرتبہ مسلم دہشت گردی کے بارے میں فکرمند ہوئے' جب انہوں نے سنگاپور کے ایک دورے کے دوران ''مسلمانوں کا متشددانہ رُخ'' دیکھا۔ صدر رونالڈ ریگن نے خلیج صدرا پر لیبیا کے دعوے اور برلن کے ایک کلب میں بم دھماکے سے دو امریکیوں کو ہلاک کرنے کی سزا دینے کے لیے حکم صادر کیا اور ایک امریکی جہاز نے لیبیا پر بم برسائے۔ ایک بے قابو ہجوم اس واقعے کے بعد امریکیوں کے خلاف احتجاج کررہا تھا۔ امریکی ہوائی حملے میں لیبیا کے حکمران معمر قذافی کی لے پالک شیرخوار بیٹی سمیت درجنوں شہری ہلاک ہوگئے تھے۔

بیکر نے مزید بتایا: ''سنگاپور کے مظاہرے اس قدر خطرناک تھے کہ میں اپنی حفاظت کے لیے خود کو آسٹریلوی ظاہر کرنے لگا۔'' میں نے اسے بتایا کہ مسلمانوں کے بارے میں گزشتہ پچیس برسوں میں میرا تاثر مثبت رہا ہے اور میں نے اسلام دشمن یک رُخے تصورات کی درستی کرنے کی اپنی کوششوں کا خلاصہ بیان کیا۔ وہ تو مجھ سے اکھڑ گیا: ''آپ ان متنازعہ لوگوں اور ان کے مذہب کے حوالے سے ایسی باتیں کرتے ہیں! کیا آپ کو اپنی سلامتی کی فکر نہیں ہے؟'' میں نے کہا کہ مجھے ایسی کوئی فکر لاحق نہیں اور وضاحت کی کہ میں تو صرف اسلام کے حوالے سے عوامی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ جب ہم رخصت ہوئے تو بیکر نے یہ کہتے ہوئے اندیشگی (Anxiety) کا اظہار کیا: ''اگر آپ میرا نام اپنی کتاب میں دیں تو مجھے برا نہیں لگے گا کیونکہ امریکہ میں لاتعداد رونالڈ بیکر موجود ہیں لیکن براہ مہربانی میرا پتہ شائع مت کیجئے گا۔ میں پھنسنا نہیں چاہتا۔''

اسلام دشمن یک رُخے تصور گھڑنے کی ایک مثال عالمگیر دہشت گردی پر محکمہ خارجہ

کی 1999ء کی رپورٹ کی صورت میں سامنے آئی۔ اس رپورٹ کے مرتبین کو...... جن کی سربراہ وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ تھیں...... سچ کو چھپانے کی تربیت مطلوب ہے۔

اس رپورٹ میں قطعیت کے ساتھ بیان کیا گیا تھا کہ ''امریکہ کے لیے دہشت گردی کے بنیادی خطرات'' ایشیا اور مشرق وسطیٰ سے ابھر رہے ہیں' جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن کسی اور جگہ پیش کی گئی اسی دستاویز میں دیئے گئے اعداد و شمار (Statistics) اور متن (Narrative) اس نتیجے کی تردید کرتے تھے۔ وہ ظاہر کرتے تھے کہ امریکہ مخالف دہشت گردی کا مشرق وسطیٰ یا ایشیا سے کہیں زیادہ فعال مرکز لاطینی امریکہ ہے۔ اس رپورٹ میں لاطینی امریکہ میں چھیانوے' مغربی یورپ میں تیس' یوریشیا میں نو اور افریقہ میں سولہ واقعات کا اندراج کیا گیا ہے۔ جبکہ ایشیا میں چھ اور مشرق وسطیٰ میں گیارہ واقعات رونما ہوئے۔ ان گیارہ میں سے کئی واقعات کی نوعیت مدافعتی تھی اور انہیں غلط انداز میں دہشت گردی کے طور پر پیش کیا گیا۔ 27

اسلام کے حوالے سے دہشت گردی والے یک رخے تصور کو بعض دوسرے عوامل نے بھی پختہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر امریکی ذرائع ابلاغ میں الفاظ اسلام اور مسلمان کو مشرق وسطیٰ میں ہونے والے اسرائیل مخالف تشدد کے ساتھ عمومی طور پر جوڑنے سے جھوٹے تصورات کو زندگی ملتی ہے۔ میرے کانگرس والے زمانے میں پی ایل او کو کیپٹل ہل پر دہشت گردی کے لیے مرموز لفظ (Code Word) کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ میرے بعض رفقاء تو اس لفظ کو ہینڈ گرینیڈ کی طرح برتتے تھے۔ لفظ دہشت گرد کو پی ایل او کے سابقے کے طور پر اس قدر تواتر کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا کہ کوئی اجنبی اس غلطی کا شکار ہو جاتا کہ ''دہشت گرد پی ایل او'' اس تنظیم کا اصل نام ہے۔ آج کل اسم صفت اسلامی (Islamic) کو اسی انداز سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان دنوں پی ایل او کو دہشت گردی کے مرموز لفظ (کوڈ ورڈ) کے طور پر شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی کسی حد تک وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس تنظیم اور مذاکرات کے ذریعے امن و انصاف کے لیے پی ایل او کے لیڈر یاسر عرفات کی کوششوں کی بہتر آگاہی حاصل ہو چکی ہے۔

دہشت گردی والا تصور پی ایل او سے ہٹ کر حزب اللہ اور حماس کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ امریکی ذرائع ابلاغ اور عمومی گفتگو میں لفظ اسلامی کو حزب اللہ اور حماس کے ساتھ اتنی کثرت سے جوڑا گیا ہے کہ بیشتر امریکیوں کی ان تنظیموں کے بارے میں رائے ہے کہ یہ

اسلام کے جھنڈے تلے ننگی دہشت گردی ہے۔ اسرائیل کے حمایتی حکومتی رہنماؤں کے تعصب کی وجہ سے دونوں گروپوں کو محکمہ خارجہ کی دہشت گرد تنظیموں والی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان تنظیموں کے صرف تذکرے ہی سے ایسے دہشت گردوں کا تصور ابھرتا ہے جو بے بس شہریوں پر خودکار (آٹومیٹک) بندوقوں سے فائرنگ کر رہے ہوں۔

یہ تصور مضبوط ہوا ہے دونوں گروپوں کے ساتھ اماموں کے تعلق سے نیز ان تنظیموں کے کچھ ارکان کی طرف سے اسلام کے نام پر شہریوں کے خلاف تشدد کی شعوری سے عاری کارروائیوں سے۔ فلسطینیوں کے لیے تو یہ تشدد اسرائیلی جبر واستبداد' ان کے وطن پر اس کے مسلسل قبضے اور ان کی جائیدادیں غصب کرنے کے خلاف غصے کا انتہائی اظہار ہے۔ بہت سے لوگ ان جنونیوں کو انصاف اور قومی آزادی کے لیے لڑنے والے افراد تصور کرتے ہیں ...... یا شہید ...... لیکن تشدد کو ان معنوں میں امریکہ میں شاذونادر ہی بیان کیا گیا ہے۔

بیشتر امریکیوں کو حیرت ہوگی کہ حزب اللہ ایک خوب منظم' محترم اور بڑی سیاسی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم لبنان پر اسرائیل کے خونیں اور تباہ کن حملے کے بعد مزاحمتی تحریک کے طور پر وجود میں آئی۔ مذکورہ جارحیت میں اسرائیل نے شہروں اور بستیوں پر بے رحمی کے ساتھ بمباری کی تھی اور لبنانی حکومت اور اقوام متحدہ جنوبی لبنان کو اسرائیلی فوجوں کے قبضے میں جانے سے روکنے میں ناکام ہوگئی تھیں۔

لبنانی پارلیمینٹ میں حزب اللہ کے پاس تقریباً بیس فیصد نشستیں ہیں اور وہ اپنے ارکان کو بھرپور طبی' معاشرتی اور تعلیمی خدمات فراہم کرتی ہے۔ اس کی مسلح اکائیاں (Units) جنوبی لبنان پر طویل عرصے سے قائم اسرائیلی قبضے کی مزاحمت کرتے ہوئے تشدد کی کارروائیاں کر چکی ہیں ...... جو کہ بعض اوقات شہریوں کے لیے ہلاکت انگیز ثابت ہوئی ہیں' تاہم اس کی عسکری مہمات لبنان کی سرحدوں کے اندر تک ہی محدود اور تقریباً مکمل طور پر مدافعانہ نوعیت کی رہی ہیں۔

ان حقائق کے باوجود اسرائیل اور حکومت میں اور حکومت سے باہر اس کے امریکی حامی حزب اللہ کو ایک دہشت گرد تنظیم قرار دے چکے ہیں۔ یہ الزام بنیادی طور پر اس وقت لگایا گیا تھا جب لبنان میں اسرائیلی مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے بیروت میں متعین دوسو چالیس امریکی میرینز 1983ء میں ایک ٹرک بم دھماکے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ کہا گیا۔ اس کی ذمہ دار یہ تنظیم ہے۔ 1999ء میں جنوبی لبنان سے تمام اسرائیلی افواج کی واپسی کے

باوجود حزب اللہ پر یہ الزام برقرار رہا۔ اس کی وجہ کسی حد تک یہ تھی کہ اس تنظیم کو امریکی محکمۂ خارجہ کی طرف سے بین الاقوامی دہشت گردی کی امداد کرنے والی ریاست قرار دیئے گئے ایران سے مدد حاصل ہوئی تھی۔

بہت سے فلسطینیوں کے علاوہ لبنانیوں' اردنیوں اور دوسرے عربوں کے نزدیک حزب اللہ ایسے جری و دلیر محب وطن افراد پر مشتمل ہے جو کہ اسرائیل کو لبنان کے کسی بھی حصے پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لیے بڑے سے بڑا ذاتی خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ عمان میں متعین امریکی امن فوج کا ایک رضا کار بیان کرتا ہے کہ ''میرے تقریباً سو فیصد اردنی دوست حزب اللہ اور حماس کے ارکان کو سورما (Heroes) تصور کرتے ہیں۔'' اپریل سوکت نے یروشلم اور مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وستم کا تذکرہ کرتے ہوئے پوچھتی ہیں ''جو کچھ کہ یہاں ہوتا رہا ہے اسے ذہن میں رکھتے ہوئے کیا آپ انہیں اس انداز سے محسوس کرنے پر کوئی الزام دے سکتے ہیں؟'' 28

حماس آج سے کوئی دس برس پہلے یاسر عرفات کی مخالفت میں مقبوضہ علاقوں کے اندر قائم ہوئی تھی۔ اس وقت عرفات کا مرکز (بیس) تیونس میں تھا۔ اپنی ابتدا ہی سے حماس نے ان تمام علاقوں پر اسرائیلی قبضے کے خلاف مہم چلائی جن پر اسرائیل نے جون 1967ء کی جنگ میں تسلط قائم کیا تھا۔ اوسلو معاہدے کے نام سے مشہور معاہدے پر 1993ء میں اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن کے ساتھ یاسر عرفات کے دستخط کرنے کے بعد پی ایل او کے رہنما نے اپنا ہیڈ کوارٹر غزہ منتقل کرلیا اور اسرائیلی فوجوں کی مرحلہ وار واپسی کے لیے مذاکرات شروع کیے۔ اوسلو معاہدے کے تحت یروشلم کا مستقبل' مقبوضہ علاقوں میں یہودی آبادیوں اور فلسطینی مہاجروں کی واپسی کے حق جیسے مسائل مذاکرات کے آخری مرحلے تک زیرغور نہیں آنے تھے۔ حماس نے ابتدا ہی میں معاہدے کی شرائط کو مسترد کردیا۔ اس نے اسرائیل سے کسی بھی قسم کی مصالحت سے انکار کردیا اور یاسر عرفات نے اسرائیل کو جو رعایتیں دی تھیں ان سے متفق نہیں ہوئی۔

گزشتہ برسوں میں یاسر عرفات کو حماس کا تعاون حاصل کرنے میں محض وقتی کامیابی ہوئی ہے۔ اسرائیلی قبضے کے خلاف اپنی جدوجہد کے دوران حماس کے ارکان نے اپنی مزاحمتی کارروائیاں (آپریشنز) فلسطین اور اسرائیل تک ہی محدود رکھے تاہم بعض اوقات شہری اہداف پر انتہا پسندانہ خودکش حملے کیے — ایسے جنونی اقدامات اسلام کی واضح خلاف ورزی ہیں۔

بیشتر امریکی اس امر سے آگاہ نہیں ہیں کہ حزب اللہ اور حماس دونوں تنظیموں کی عسکری شاخوں کے ساتھ ساتھ اہم معاشرتی اور تعلیمی شاخیں بھی ہیں۔ انہیں ہر گروپ کے اندر نکتۂ نظر کے اختلاف کا بھی علم نہیں ہے۔ دونوں تنظیموں میں ایسے افراد موجود ہیں جو مختلف آرا اور محرکات عمل کے حامل ہیں۔ ایک انتہا پر ایسے افراد ہیں جو کئی عشروں کے جبر و استبداد کی وجہ سے ناامیدی کا شکار ہیں اور اچھے مستقبل کی امیدوں سے تہی دامن ہیں۔ وہ مایوس و دل شکستہ ہلاکت پسند انقلابی بن چکے ہیں۔ جو انتقام کی تقریباً ہر شکل کی طرف مائل ہیں۔ دوسری انتہا پر ایسے افراد ہیں جو اسلامی تعلیمات سے مخلص رہتے ہوئے تشدد کی ہر شکل کے خلاف ہیں، سوائے اپنی حفاظت یا ناانصافی کو ختم کرنے کے لیے کیے جانے والے تشدد کے۔

اسلام کے حوالے سے جھوٹے تصورات کو زندہ رکھنے والا ایک اور عامل وہ جارحانہ لابنگ ہے جو واشنگٹن میں اسرائیل کے لیے امریکی امداد کے حصول کی خاطر کی جاتی ہے۔ لابی کرنے والے ہر سال واشنگٹن سے زبردست امداد حاصل کرنے کی بھرپور طور پر کامیاب کوششوں میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسرائیل کو ''مسلمان دہشت گرد'' گروپوں کی طرف سے اپنی سلامتی کو سنگین خطرات کا سامنا ہے۔ ان میں سے کچھ گروپ اپنی تنظیموں کے ناموں کے ساتھ اسلامی یا اسلام کے الفاظ شامل کر کے نادانستہ طور پر ان لابی کرنے والوں کی مہم کو تقویت دے دیتے ہیں۔

امریکی محکمۂ خارجہ کے ایک سابق افسر جین برڈ، جو واشنگٹن میں قائم کونسل برائے قومی مفاد کے سربراہ ہیں اور واشنگٹن میں پینسلوانیا سٹریٹ کے دونوں سروں پر مشرق وسطیٰ سے متعلقہ سرگرمیوں میں شامل رہتے ہیں، اسلام کے دہشت گردی والے تصور کو ''انتہائی حساس معاملہ'' قرار دیتے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

''اسے اکثر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ یہ حرکت پیدا کرتا ہے۔ یہ خوف کو ابھارتا اور جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ اسے لابی کرنے والوں نے گھڑا اور پھیلایا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ سال ہا سال سے اسرائیل کے لیے اربوں ڈالر کی غیر مشروط امداد حاصل کرنے کا باعث ہے۔ اس لابنگ میں مسلمانوں کی زیر سرپرستی ہونے والی دہشت گردی ایک مستقل مفروضہ ہے۔ اسے مسلمان فلسطینیوں کے ساتھ یہودی ریاست کے ظالمانہ برتاؤ اور مسلمان اکثریت والے لبنان پر وقفے وقفے سے کیے جانے والے فوجی حملوں کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دہشت گردی والا تصور اسرائیل پر شام، عراق اور ایران نیز دوسری اسلامی ریاستوں کی طرف سے امکانی

میزائل حملوں کے خلاف اس کی اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے امریکی اعلیٰ ٹیکنالوجی والے ہتھیار اور مالی امداد مستقل طور پر حاصل کرنے کی طلب کی بنیاد ہے۔''

برڈ لکھتے ہیں کہ یہ یک رُخا تصور ایسے حکومتی فیصلوں کا باعث بنتا ہے جو امریکی عوام کو مہنگے پڑتے ہیں۔ گزشتہ عشرے میں اسی تعصب کی بنا پر اسرائیل کے لیے سالانہ امریکی امداد اوسطاً 4.7 ارب ڈالر ہوگئی۔

ٹیکس دہندگان پر اس زبردست بوجھ کے علاوہ امریکہ کی اسرائیل کو غیر مشروط سیاسی' سفارتی اور عسکری امداد نے دیگر امریکی قومی مفادات کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس نے دنیا بھر کے دارالحکومتوں میں ایسے ردعملوں کو فروغ دیا ہے جو کراہت سے تضحیک تک محیط ہیں۔ برڈ لکھتا ہے: ''اس کی وجہ سے ہمارے سفارت کاروں کو اقوام متحدہ میں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں امریکی نمائندوں نے متعدد مرتبہ اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر مذمت کی قراردادوں کو ویٹو کیا ہے حالانکہ یہ مذمتی قراردادیں امریکی اصولوں سے ہم آہنگ تھیں اور دوسری حکومتوں نے ان کی قریب قریب متفقہ حمایت کی تھی۔''

اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں کے حقوق کی بے حرمتی کے باوجود تمام امریکی حکومتوں نے اُسے غیر مشروط امداد مہیا کر کے آفاقی انسانی حقوق کے چیمپئن کے طور پر امریکہ کی ساکھ کو داغ دار کر دیا ہے۔

برڈ ایک شاندار طنز کرتا ہے کہ ''اسرائیل مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی دہشت گردی سے خبردار کرتے ہوئے رد دہشت گردی (Counter-Terrorism) کے بھیس میں خود ریاستی دہشت گردی کا ارتکاب کرتا ہے۔'' سلامتی کے لیے خطرہ قرار دے کر گرفتار کیے گئے مسلمانوں' حتیٰ کہ امریکی شہریوں تک سے' اعتراف جرم کروانے کے لیے اسرائیلی حکومت انتہائی جسمانی اقدامات — صاف صاف لفظوں میں تشدد — کرنے کی سرکاری طور پر اجازت دیتی ہے۔[29]

امریکی ذرائع ابلاغ میں اسرائیل کے غلط رویے پر شاذونادر ہی توجہ دی جاتی ہے تاہم ایک اہم استثنا میں سی این این نے ستمبر 2000ء کی ایک شام اپنے پرائم ٹائم کے دوران ایک مسلمان امریکی شہری انور محمد کو اسرائیل میں گرفتار کرنے' حراست میں رکھنے اور تشدد کرنے کی خبر نشر کی' جو کہ 1998ء میں یروشلم میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے گئے تھے۔

اگر چہ انور محمد کے پاس درست امریکی پاسپورٹ موجود تھا تاہم انہیں بغیر کسی الزام کے گرفتار کرلیا گیا اور چالیس روز تک ایک سیلن زدہ قید خانے میں بند رکھا گیا۔ قید کے دوران انہیں گھنٹوں ایک کرسی پر تکلیف دہ حالت میں بٹھا کر باندھ دیا جاتا اور ان کے منہ پر بدبودار نقاب ڈال دیا جاتا تھا جبکہ انہیں سونے نہیں دیا جاتا تھا اور کبھی سخت گرمی اور کبھی سخت ٹھنڈک میں رکھا جاتا تھا۔

یہ سفاکانہ برتاؤ ان سے دہشت گردی میں ملوث ہونے کے اقرار پر مبنی ایک دستاویز پر دستخط کروانے کی ایک لایعنی کوشش تھی۔ اگر چہ امریکی قونصلیٹ انور محمد کے قید خانے سے نزدیک ہی واقع تھا لیکن امریکی اہل کاروں نے نہ تو ان کا دفاع کیا اور نہ ہی ان کی کوئی مدد کی سوائے اس کے کہ انہیں وکیلوں کی ایک فہرست تھمادی گئی جن کی خدمات وہ پیسے ادا کر کے حاصل کر سکتے تھے۔ آخرکار انہیں بغیر کسی الزام کے رہا کر دیا گیا لیکن انہیں اسرائیل سے روانہ ہونے سے پہلے فلسطینی پاسپورٹ خریدنے پر مجبور کیا گیا۔ تشدد کے اس واقعے کی تحقیق کرتے ہوئے سی این این کے انٹرویو کنندہ چارلس گلاس (Charles Glass) کو سابقہ اور موجودہ امریکی سفارت کاروں نے بتایا کہ جب اسرائیل میں امریکی شہریوں کے حقوق کی بے حرمتی کی جاتی ہے تو امریکی قونصلیٹ کے اہلکار محکمہ خارجہ کے روایتی طریقہ کار کے مطابق عمل نہیں کرتے ہیں۔ واشنگٹن دوسرے ملکوں سے جن انسانی ضابطوں پر عمل کرنے پر اصرار کرتا ہے' وہ افسران اسرائیلی حکومت کو انہی انسانی ضابطوں پر عمل کرنے کے لیے زور نہیں دیتے۔

گلاس نے انور محمد سے دریافت کیا کہ جب انہوں نے قید کے دوران اپنی کلائیوں میں پڑی ہتھکڑیوں پر ''ساختہ امریکہ'' (Made in U.S.A) لکھا ہوا دیکھا تو ان کے محسوسات کیا تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا ''مجھے یوں محسوس ہوا گویا مجھ سے دغابازی کی گئی ہو۔''

فلسطینیوں اور دیگر عربوں پر اسرائیل کے ریاستی جبر کے اختتام کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ نہ ہی کیپٹل ہل اور ہالی وڈ میں اسلامی دہشت گردی کے جھوٹے تصور میں اصلاح کا کوئی امکان ہے۔ زمین پر موجود اعلیٰ ترین دفتروں سے لے کر ایئر لائنز تک گفتگوؤں میں اسلام دشمن تعصب کا سیلاب سا آیا ہوا ہے۔

یہ ایک ایسا مظہر ہے جس کے لیے امریکی صحافیوں کی اسلام کے بارے میں عمومی

عدم آگہی کو وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خبر نگار دوسرے مذاہب' لوگوں' ثقافتوں اور سیاسی حالات کے حوالے سے غلط معلومات رکھتے ہیں لیکن امریکہ میں اسلام کے خلاف نفرت اور یک رُخے تصورات جس بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے ہیں وہ ناواقفیت کے باوجود اوروں کے حوالے سے موجود نہیں ہیں۔ مسلمان برادری کی حیات پر ان جھوٹے تصورات کا بہت وسیع اور گہرا اثر پڑا ہے۔ ان سے ہر جوان اور بوڑھے' امیر اور غریب' مرد اور عورت' پیشوں' تعلیم اور آمدنی کی ہر سطح سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دکھ اور اذیت ملی ہے۔

اکیسویں صدی سے کچھ دن پہلے لیلیٰ المریعتی نے امریکی مسلمانوں کو متاثر کرنے والی ''دل شکستگی کی لہر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے غمناک الفاظ میں کہا:

''الجیریائی انتہا پسندوں کی طرف سے نئی ہزاری کے آغاز پر دہشت گردی کی دھمکیاں' ایک ہوائی جہاز پراسرار انداز میں سمندر میں ڈوب جاتا ہے جبکہ آخری ریکارڈ ہونے والے الفاظ ایک معروف اسلامی مناجات کے ہوتے ہیں' ایک اور ہوائی جہاز کو کشمیری عسکریت پسندوں نے اغوا کر لیا' چیچنوں پر وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا حملہ۔ یہ فہرست کافی جانی پہچانی ہے۔ یقیناً مسلمان برادری کے لیے یہ حوصلہ شکنی اور دل شکستگی کا موسم ہے ایک ایسی برادری جو معصوم شہریوں کے خلاف تشدد آمیز کارروائیوں سے برابر کی خوفزدہ ہے اور اُسے اس قسم کے واقعات کے بعد رونما ہونے والے غیر عقلی ردعمل کا بھی خوف لاحق رہتا ہے۔''[30] محمد البندری واضح کرتے ہیں: ''امریکی مسلمان اپنے تمام ہم وطن امریکیوں ہی کی طرح دہشت گردی پر فکرمند اور پریشان ہیں۔''[31]

''کمرشل اپیل''، میمفس' ٹینی سی کے مذہبی لکھاری کی حیثیت میں عقل کی تنہا لیکن مضبوط آواز ڈیوڈ واٹرز (David Waters) اس مایوس کن منظر کے برعکس ایک سکون بخش خیال پیش کرتے ہیں: ''اس ملک میں جب ہم اسلام کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہم ذرائع ابلاغ کے پیش کیے گئے تشدد والے تصورات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ایک حالیہ سروے میں آدھے سے زیادہ لوگوں نے اسلام کے بارے میں اس غلط سوچ کا اظہار کیا کہ وہ دہشت گردی کی تائید کرتا ہے۔ عیسائیت کی روح ہے: امن' انصاف اور رحم۔ اسلام کی روح بھی یہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو کوئی دہشت گرد مسلمان ہوتا ہے' نہ عیسائی اور نہ ہی یہودی۔''[32]

حواشی

1. یو ایس اے ٹوڈے' 1999-8-16' صفحہ 1
2. راکی ماؤنٹین نیوز' 2000-5-12 (ڈینور)
3. سی اے آئی آر ای میل' 2000-6-22
4. شکاگو ٹریبیون' 2000-6-29' صفحات 1, 2
5. شکاگو ٹریبیون' 2000-6-30
6. سٹیٹ جرنل رجسٹر' 2000-9-29 (سپرنگ فیلڈ' آئی ایل)' صفحہ 10 اور شکاگو ٹریبیون 2000-10-1 صفحہ 5 پی' سیکشن 16
7. شکاگو ٹریبیون' 2000-7-17' صفحات 1' 12
8. شکاگو ٹریبیون' 2000-7-17' صفحہ 12
9. لاس اینجلس ہیرالڈ ایگزامنر' 1989-2-26' صفحہ جی۔ 1
10. لاس اینجلس ٹائمز' 2000-11-9
11. رالف بریبینٹی ''دی نیچر اینڈ سٹرکچر آف دی اسلامک ورلڈ'' صفحہ 7
12. وال سٹریٹ جرنل' 1984-10-4
13. ''اے ڈیول تھیوری آف اسلام'' دی نیشن میگزین 96-8
14. لاس اینجلس ہیرالڈ ایگزامنر' 1989-2-26' صفحہ جی-1
15. یو اے ایس آر پبلشنگ گروپ' 1999ء
16. دی جیوئش منتھلی' 95-3

17۔ سینیٹ جیوڈیشری کمیٹی رپورٹ' 27-4-1995

18۔ ڈبلیوایس جے 25-6-1993

19۔ سان ڈیاگو یونین ٹریبیون 8-6-1993

20۔ سی این این 20-4-1995

21۔ ''دی ایجنٹ'' از: احمد یوسف' صفحہ 56

22۔ نیویارک ٹائمز 24-11-1999

23۔ ہراساں کرنے (Harassment) پر سی اے آئی آر کی رپورٹ 1998ء۔

24۔ ایم ایس این بی سی ویب پیج' 30-12-1999

25۔ نیویارک ٹائمز' 24-11-1999

26۔ پیپل' 8-5-2000' صفحہ 28

27۔ ''پیٹرنز آف گلوبل ٹیررازم'' محکمہ خارجہ (1999ء)

28۔ ای۔میل' 8-11-2000

29۔ انٹرویو' 20-7-2000

30۔ ریلیجس نیوز سروس' 6-1-2000

31۔ ایم ایس این بی سی ویب پیج' 30-12-1999

32۔ میمفس کمرشل اپیل' 30-8-1996

❁ ❁ ❁ ❁

چوتھا باب

طالبان

ہوسکتا ہے اسلام کے بارے میں بہت کم علم رکھنے والے امریکی یہ غلط یقین رکھتے ہوں کہ طالبان حکومت، یعنی وہ حکومت جس نے بیشتر افغانستان پر قبضہ کررکھا تھا اور خود کو امارت اسلامی افغانستان کہلواتی تھی، مستقبل کی اسلامی حکومتوں کی ایک پیشگی مثال ہے۔

طالبان حکومت کو غلط طور پر اسلام کا ترجمان سمجھنے کی وجہ درج ذیل حقائق ہیں

اس کے سرکاری نام میں لفظ "اسلامی" شامل ہے، طالبان رہنماؤں سمیت تقریباً تمام افغانوں کا مذہبی تعلق اسلام سے ہے اور امریکی مسلمان قائدین لفظ اسلام کے غلط استعمال کے حوالے سے طالبان پر شاذ ونادر ہی عوامی سطح پر تنقید کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک انہوں نے گوتم بدھ کے مجسموں کو نہیں توڑا تھا ان پر عوامی سطح پر ہر اعتبار سے تنقید کبھی کبھار ہی ہوتی تھی اور جن لوگوں نے تبصرہ کیا تھا انہیں اہم ذرائع ابلاغ پر قبولیت نہیں ملی۔

ان عوامل کی وجہ سے یہ غلط تصور راسخ ہوگیا کہ مسلمان افغانستان کی طالبان حکومت جیسی حکومت دنیا میں ہر جگہ قائم دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ تصور خصوصاً ان امریکیوں کے لیے پریشان کن ہے جو اس بات پر متفکر ہیں کہ اگر امریکی مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا تو وہ امریکہ کو کس طرح تبدیل کریں گے۔

طالبان خود کو مسلمان تو کہلواتے ہیں لیکن انسانی حقوق کی پامالی خصوصاً عورتوں کے حقوق کی پامالی اور ہیروئن کی سمگلنگ روکنے میں ان کی ناکامی اسلامی تعلیمات کی شدید خلاف ورزی ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان نے 1999ء کی رپورٹ میں، جس پر کم توجہ دی گئی ہے، طالبان پر الزام لگایا کہ وہ "عورتوں اور بچوں کو فوری سزائیں دینے سمیت انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر اور منظم خلاف ورزی کررہے ہیں۔[1]

طالبان کے اپنی حکومت کو اسلامی قرار دینے سے امریکی مسلمانوں پر برا اثر پڑا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ حکومت خبری نشریوں (نیوز براڈ کاسٹس) اور اخبارات کی شہ سرخیوں میں رہتی ہے۔ طالبان کی حکومتی کارروائیوں کو غیر مسلم لوگ یہ سمجھے بغیر اسلام سے ملا رہے ہیں کہ غیر مذہبی عوامل مثلاً ثقافتی رسومات اور جنگلی علاقے کے حقائق ان پالیسیوں کی تشکیل پر کتنے اثر انداز ہوئے ہیں۔

طالبان امریکی مسلمانوں کی تنقیدی توجہ کے مستحق ہیں کیونکہ ان کی حکومت ویسی نہیں ہے جیسی وہ ظاہر کرتے ہیں۔ نہ تو انہوں نے حقیقی اسلامی ریاست قائم کی ہے اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان ملک نے' حالانکہ ان میں سے بہت ملک طالبان حکومت کی طرح اپنے سرکاری ناموں میں اسلام یا اسلامی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

پاکستان میں بی بی سی کے نمائندے رحیم اللہ یوسف زئی لکھتے ہیں: ''اس وقت کوئی ایک بھی حکومت یا ملک ایسا نہیں ہے جو کاملاً اسلامی ہو۔ طالبان' سعودی' ایرانی' سوڈانی' پاکستانی وغیرہ سب کے سب تجربہ کر رہے ہیں'' وہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ ''ایسا نہیں لگتا ہے کہ دنیا میں کسی بھی جگہ مسلمان طالبان حکومت کو عملی مثال کے طور پر لیں گے'' تاہم ان کی اس یقین دہانی سے امریکہ کے غیر مسلموں کا اضطراب کم نہیں ہوا۔ چند امریکی ہی بی بی سی کی نشریات باقاعدگی سے سنتے ہیں اور بہت سے امریکی پہلے ہی سے امریکہ کی مسلمان آبادی میں اضافے پر فکرمند ہیں۔

مجھے یقین ہے بیشتر امریکیوں کو عوامی اتفاق رائے یعنی شوریٰ کے ذریعے حکمرانی' جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور امریکی آئینی نظام کے درمیان مشابہت کا علم نہیں ہے۔ وہ اس امر سے آگاہ نہیں ہیں کہ دونوں نظام اپنی جمہوری ساختوں کے حوالے سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لاعلمی کے حامل غیر مسلم آسانی سے یہ غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ افغانستان کی طالبان حکومت حقیقتاً اسلامی ہے۔ ایک مسلمان ملک جمہوریہ یمن اہم حوالوں سے اس تصور کے قریب ترین آسکتا ہے کیونکہ وہ ایک ایسے جمہوری نام کی طرف مستقلاً پیش رفت کر رہا ہے جو کہ اسلام کے واضح طور پر بیان کردہ نصب العین یعنی لوگوں کی' لوگوں کے ذریعے اور لوگوں کے لیے متفقہ حکومت سے مشابہہ ہے۔

جمہوریہ یمن کے علاوہ باقی مسلمان ملکوں پر عمومی طور پر بادشاہ' جرنیل یا آمر حکومت کرتے ہیں۔ یمنی نظام غیر معمولی ہے کیونکہ صدر اور پارلیمینٹ دونوں براہ راست

منتخب ہوتے ہیں اور انہیں اس طرح تشکیل دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر چیک اینڈ بیلنس رکھتے ہیں۔ تاہم مشاورتی حکومت کی طرف ان پیش رفتوں پر یمن کی سرحدوں سے باہر زیادہ تر توجہ نہیں دی گئی۔ میں نے یمن کو اپنے پانچ دوروں میں جانا ہے' جن میں سے دو میں نے کانگرس کے رکن کی حیثیت میں کیے تھے۔

میں نے کبھی افغانستان کا دورہ نہیں کیا ہے' اس لیے میری معلومات دوسروں سے حاصل کردہ ہیں۔ میں نے طالبان کے بارے میں متوازن رائے قائم کرنے کی جستجو میں بہت سی کتابیں اور جائزے پڑھے' افغان پالیسی سے واقف کئی مسلمان مرد وخواتین کے ساتھ براہ راست اور مسلسل گفتگو کی نیز اپنے اسلام کے طویل سفر کے دوران مختلف مواقع پر ملنے والے افراد سے استفادہ کیا۔

میرے بنیادی ذرائع (Sources) پانچ آدمی ہیں۔ ان میں سے ایک ہیں اینڈریو پیٹرسن (Andrew Patterson) ' جنہوں نے حال ہی میں افغانستان کا ایک مطالعہ (سٹڈی) اور اس کی تاریخ لکھی ہے۔ ایک اور صاحب ہیں محمد بشر دوست ایم ڈی' جو افغان پناہ گزین ہیں اور میرے کانگرس کے آخری برسوں کے دوران ہمارے ہمسائے رہے۔ میں نے جنوری 2000ء میں انہیں بتایا کہ امریکی مسلمانوں کے حوالے سے میری آئندہ کتاب میں ایک باب افغانستان پر بھی ہوگا تو انہوں نے مجھے مراسلات اور دستاویزات بھیجنا شروع کر دیں۔ اگرچہ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ ان کا طالبان سے یا افغانستان کے اندر کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ ان کا ملک جس کڑی آزمائش سے گزرا ہے اور اب تعمیر نو کی جو کوششیں جاری ہیں مجھے ان کے بارے میں درست آگاہی مہیا کریں۔ یہاں تک کہ انہوں نے مجھے اپنے خرچ پر افغانستان کا دورہ کروانے کی پیشکش بھی کی تاکہ میں افغان صورتحال کے بارے میں براہ راست آگاہی حاصل کر سکوں لیکن میں نے وقت کی قلت کی وجہ سے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ میرا ایک اور ذریعہ ہیں لاہور' پاکستان کے سعید احمد بٹ' جو محکمہ خارجہ کے ریٹائرڈ افسر ہیں۔ ان سے میری شناسائی اس وقت ہوئی جب انہوں نے میری کتاب "They Dare To Speak Out" کا پاکستان کی قومی زبان اردو میں ترجمہ کروانے اور اسے شائع کرنے کی اجازت طلب کی تھی' جو بخوشی دے دی گئی۔ بعد میں ہونے والی خط وکتابت سے مجھے پتہ چلا کہ وہ افغان معاملات اور رجحانات کے ایک مستند تجزیہ کار ہیں۔ انہوں نے افغانستان پر دو مزید اہم پاکستانی ذرائع سے میرا رابطہ کروایا۔

ایک تو ہیں بی بی سی کے رحیم اللہ یوسف زئی اور دوسرے ہیں ایک مصنف اور پاکستانی بحریہ کے ریٹائرڈ کموڈور طارق مجید۔

ان ذرائع کے ساتھ خط و کتابت اور اپنی ذاتی تحقیق سے میں قائل ہو گیا کہ طالبان حکومت اپنے متعدد تعمیری کارناموں کے باوجود کچھ خاص حوالوں سے غیر اسلامی ہے۔

حالانکہ اسلام منشیات کی بھرپور مذمت کرتا ہے لیکن طالبان اور افغانستان کی معیشت کا بہت زیادہ انحصار ملک میں ہیروئن اور افیم کی پیداوار نیز ان کی بیرون ملک فروخت پر ہے۔ ملک کی برآمدات سے ہونے والی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ منشیات ہیں۔

یہ حکومت ہیروئن کے مقامی استعمال سے تو روکتی ہے لیکن برآمد کرنے کے لیے اس کی تیاری روکنے کی خاطر سطحی اقدامات ہی کرتی ہے۔ افغانی ہیروئن کا اعلیٰ معیار طویل مدت سے ایک روایت کا درجہ پا چکا ہے اور پیداوار بڑھ رہی ہے۔ 1997ء میں' جبکہ ملک کے بیشتر حصے پر طالبان کا قبضہ تھا' پوست کی پیداوار گزشتہ برس کے مقابلے میں 25 فیصد بڑھ گئی۔

طالبان کہتے ہیں کہ پوست کی پیداوار غریب کاشت کاروں کی بقا کے لیے لازمی ہے اور اپنے فیصلے کے مطابق انہوں نے منشیات کی تجارت کو روکنے کے لیے اپنی خوفناک پولیس کو استعمال نہیں کیا۔ پیٹر مارسڈن اپنی کتاب ''دی طالبان'' (The Taliban) میں سرکاری دعوے پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''(طالبان کے) تازہ ترین بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ افغانستان میں کسانوں کے پاس غربت کی وجہ سے پوست کاشت کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' تاہم وہ مزید لکھتے ہیں کہ حقیقت میں غریبوں کو صرف اس وقت فائدہ ہوتا ہے جب بڑے زمینداروں کو کاشت کاری کے لیے موسمی مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے یا جب وہ منڈی کی غیر متوقع طلب کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے درجے کے کاشتکاروں کو اپنی پیداوار بڑھانے کا کہتے ہیں۔ 3 دولت مند افغان پوست کی بیشتر پیداوار اور ضمنی پیداواروں کی تیاری اور غیر ممالک میں ان کی فراہمی پر کنٹرول رکھتے ہیں۔

اسلام کی ایک اور خلاف ورزی یعنی عورتوں سے امتیاز طویل مدت سے جاری چلا آرہا ہے۔ پیٹرسن لکھتے ہیں کہ 1999ء کے شروع میں طالبان نے کابل اور اپنے زیر تسلط دیگر علاقوں میں درج ذیل ضابطے نافذ کرنا شروع کر دیے:

- عورتیں کسی مرد کے بغیر گھروں سے باہر نہیں آسکتیں خواہ ہنگامی حالت کے تحت ڈاکٹر کے ہاں یا ہسپتال ہی کیوں نہ جانا ہو۔

- خاتون ڈاکٹروں کی شدید کمی کے باوجود شاذ حالات ہی میں کوئی مرد ڈاکٹر کسی عورت کا علاج کرسکتا ہے۔
- عورتیں گھروں سے باہر ملازمت نہیں کرسکتیں سوائے طالبان کی طرف سے مخصوص کی گئیں ملازمتوں کے۔
- گھر کے باہر عورتوں کو چہرہ ڈھانپنا ہوگا۔
- حکومتی سکول صرف لڑکوں کے لیے ہیں۔ لڑکیوں کے سکول صرف منصوبہ بندی کے مرحلے میں وجود رکھتے ہیں۔
- تمام مرد ڈاڑھی رکھیں اور پانچوں وقت مسجد میں نماز ادا کریں۔
- ٹیلی ویژن رکھنا غیر قانونی ہے۔

پیٹرسن کہتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک ضابطہ بھی اسلام کا تقاضا نہیں ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ضوابط قرآن میں بیان کیے گئے انسانی حقوق کے اصولوں کی خلاف ورزی ہیں۔ یہ خلاف ورزیاں افغانستان میں طالبان کے اقتدار میں آنے سے بہت عرصے پہلے پروان چڑھنے والی غیر مذہبی روایات کو مروج کرنے کے ان کے عزم سے رونما ہوئی ہیں۔

ان روایات میں سے اولین روایت ہے: حکومت' تعلیم اور نجی روزگار پر مردانہ غلبہ۔ جہاں منشیات کی تجارت یا اس حکومت کے عورتوں پر عائد کردہ سخت ضابطوں کے حوالے سے طالبان کے رد یے کا کوئی جواز ممکن نہیں ہوسکتا' وہاں اس بات پر بھی توجہ دی جانی چاہیے کہ طالبان ایک ایسے ملک کے بیشتر حصے پر قابض ہیں کہ درشتی (Harshness) جس کی دور حاضر کی ہی معیشت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اس کی زیادہ تر تاریخ اور جغرافیہ کی بھی خصوصیت ہے۔ پیٹرسن لکھتے ہیں کہ افغانستان جغرافیائی حوالے سے دنیا کے بہت دور' الگ تھلگ واقع پہاڑی ملکوں میں سے ایک ملک ہے:

"اس کے لوگ ماضی میں دشوار حالات سے گزر چکے ہیں۔ وہ مشکل حالات زیست میں زندگی کی جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ انہیں وقتاً فوقتاً بلاوجہ قتل و غارت کا سامنا رہا ہے اور جب سیاسی منظرنامہ تبدیل ہوتا تو لگاتار عسکری مہمات میں الجھنا پڑتا تھا۔ تیرہویں صدی میں چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان ایک لشکر لے کر حملہ آور ہوا اور اُس نے بیشتر علاقے کو ویران و بے آباد کردیا۔ اُس نے اس ملک میں بسنے والے سینکڑوں ہزاروں افراد کو تہ تیغ کردیا اور شہر کے شہر تاخت و تاراج کردیے نیز آب پاشی کے نظام کو تہس نہس کردیا۔

''خشکی میں گھرا ہوا افغانستان' جس کے ہمسائے مختلف ثقافتوں اور مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں' مسلسل متشدد حملہ آور فوجوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ یہ برسوں تک ایرانیوں اور بعدازاں برطانویوں کے حملوں کا نشانہ بنا رہا۔ 1970ء کی دہائی کے دوران سوویت اثر ونفوذ میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ طالبان کی تعداد زیادہ سے زیادہ شاید 20,000 ہے۔ یہ سب سخت جان اور حکومتی عقیدے کے لیے وقف نوجوان ہیں' جن میں سے اکثر نے بیشتر افغانستان پر سوویت افواج کے قبضے کے دوران اپنا لڑکپن پناہ گزیں کی حیثیت سے شمالی پاکستان میں گزارا ہے۔ انہوں نے پشاور کے اُن مدرسوں میں تعلیم حاصل کی ہوئی ہے جو پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے برطانویوں نے قائم کیے تھے۔ ان مدارس میں تدریس کے ابتدائی چھ برس بنیادی تعلیم کے لیے وقف ہوتے تھے اور ان کے بعد دو برس تربیت دی جاتی تھی جس میں وہ نظریاتی تربیت بھی شامل تھی جو انہیں دوسرے مذاہب یا قوموں کے لوگوں کے حوالے سے غیر رواداربنا دیتی تھی جو کہ اسلامی معیارات سے ایک درشت علیحدگی تھی۔ آخری دو برس عسکری تربیت کے لیے مختص ہوتے تھے۔''

پیٹرسن اس دور کے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' والے تعلیمی نظریے کی خاکہ کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان مدرسوں کے ذریعے برطانویوں کی نیت بین المذاہب دشمنیوں کوفروغ دینے کی تھی۔ ان کا مقصد ایک ایسا فساد کھڑا کرنا تھا جس سے مجموعی طور پر ان کے ہندوستان پر قبضے کا جواز مہیا ہوجائے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں آج کا پاکستان بھی شامل تھا۔ برطانویوں کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین بے اعتمادی اور دشمنی پیدا کرنا تھا۔ برطانویوں نے مستقبل کے پاکستان میں ایسے سکول قائم کیے جہاں مسلمان طلباء کو ہندوؤں کے حوالے سے عدم رواداری پر مبنی ذہنی تربیت دینا مقصود تھی اور دوسرے علاقوں میں انہوں نے ایسے سکول کھولے جہاں ہندو طالب علموں کے ذہنوں میں مسلمانوں کے حوالے سے بے اعتمادی بٹھانا تھی۔''

پیٹرسن ایک تبدیلی کی نشاندہی کرتے ہیں جو اس وقت وقوع پذیر ہوئی جب افغانستان پر سوویت حملہ ہوا اور اس ملک کے نوجوان پناہ گزین پشاور کے مدرسوں میں غالب تعداد میں داخل ہوگئے:

''ذہنی صفائی (برین واشنگ) کے ایجنڈے سے ہندو دشمن نظریہ ہٹا دیا گیا۔ اس

کی بجائے ایسی تعلیم دی جانے لگی جو سوویت حملہ آوروں اور ان کے افغان حلیفوں کے خلاف معاندت پیدا کرتی تھی۔" 4

یہ تبدیلی بروقت تھی۔ سوویت افواج نے دیہاتوں سمیت پورے افغانستان میں مسلمان رہنماؤں اور اسلامی اداروں پر خاص طور پر سفاکانہ حملے کیے تھے۔ مغرب کو شدید خوں ریزی اور املاک کی بربادی کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ اس کی کسی حد تک وجہ یہ تھی کہ سی آئی اے نے اہم ذرائع ابلاغ کو موقع پر جا کر خبریں حاصل کرنے سے روک دیا تھا۔

افغانستان میں ہونے والا انسانوں کا قتل عام 1990ء کی دہائی کے اوائل اور اواخر میں سرب افواج کے ہاتھوں سربیا اور کوسوو کے مسلمانوں کے بہت معروف ہونے والے قتل عام کی نسبت بہت ہی بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔

صحافی بروس رچرڈسن (Bruce Richardson) کا اندازہ ہے کہ ملک پر سوویت قبضے والے عشرے کے دوران بیس لاکھ افغانوں کو قتل کیا گیا جن میں سے زیادہ تر لوگ دیہاتی علاقوں کے عام شہری تھے۔ بارودی سرنگوں کی وجہ سے تقریباً ساڑھے سات لاکھ عام شہری اپنے اعضاء گنوا بیٹھے۔ گیارہ ہزار بستیوں سمیت تقریباً دس لاکھ گھروں کو مسمار کر دیا گیا جن میں اتنی ہی تعداد میں مساجد اور پرائمری سکول شامل ہیں۔ ایک لاکھ ستر ہزار سے زیادہ گھوڑے ایک کروڑ پچاس لاکھ بھیڑیں اور بکریاں اور تقریباً بیس لاکھ دیگر مویشی ہلاک ہو گئے۔

کسی بستی اور اس میں رہنے والے لوگوں کو خاص طور پر دو طریقوں سے تباہ و برباد کیا جاتا تھا۔ پہلے طریقے کے تحت سوویت افواج پہلے تو ہوائی جہازوں سے زبردست بمباری کرتی تھیں پھر سوویت گن شپ ہیلی کاپٹر ملبے سے فرار ہونے کی کوشش کرنے والوں کو ہلاک کرنے کے لیے اس مقام کے اوپر پرواز کرتے تھے۔ دوسرے طریقے کے تحت سوویت توپ خانے اور راکٹ لانچر کے ذریعے تمام تعمیرات کو تباہ کر دیا جاتا تھا۔ پھر سوویت فوجی جمہوریہ افغانستان یعنی سوویت کنٹرول والی حکومت کے فوجیوں کے ساتھ تباہ شدہ بستی پر چڑھ دوڑتے اور زندہ بچ جانے والے ہر فرد کو ہلاک کر دیتے۔ اس کے بعد وہ کنوؤں میں زہر ملا دیتے، لاشوں کے ساتھ چھپا کر بم باندھ دیتے اور اجناس کی ذخیرہ گاہوں کے نزدیک بارودی سرنگیں نصب کر دیتے تھے تاکہ لاشوں کو دفنانے یا بچے کھچے غلے کو حاصل کرنے کی کوشش کرنے والے افراد ہلاک ہو جائیں۔ 5

سعید احمد بٹ کو یقین ہے کہ افغان مزاحمت میں مذہب نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

''امریکی اپنی حکومت کی فراہم کردہ عسکری امداد کی بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اڑھائی برس تک امریکہ نے کوئی اسلحہ فراہم نہیں کیا تھا اور یہاں تک کہ ایسا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا کہ آخر کار وہ مدد کریں گے۔''

افغان خدا پر اپنے بلند تر ایمان اور بھروسے کے بل پر کابل میں محفوظ کمیونسٹ حکومت کی فوجوں کے ساتھ ساتھ سوویت ٹینکوں، گن شپ ہیلی کاپٹروں، بھاری توپوں اور لاکھوں بارودی سرنگوں سے ٹکرا گئے۔

''ان کے جذبے کو سمجھنا مغربی صحافیوں کے لیے ناممکن ہے۔ وہ ایسا کس طرح کر سکتے ہیں؟ اگر افغانی لوگ ان معاشرتی اقدار اور اجتماعی رویے کے حامل ہوتے جنہیں مغربی مبصر نارمل تصور کرتے ہیں تو وہ دس برس تک زبردست سوویت یلغار کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر پاتے اور آخر کار سوویت افواج کو پسپا نہ کر سکتے۔ اس ہولناک آزمائش کے دوران کوئی شے تو انہیں استقامت اور قوت عطا کرتی رہی ہے۔ 6''

تقریباً تین سال تک خاموش تماشائی بنے رہنے کے بعد امریکی حکومت نے سوویت غلبے کے خلاف لڑنے کے لیے پیسہ، اسلحہ اور تربیت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اسامہ بن لادن کو ایک تعمیراتی انجینئر اور جنگجو کی حیثیت سے اہم کردار سونپا گیا۔ جب سوویت افواج کو افغانستان سے نکال دیا گیا تو اسامہ بن لادن اپنے بھاری آلات اور عملے کو لے کر سوڈان چلا گیا جہاں اُس نے آٹھ سو میل لمبی خرطوم، عتبرہ، سوڈان بندرگاہ ہائی وے تعمیر کر کے اہمیت حاصل کر لی۔

بعد ازاں سوڈان سے چلے جانے کے بعد، اُس نے اسرائیل اور اس کے قریبی اتحادی امریکہ کے خلاف سیاسی جنگ شروع کر دی۔ اُس نے فلسطینیوں پر ظلم و ستم روا رکھنے پر اسرائیل کو ہدف تنقید بنایا اور اس ناانصافی میں امریکی حکومت کی ساز باز پر نکتہ چینی کی۔ اُس نے خلیج فارس کے علاقے میں امریکی اور —— ماضی میں اس علاقے کی استعماری طاقت —— برطانوی افواج کی موجودگی کی مخالفت کی، خصوصاً سعودی عرب میں موجود افواج کی مخالفت کی جہاں مکہ اور مدینہ میں اسلام کے مقدس ترین مقامات واقع ہیں۔

اس کے جواب میں واشنگٹن کے افسروں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ دنیا بھر میں دہشت گردی کرنے والوں کو افغانستان میں موجود کیمپوں میں تربیت دے رہا ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان تربیت یافتہ دہشت گردوں میں سے کچھ لوگ اور خود اسامہ بن لادن

1998ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں ہونے والے بم دھماکوں میں ملوث ہیں۔

سوویت حملہ آوروں کو نکالنے میں ٹھوس امداد کرنے پر طالبان نے اسامہ بن لادن کو پناہ دے دی۔ چنانچہ وہ افغانستان میں ایک ہیرو بنا رہا۔ رحیم اللہ یوسف زئی کا کہنا ہے کہ ''اسامہ بن لادن کو امریکہ نے اسلامی دنیا کا ہیرو بنایا ہے۔ جب بھی امریکہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کا قد کاٹھ بڑھ جاتا ہے۔'' 7

بظاہر تو اُسامہ بن لادن نے سوویت حملہ آوروں کے نکل جانے کے بعد بحرانی عرصے کے دوران کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ جس ملک کو اسامہ بن لادن نے محفوظ رکھنے میں مدد دی تھی وہ انتشار کا شکار ہو گیا۔ آزادی کے لیے لڑنے والے مسلمانوں کے گروہ' جنہوں نے سوویت حملہ آوروں کو کامیابی کے ساتھ نکال باہر کیا تھا' آزاد جنگی سردار (وار لارڈز) بن گئے اور اقتدار کے لیے آپس میں لڑنے لگے۔

امریکہ اور پاکستان کی حمایت وتائید کے ساتھ ان میں سے پانچ گروہوں کا ایک اتحاد قائم ہوا لیکن جلد ہی ٹوٹ گیا۔ اس زمانے میں افغانستان کا دورہ کرتے ہوئے مصنف بروس رچرڈسن نے ''ناقابل یقین بدعنوانی'' کا مشاہدہ کیا۔

اُس بحرانی زمانے میں امریکہ' پاکستان اور سعودی عرب نے طالبان کی حمایت کی اور انہیں شہری علاقوں نیز بہت سے دیہاتوں پر قبضہ کرنے میں مدد دی۔ اقتدار میں آنے کے بعد طالبان نے لوگوں کے ذاتی ملکیتی آتشیں اسلحہ کو ضبط کر لیا اور سخت نظم وضبط قائم کیا۔

مغربی صحافی نتائج سے عدم اتفاق کرتے ہیں۔ رچرڈسن نے ملک کے طول وعرض میں دورہ کرنے کے بعد لکھا: ''شہروں اور دیہاتی علاقوں میں بدعنوانی اور جسمانی جرائم نہیں ہوتے ہیں۔ عورتوں سمیت آبادی کے ساتھ برا برتاؤ نہیں ہوتا۔ 8 اس کے برعکس طالبان حکومت کے ابتدائی مہینوں میں دورہ کرنے والے ایک برطانوی صحافی پیٹر مارسڈن نے نئی حکومت کے طرز عمل کے حوالے سے افغانوں میں اختلافِ رائے پایا۔ ''وہ (یعنی طالبان) ملک کے بیشتر حصوں میں بڑی تعداد میں ایسے نوجوانوں کی صورت میں مقدس جنگجوؤں کی حیثیت سے نمودار ہوئے جو اپنے مقصد کے لیے شہید ہو جانے پر راضی تھے۔ مارسڈن نے لکھا کہ افغانوں نے ''مسلسل جنگ سے اکتاہٹ اور متحد ہونے اور مستحکم حکومت قائم کرنے میں ناکام ہو جانے والے مزاحمتی رہنماؤں سے مایوسی'' کی وجہ سے ''کافی ہمدردی اور افہام وتفہیم''

کا اظہار کیا۔ 9

واشنگٹن پوسٹ کی ایک نامہ نگار پامیلا کانسٹیبل نے حال ہی میں افغانستان کا دورہ کیا اور دیکھا کہ طالبان ''مثبت تبدیلیاں'' لا چکے ہیں۔ ''فساد و شورش کے زمانے کے بعد اب اس علاقے میں تحفظ کا احساس موجود ہے' جس کی تقدیر کا انحصار کبھی جنگجو سرداروں کی مہربانی' قوت اور بدلتے ہوئے اتحادوں پر تھا...... '' 10

پیٹرسن نے لکھا کہ طالبان کے لیے افغانوں کا جوش اور ولولہ قلیل مدتی تھا۔ ''پہلے تو جنگ سے تھکے ہوئے افغانوں نے طالبان کو خوش آمدید کہا مگر پشاور میں ان کی ترمیت کی عکاس سخت اور غیر روادارانہ پابندیوں کے نفاذ سے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ طالبان نے قرآن میں بیان کیے گئے جمہوری اصولوں کی بجائے سخت گیر شخصی حکومت قائم کی۔ انہوں نے عورتوں کے وہ حقوق بھی سلب کر لیے جن کی ضمانت اسلامی قانون دیتا ہے۔''

امریکہ کے اہم ذرائع ابلاغ نے طالبان پر مسلمانوں کی تنقید کو بہت کم توجہ دی ہے۔ تاہم مطبوعہ یا نشر کردہ احتجاج کی کمی امریکی مسلمانوں کی طرف سے قبولیت یا عدم دلچسپی کی علامت نہیں ہے۔ بعض رہنماؤں نے طالبان کے استبدادی قوانین' انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور اپنی حکومت کو حقیقی اسلامی حکومت قرار دینے کی مذمت کی ہے۔

مذہبی نیوز سروس کی طرف سے دسمبر 1998ء میں تقسیم کیے گئے ایک بیان میں لیلیٰ المرعیٰ نے ''عورتوں کی ضرورتوں کی قیمت پر صنفی امتیاز برتنے'' پر طالبان کی مذمت کی نیز خاتون ڈاکٹروں کی کمیابی کے باوجود افغان عورتوں کے مرد ڈاکٹروں سے علاج کروانے پر پابندی لگانے کی بھی مذمت کی۔ انہوں نے طالبان پر الزام لگایا کہ وہ عورتوں کو ملازمتوں سے نکال کر ''قرآن سے انحراف کر رہے ہیں۔''

انہوں نے تحریر کیا: ''کوئی حکومت جو شریعت کے نفاذ کا اعتراف کرتی ہو اسے اس امر سے ضرور آگاہ ہونا چاہیے کہ شریعت کا بنیادی مقصد ہر شہری کے لیے انسانی مساعی کے ہر پہلو پر محیط پانچ حقوق کی ضمانت دینا ہے۔ وہ حقوق ہیں زندگی' شعور' خاندان' جائیداد اور مذہب کے حقوق...... افغانی عورتوں کو ان حقوق سے محروم کر کے طالبان قیادت اسلام سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتی ہے...... طالبان کی استبدادی پالیسیاں اس وقت تک برقرار رہیں گی جب تک وہ اور ان کے ہم خیال دوسرے لوگ قرآن میں بیان کی گئی مساوات کی روح سے واقف نہیں ہو جاتے۔''

الرمیتی نے طالبان کی پالیسیوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ ''اسلام کے بنیادی شعائر کی خلاف ورزی ہے...... طالبان اسلام کے نام پر تمام افغانوں خصوصاً عورتوں پر سخت قوانین کو نافذ کر چکے ہیں۔'' طالبان کی طرف سے جائز کارروائی کے بغیر جسمانی سزائیں دینے کی مذمت کرتے ہوئے وہ افغان رہنماؤں اور دیگر مسلمانوں قائدین کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ ایک دھندلے عدسے کے ذریعے دیکھنے کی بجائے' جو کہ مذہبی نہیں بلکہ سیکولر ہے'' خود اسلام پر غور کریں۔''

حسن حتوط ایم۔ ڈی' جو جنوبی کیلیفورنیا کے اسلامی مرکز کے ایک قائد ہیں۔ طالبان کے خود ساختہ اسلامی تشخص کو چیلنج کرتے ہیں: ''واضح بات ہے کہ طالبان کی عسکری نبرد آزمائی ان کے اسلام کے بارے میں علم سے بہت متجاوز ہے۔ جب وہ روسیوں سے لڑتے تھے تو انہوں نے ہمارے دل جیت لیے تھے اور ہم نے ان سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ جب فتح پانے کے بعد وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے تو ہمارے سب خواب بکھر گئے۔ اب طالبان تو فتح مند ہو گئے ہیں مگر اسلام یقینی طور پر فتح مند نہیں ہوا۔ اسلام تو ان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی عداوتیں ختم کر دیں اور اپنے وطن کی تعمیر نو کریں اور اسے نفرتوں اور تعصبات سے پاک کریں۔''

حسن جن کی تازہ ترین کتاب ''مسلم ذہن کا مطالعہ'' ہے' لکھتے ہیں: ''عورتوں پر جبر قرآن کی تعلیمات' اسوۂ رسولؐ اور اسلام کے اولین مسلمہ عمل کی صریحاً خلاف ورزی ہے ...... اب ہم (افغانستان میں) ملاؤں کے ڈنڈوں اور عباؤں سے بچیوں کی زبان بندی کا مشاہدہ کر رہے ہیں...... ہم محسوس کرتے ہیں کہ مذہب اور اس کی ساکھ کا دفاع ہمارا فرض ہے' جسے مغربی ذرائع ابلاغ نے اکثر داغدار کیا ہے لیکن شرمناک بات ہے کہ اس معاملے میں خود بے ہدایت مسلمانوں نے دھبہ لگا دیا ہے...... اسلامی دنیا میں کچھ مقامات پر عورتوں (اور مردوں) کے بنیادی اسلامی حقوق کو سلب کیا گیا ہے لیکن اکیسویں صدی کی دہلیز پر طالبان کے حالیہ فرمانوں کا تو کوئی موازنہ ہی نہیں ہے۔''

حسن یہ سخت تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''سوویت جارحیت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دینے والے دس لاکھ افغانیوں کو اب ذلیل کر دیا گیا۔ ان کی قربانی کی داستان محدود ہو رہی ہے اور اس کی جگہ بھائیوں کی آپسی جنگ کے فائر اور مذہبی پولیس کی طرف سے تذلیل کے شور نے لے لی ہے۔''[11]

شکاگو کے اسلامی اطلاعاتی مرکز برائے امریکہ کے سربراہ امام موسیٰ قطب نے ایک وعظ میں طالبان کے حوالے سے کہا کہ ''وہ اسلام کے مرکزی دھارے سے انحراف کر رہے ہیں۔''[12]

طالبان کے اقدامات نے مغرب میں مزید احتجاج کو پیدا کیا ہے۔ ایک خبر آئی کہ طالبان نے فرمان جاری کیا ہے کہ تمام مرد ڈاڑھیاں رکھیں ـــــ اس خبر سے ڈاکٹر بشر دوست نے اختلاف کیا اور مسلمان برادری کے لیے شائع ہونے والے ایک ماہنانہ رسالے ''المینار'' کے مدیر ڈاکٹر اسلم عبداللہ نے تو طیش میں آ کر احتجاجاً اپنی ڈاڑھی کٹوا دی۔ چند ہفتوں کے بعد عبداللہ نے اس وقت اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی جب کوسوو میں مسلمانوں پر بدترین ظلم و ستم کیا گیا۔ انہوں نے کوسود کے مسلمانوں سے ہمدردی کے اظہار میں دوبارہ ڈاڑھی رکھ لی۔

پیٹرسن طالبان کی کارروائیوں کو اپنے اسلامی عقیدے کے لیے ایک شرمندگی تصور کرتے ہیں۔ ''میں طالبان کی اسلام کی تعبیر سے اس قدر پریشان ہوں کہ میں نے اپنی ایک کتاب کا اختتام ایک پرانی فلم کے اس جملے پر کیا: ''خدا خیر کو استعمال کرتا ہے جبکہ شر خدا کو۔''

وسیع پیمانے پر شائع ہونے والے کالم ''ڈیئر ایبی'' (Dear Abby) کی مصنفہ ابیگائل وان بیورن کی مدد سے ''فیمینسٹ میجارٹی'' (Feminist Majority) کی طرف سے کیے گئے احتجاج کو بہت زیادہ توجہ حاصل ہوئی ہے۔ 26 ر فروری 1999ء کے کالم میں عورتوں پر طالبان کے جبر و استبداد کے حوالے سے لکھے گئے خط کے جواب میں 45000 خطوط آئے۔ این بی سی کے ''ٹونائٹ شو'' کے میزبان جے لینو کی بیوی میوس نکلسن لینو نے ''افغانستان میں صنفی نسل کشی'' کے خلاف مہم میں 100000 ڈالر کا عطیہ دیا۔

12 ر جولائی 1999ء کے ''ڈیئر ایبی'' کالم میں لینو نے نتائج کی خبر دی جو ٹیلی فون کالوں کی بوچھاڑ سے تجاویز کر گئے ان میں شامل تھا: صدر کلنٹن کی طرف سے ایک خط' کیپٹل ہل پر دونوں جماعتوں کی طرف سے تائید اور اقوام متحدہ کے افسروں سے ملاقاتیں۔ کالم میں انہوں نے کابل کی ایک عورت کے خط کا اقتباس شائع کیا: ''میں اپنی ممنونیت کے اظہار کے لیے آپ کو پھولوں سے ڈھانپ دینا چاہتی ہوں لیکن میں اس زنداں سے آپ کو صرف چند اشکوں کا تحفہ ہی ارسال کر سکتی ہوں۔'' 10 ستمبر 1999ء کو اس کالم میں نیوجرسی کے کسی مسلمان کا بغیر دستخطوں والا خط شائع کیا گیا: ''افغانستان یا کسی بھی دوسرے اسلامی ملک میں عورتوں پر روا رکھے جانے والے جبر کو اسلامی تعلیمات سے غلط منسوب کیا جاتا ہے۔ حقیقت تو

یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جو آزادی دلانے والے اقدامات کیے ان کی وجہ سے ساتویں صدی کے عرب میں عورتوں کو ایک باعزت اور آبرومندانہ مقام حاصل ہوا۔ مثال کے طور پر اسلام کے ابتدائی زمانے میں لڑی جانے والی جنگوں میں عورتوں نے میدان جنگ میں خدمات انجام دیتے ہوئے زخمیوں کا علاج اور تیمارداری کی' نہ تو انہیں گھروں میں بند کیا گیا اور نہ ہی ان سے حذر کیا گیا۔''

افغان منظر کے قریبی مشاہدین و مبصرین اس سے مختلف تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ کموڈور طارق مجید لکھتے ہیں: ''عورتوں کو خصوصی تحفظ اور احترام دینا' ان کی ہمراہی کرنا خصوصاً جب وہ رات کے وقت گھر سے باہر جائیں' خاتون ڈاکٹروں سے علاج کرانے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنا' تعلیمی اداروں میں مردوں سے الگ رکھنا۔۔۔ یہ سب مسلمان معاشرے کے اصول ہیں اور پہلی عالمی جنگ سے پہلے امریکہ سمیت تمام مغربی ملکوں میں بھی ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زمانے میں مغربی ملکوں کا معاشرہ غیر مہذب یا غیر ترقی پسند تھا؟''

طارق مجید کہتے ہیں کہ ماضی میں ''جغرافیائی' تاریخی' تعلیمی اور قبائلی عوامل کی وجہ سے کچھ مسلمان ریاستوں میں یا بعض ریاستوں کے کچھ حصوں میں عورتوں کو بہت زیادہ حفاظت میں رکھا گیا اور انہیں اسلام کے عطا کردہ کچھ بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے۔'' وہ لکھتے ہیں: ''افغانستان ویسی ہی ایک ریاست ہے۔ حالیہ زمانوں میں افغان قائدین انہیں تعلیم اور روزگار جیسے حقوق واپس دینے لگے ہیں۔ تاہم ''جبری قوانین'' صرف طالبان ہی کا خاصہ نہیں ہیں۔ یہی قوانین' تعلیم سے متعلقہ ایک دو قوانین کے علاوہ' افغانستان کے ان صوبوں میں بھی نافذ ہیں جو مخالفوں کے قبضے میں ہیں۔''

اس کے باوجود وہ اس حکومت پر تشدید تنقید بھی کرتے ہیں: ''طالبان اسلامی تصور' اقتدار اور اعمال کی بے حرمتی کر رہے ہیں اور ان کا مضحکہ اڑوا رہے ہیں۔'' وہ حکومتی نشریاتی ادارے کو ''ریڈیو شریعت'' کا نام دینے کے طالبان کے فیصلے کی مثال دیتے ہوئے اسے ''شرانگیز'' قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں یہ شریعت کی بے حرمتی ہے۔ وہ طالبان رہنما کے اپنے آپ کو ''امیر المومنین'' کہلوانے پر بھی اعتراض کرتے ہیں' یہ خطاب تاریخی طور پر پوری اسلامی برادری کے سربراہ کے لئے مخصوص ہے۔[13]

رحیم اللہ یوسف زئی اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مغربی ذرائع ابلاغ ''طالبان

کے ان کارناموں کی خبریں شاذونادر ہی دیتے ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے ملک میں آبادی کو غیر مسلح کروا دیا ہے جہاں اسلحہ اور ایمونیشن کا سیلاب آیا ہوا تھا' سڑکوں سے رکاوٹیں اور چیک پوائنٹس ختم کر دیئے ہیں اور اپنے زیر قبضہ علاقوں میں لوگوں کی زندگی اور عزت کو محفوظ کر دیا ہے۔ نیز انہوں نے افغانستان کو ایک مقتدرہ کے تحت دوبارہ اکٹھا کر دیا ہے جو کہ ابھی حالیہ زمانے تک بہت سے مسلح گروہوں اور کمانڈروں کے زیر تسلط تھا اور جنہوں نے دہشت کی حکمرانی قائم کر رکھی تھی۔ ایسے گروہ صرف طاقت کے بل پر حکومت کرتے تھے جبکہ طالبان صرف طاقت کے بل پر ہی دعویٰ نہیں کرتے۔"

وہ طالبان کے تیزی سے اقتدار میں آ جانے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کے پیشرو افغان مجاہدین سوویت تسلط اور کابل کی ماسکو کی حامی حکومت کے خلاف کامیابی سے لڑنے کے بعد امن قائم کرنے یا اسلامی قانون نافذ کرنے میں ناکام ہو گئے۔ طالبان کو عوام نے خوش آمدید کہا جو کہ مجاہدین سے تنگ آ چکے تھے اور ان سے چھٹکارہ پانا چاہتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ طالبان کو حقیقتاً لڑے بغیر زیادہ فتوحات کس طرح حاصل ہو گئیں۔"

وہ بتاتے ہیں کہ طالبان کی عائد کردہ کچھ پابندیاں نرم کر دی گئی ہیں تاہم دیگر پابندیوں کو نارمل تصور کرتے ہوئے برقرار رہنے دیا گیا ہے۔ "عورتیں بتدریج گھروں سے باہر جا رہی ہیں تاہم ان کو برقعہ اوڑھنا پڑتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر انہیں مرد ڈاکٹروں کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ عورت کی "عزت" کا تحفظ کرتے ہوئے مرد پگڑی باندھتے اور ڈاڑھی رکھتے ہیں' مردوں کی برتری اور مذہبی رسومات کی ادائیگی صدیوں سے ان کی قبائلی روایت چلی آ رہی ہے۔ دیہی افغانستان میں ان قوانین کے نفاذ کی مشکل ہی سے ضرورت ہے کیونکہ وہاں لوگ ان کو معمول سمجھ کر اپنائے ہوئے ہیں۔ صرف کابل کی مغربی تعلیم یافتہ اشرافیہ ہی طالبان کے ان ضابطوں سے تکلیف محسوس کرتی ہے۔ [14]

ستمبر 1999ء میں طالبان کے ترجمان وکیل احمد متوکل نے اعلان کیا کہ بھاری فوجی اخراجات کی وجہ سے تعلیم اور صحت کے لیے بہت تھوڑا پیسہ بچا ہے۔ مستقبل کے حوالے سے انہوں نے کہا: "ہمارا ارادہ ہے کہ دونوں صنفوں کے لیے تعلیمی پروگرام شروع کریں۔" تاہم انہوں نے کہا کہ کسی ادارے میں مخلوط تعلیم نہیں دی جائے گی۔ [15]

دسمبر 1999ء کے اواخر میں طالبان نے دنیا بھر میں اپنی قیادت کی خوب تعریف

کروائی' جب کشمیری عسکریت پسند ائیر انڈیا کا ایک ہوائی جہاز اغوا کر کے کابل ایئر پورٹ پر لے آئے۔ وہ جہاز وہاں آٹھ دنوں تک کھڑا رہا۔ انہوں نے ایک مسافر کو قتل کر دیا اور ایک سو پچپن دیگر مسافروں کو مغوی بنائے رکھا۔ پہلے تو عسکریت پسندوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان بیس کروڑ ڈالر تاوان ادا کرے' چھتیس عسکریت پسندوں کو قید سے آزاد کرے نیز ایک اور عسکریت پسند کی لاش قبر سے نکال کر کشمیریوں کے حوالے کرے۔

جب ایک طالبان مذاکرہ کار نے اغوا کنندگان کو آگاہ کیا کہ ''اغوا کرنے کا سارا عمل' تاوان کے لیے لوگوں کو یرغمال بنانا اور لاشوں کو قبر سے نکالنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔'' تو پیسے اور لاش قبر سے نکالنے کا مطالبہ ترک کر دیا گیا۔ 16 طالبان رہنماؤں کے ساتھ مزید مذاکرات کے بعد اغوا کنندگان اس پریشانی کو تب ختم کرنے پر رضامند ہو گئے جب ہندوستان کی حکومت صرف ایک مسلمان رہنما کو آزاد کرنے پر رضامند ہو گئی۔ معاہدے کے ایک جزو کے مطابق طالبان افسران نے اغوا کنندگان کو اپنی حفاظت میں لے جا کر ایک نامعلوم پہاڑی علاقے میں چھوڑ دیا۔ جنوری 2000ء میں افغان حکومت نے اسی این این کیبل نیٹ ورک کو کابل میں اپنا مستقل بیورو قائم کرنے کی دعوت دے کر اپنا بین الاقوامی امیج بہتر کرنے والا ایک اور قدم اٹھایا۔ اس نے بی بی سی کو وسیع کوریج کے لیے مضافات تک رسائی کی اجازت بھی دے دی۔

محمد بشر دوست مستقبل کے حوالے سے پرامید ہیں ''عشروں پر محیط جنگ' خونریزی' اغوا اور لوٹ مار کے بعد افغانستان کے مرد و زن کسی ایسے شخص' ایسے گروہ' ایسے ادارے کے لیے بے تاب تھے جو امن' تحفظ اور استحکام کو بحال کرے۔ وہ اتحاد' تحفظ' ہتھیار جمع کرنے اور امن کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں۔ انہوں نے طالبان کو انہیں کارناموں کی وجہ سے گلے لگایا ہے تاہم وہ ایسا کرنے والے کسی دوسرے گروہ' قوم یا بین الاقوامی ادارے کو بھی اسی طرح گلے لگاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ کسی جنگ زدہ قوم کو راتوں رات نہ تو بین الاقوامی مرکزی دھارے میں لایا جا سکتا ہے نہ اس کی تعمیر نو ہو سکتی ہے۔''

بشر دوست کو امید ہے کہ امریکی حکومت طالبان کے ساتھ ''تعمیری مذاکرات'' کرنے میں سبقت لے جائے گی اور افغانستان پر عائد پابندیوں کو ہٹانے پر زور دے گی۔ وہ افغان ثقافت میں عورتوں کے روایتی تحفظ کا دفاع کرتے ہیں۔ ''ناموس ایک ایسی اصطلاح ہے جو عورتوں کے لیے افغان مردوں کی طرف سے بے حد عزت اور

احترام کی ترجمانی کرتی ہے''۔[17]

لیکن عورتوں کی تعلیم اور روزگار کے حوالے سے بنائی گئی حکومتی پالیسیوں میں عزت اور احترام کا پایا جانا دشوار ہے۔ جولائی 2000ء میں طالبان نے عورتوں کے لیے گھر میں ہی روزگار کے ایک پروگرام کو بند کر دیا اور اس کے رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا۔ ایریزونا کی ایک تنظیم نے جو ''فزیوتھراپی اینڈ ری ہیبلیٹیشن فار افغانستان'' (Physiotherapy and Rehabilitation for Afhghanistan) کہلاتی ہے' گھروں میں بند عورتوں کی آمدنیوں میں اضافے کے لیے اس منصوبے کو تیار کیا تھا اور اس کی رہنما میری میکمیکن اور ان کے عملے کو چار سال کے جیل بھیج دیا گیا۔[18]

افغان عورتوں کی تعلیم طویل عرصے سے نظر انداز ہو رہی ہے۔ مردوں میں خواندگی کی شرح 33 فیصد ہے لیکن عورتوں میں اس کا تخمینہ افسوسناک یعنی 5 فیصد ہے اور ممکن ہے اس سے بھی کم ہو۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ''ناموس'' کے باوجود عورتیں طالبان کے اقتدار میں آنے سے بہت عرصے پہلے سے تعلیم کے شعبے میں امتیاز کا شکار تھیں۔[19]

بشر دوست تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ طالبان ''داخلی اصلاح'' کی اہلیت رکھتے ہیں۔ وہ پیشگوئی کرتے ہیں: ''مجھے یقین ہے کہ آپ کی کتاب کی اشاعت تک حکومت کی پالیسیوں میں عورتوں کی حیثیت سمیت ایسی تبدیلیاں آ چکی ہوں گی جو افغانستان کا امیج بہتر کر دیں گی۔ مجھے کہنے دیجئے کہ عورتوں کی تعلیم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اور ایسی ہی دیگر معاملات کی بھی صورت ہے۔[20] 2001ء کے آغاز میں بشر دوست کی پیشگوئی کے کسی حد تک پورا ہوتے ہوئے' اقوام متحدہ کے ایک معائنہ کمیشن نے افغانستان میں پوست کی پیداوار میں بہت زیادہ کی خبر دی۔[21]

پاکستان سے سعید احمد بٹ لکھتے ہیں: ''یاد رہے کہ افغانوں نے سوویت یونین کے خلاف اس غیر مساوی رزمیہ جدوجہد کے دوران دس لاکھ جانیں گنوائی ہیں۔ پچاس لاکھ سے زیادہ لوگوں کو پڑوسی ملکوں میں پناہ لینا پڑی اور دس سال سے زیادہ عرصے تک اذیت ناک حالات میں رہنا پڑا۔[22] دیگر اندازوں میں اموات کا تخمینہ بیس لاکھ لگایا گیا ہے۔ سعید احمد بٹ لکھتے ہیں کہ سکولوں' ہسپتالوں اور طبی خدمات میں صنفی علیحدگی' عورتوں کا چہروں پر نقاب ڈالنا' مردوں کا ڈاڑھی رکھنا اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا طالبان کے اقتدار میں آنے سے بہت پہلے کی روایات ہیں اور ان میں سے بعض تو اسلام کی آمد

سے بھی پہلے کی ہیں۔ [23]

تاہم ان اقدامات کو' خواہ انہیں مذہب نے یا سیکولر روایت نے تحریک دی ہو' حکومت نے نافذ کیا ہے' انہیں فرد یا خاندان پر نہیں چھوڑا گیا۔ افغانستان میں ان معاملات میں انتخاب کی آزادی نہیں ہے۔ اتفاق رائے کے ذریعے حکومت کا اسلامی مثالیہ (آئیڈیل)' جو تمام افراد کے حقوق اور عزت و وقار کو تحفظ دیتا ہے' کہیں نہیں پایا جاتا۔

سوویت حملہ آوروں اور ان کے افغان ساتھیوں کو شکست دینے کے لیے جنگ لڑنے میں افغان مجاہدین آزادی اپنی غیر معمولی بہادری اور استقامت پر بے دریغ تعریف کے حق دار ہیں۔ تمام افغان اس دس برس پر محیط جدوجہد کے بعد پیدا ہونے والے انتشار میں لاتعداد چیلنجوں سے مسلسل نبرد آزما رہنے پر بین الاقوامی ہمدردی کے مستحق ہیں۔

یہ جدوجہد 2000ء کے آخر میں آنے والے ہمہ گیر قحط کے دوران عروج پر پہنچ گئی۔ مارچ 2000ء میں اقوام متحدہ نے خبردار کیا تھا کہ مسلسل تین سالوں پر محیط خشک سالی کی وجہ سے دس لاکھ سے زیادہ افغان فوری قحط کے خطرہ سے دوچار ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ اسی تنظیم ـــ یعنی اقوام متحدہ ـــ نے امریکہ کے کہنے پر پوری قوم کے خلاف سخت اقتصادی پابندیاں عائد کر کے اس المیے کی شدت میں اضافہ کر دیا کیونکہ طالبان نے افغانستان میں پناہ لینے والے اسامہ بن لادن کو نکال دینے کا مطالبہ رد کر دیا تھا۔ وہ امریکی انصاف کے افسروں کو دہشت گردی کے الزامات میں مطلوب تھا۔ ہرات میں ایک طالبان رہنما نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ امریکی ایک شخص ـــ اسامہ بن لادن کو حاصل کرنے کے لیے ان پابندیوں کے ذریعے افغانیوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں؟'' [24]

ایسا لگتا ہے کہ باہر کے لوگ تسلیم نہیں کرتے کہ اسامہ بن لادن افغانوں کے ممتاز ترین ہیروؤں میں سے ایک ہے' بالکل اسی طرح جس طرح امریکہ کی انقلابی جنگ کے دوران کالونیلز (Colonials) کی طرف سے لڑنے والا فرانسیسی مارکیز ڈی لیفائیٹ (Marquise de Lafayette) تھا۔ اسامہ بن لادن سوویت افواج کو نکالنے کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں امریکی حکومت کے شریک ہونے سے پہلے شامل تھا۔

منظر اس وقت عجیب و غریب اور انوکھا ہو گیا' جب فروری 2001ء میں طالبان نے عالم گیر توجہ کا ہدف بن جانے والا حکم جاری کیا کہ چٹانوں میں تراشے گئے گوتم بدھ کے بہت بڑے مجسموں کو مسمار کر دیا جائے' جو کہ اسلام کی آمد سے بھی پہلے بنائے گئے تھے۔ افغانستان

بدھ مت کے ابتدائی مقامات میں سے ایک ہے اور تاریخ دان ان مجسموں کو نایاب آثار قدیمہ قرار دیتے ہیں۔ ساری دنیا میں احتجاج ہونے لگا۔ دوسرے ملکوں کے مسلمان رہنما طالبان کے اس فیصلے پر یہ کہتے ہوئے نوحہ کناں ہو گئے کہ اسلام بت پرستی کی ممانعت کرنے کے باوجود دوسرے مذاہب کی یادگاروں کو تباہ و برباد کرنے کی ہدایت نہیں دیتا ہے۔ مجسموں کے حوالے سے کھڑا ہونے والا ہنگامہ اس امر کے مزید شواہد فراہم کرتا ہے کہ طالبان اپنی حکومت کو اسلامی کہلانے کا کوئی استحقاق نہیں رکھتے۔ لیکن امریکی پابندیوں پر ظاہر ہونے والے ردعمل سے عالمی برادری کی بے حسی، منافقت اور جہالت بھی واضح ہو گئی ہے۔ گوتم بدھ کے دو مجسموں کی بربادی پر سامنے آنے والا مستقل اور زوردار بین الاقوامی احتجاج سوڈان میں دریائے نیل کے کناروں پر کرما (Kerma) میں واقع قدیم نیوبینز تہذیب (Nubian Civilization) کی باقیات نایاب آثار کی جلد ہی وقوع پذیر ہونے والی بربادی پر سامنے آنے والے احتجاج سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ آثار تب غرق ہو جائیں گے اور ہزاروں نیوبیَن اپنے آباؤ اجداد کے وطن سے اجڑ جائیں گے جب کجبر کے مقام پر دریائے نیل پر ایک ڈیم تعمیر کیا جائے گا۔ زیادہ اشتعال انگیز تو دنیا کی وہ تقریباً مکمل بے نیازی ہے جو وہ اقوام متحدہ کی طرف سے عائد کردہ اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی خوراک اور ادویات کی کمی سے مرنے والے افغانوں کے المیئے کے حوالے سے برت رہی ہے۔

یہ امر قابل یقین ہے کہ گوتم بدھ کے مجسموں کو مسمار کرنا اگرچہ طالبان کی فاش غلطی ہے تاہم وسیع تناظر میں یہ اقوام متحدہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کا ایک سیاسی اقدام ہے۔ ایک سوڈانی نے مجھ سے کہا کہ ''لوگوں کا تحفظ ان کے ورثے کے تحفظ سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ طالبان کا یہ اقدام ان کے الگ تھلگ ہونے اور ان کے حالات سے عالمی برادری کی عدم توجہی کا نتیجہ تھا۔''

حواشی

1. یو ایس اے ٹوڈے' 29-12-1999
2. خط' مؤرخہ 30-9-1999
3. ''دی طالبان'' از پیٹر مارسڈن' صفحہ 41
4. انٹرویو' 7-8-2000
5. ایضاً
6. خط از سعید احمد بٹ' مؤرخہ 31-8-1999
7. خط' مؤرخہ 30-10-1999
8. انٹرویو' 6-7-1999
9. ''دی طالبان' وار' ریلیجن اینڈ دی نیو آرڈر ان افغانستان'' صفحات 148,57
10. واشنگٹن پوسٹ' 21-5-1999 صفحہ A23
11. نیوز ریلیز' مسلم پبلک افیئر کونسل' 7-99
12. خط' مؤرخہ 8-10-1999
13. خط' مورخہ 24-9-1999
14. خط' مورخہ 30-10-1999
15. اے ایف پی نیوز ایجنسی' مورخہ 14-9-1999
16. عامر ضیا' قندھار' افغانستان' اے پی ڈسپیچ' مورخہ 30-12-1999
17. خط' مورخہ 16-4-1999
18. یو ایس اے ٹوڈے' مؤرخہ 13-7-2000 صفحہ 8اے
19. خط' مورخہ 1-8-99 اور ''افغانستان ان پکچرز'' (لرز پبلیکیشنز' 1990ء)' صفحہ 47
20. خط' مورخہ 15-8-2000
21. ''جرنل کوریئر'' مورخہ 16-2-2000 ' جیکسن وائل' آئی ایل'
اے پی ڈسپیچ' صفحہ 10
22. خط' مورخہ 31-8-1999
23. ایضاً
24. ٹائم' مؤرخہ 7-3-2001' صفحہ 48-47

پانچواں باب

اسلام، جمہوریت اور آمریت

اسلام کی ساکھ کو پہنچنے والے نقصانات کا اندازہ لگاتے ہوئے زیادہ تر الزام لازماً کچھ خاص مسلمانوں پر آتا ہے یعنی ان پر جنہوں نے اس انداز حکومت کے بارے میں غلط اور مبہم تصورات کو جنم دیا ہے جسے مسلمان قائم کرنے کے خواہش مند ہیں' ان پر جنہوں نے اپنے مذہب کے نام پر مذہبی عدم رواداری برتی اور دوسری غیر اسلامی کارروائیاں کیں' اور ان پر جو مسلمان ہونے کا دعوٰی کرنے والوں کے ایسے غلط رویے کی خبریں بغیر کوئی احتجاج کیے سنتے اور دیکھتے ہیں۔

مذہبی رواداری تینوں وحدانیت پرست مذاہب کی بنیاد ہے اور اسے واضح طور پر تسلیم کرنا اور اس کا ذمہ دارانہ اطلاق لازمی ہے۔ یہ عیسائیت' اسلام اور یہودیت کے شعائر اور امریکی قوانین اور روایات میں شامل ہے۔ اس کے باوجود مذہبی عدم رواداری عیسائی' مسلمان اور یہودی کہلوانے والوں کے طرز عمل میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ دہشت ناک سفاکی کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ایک ہولناک مثال دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمنی میں رونما ہوئی جب نازی حکومت نے ساٹھ لاکھ انسانوں کو صرف اس وجہ سے قتل کروا دیا کہ وہ یہودی تھے۔ اگرچہ نازی ہولوکاسٹ (Nazi Holocaust) کے پیمانے پر تو نہیں تاہم مذہبی عدم رواداری کی دوسری دہشت ناک مثالیں رونما ہوئی ہیں' ان میں خاص طور پر بوسنیا اور کوسوو میں مسلمانوں کا قتل عام شامل ہے۔

امریکی ذرائع ابلاغ نے خبر دی کہ جنوری 2000ء میں انڈونیشیا میں' جس کے اکیس کروڑ شہریوں میں سے نوے فیصد اسلام کے پیروکار ہیں' مسلمانوں نے درجنوں گرجوں اور عیسائیوں کے گھروں اور دکانوں کو نذر آتش کر دیا اور تین یا شاید زیادہ

عیسائیوں کی ہلاکت کا سبب بنے۔ 9-1998ء کے دوران انڈونیشیا میں بہت زیادہ تشدد برپا ہوا' جب خبروں کے مطابق ایک ہزار افراد' جن میں چند مسلمان اور زیادہ تر عیسائی شامل تھے' قتل کر دیئے گئے۔[1]

ہو سکتا ہے ان واقعات کی جڑیں مذہبی کی بجائے سیاسی معاملات میں ہوں اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ عیسائی بھی جارحیت پسند اور سفاک رہے ہوں' ہو سکتا ہے کہ عیسائی مسجدوں کو نذر آتش کرتے رہے ہوں۔ تاہم اس سوال سے قطع نظر کہ کس نے پہلے اور کیوں حملہ کیا' اس تشدد کو امریکی ذرائع ابلاغ نے یوں پیش کیا جیسے مسلمان' عیسائیوں پر مظالم ڈھا رہے ہوں۔ ایسی خبریں'' خواہ درست یا متعصبانہ' اسلام دشمن یک رخے تصورات کو نمایاں کرتے ہوئے امریکہ میں کئی روز شہ سرخیوں میں رہیں۔ حلقۂ اسلامی شمالی امریکہ (Islamic Circle of North America-Icna) کی طرف سے شائع ہونے والے ماہنامے ''پیغام'' کا اکتوبر 1999ء کا شمارہ انڈونیشیا میں تشدد کی مذمت کرتا ہے۔ تاہم بظاہر بیشتر دیگر امریکی مسلمان رہنما ان خبروں کو نظر انداز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے بھی حوالے سے اہم ذرائع ابلاغ میں ایسی خبر شائع نہیں ہوئی کہ انہوں نے اس رویے کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کی مذمت کی ہو۔

دوسرے اوقات اور مقامات پر مذہبی عدم رواداری کا اظہار غیر متشددانہ انداز میں ہوا ہے' اکثر و بیشتر کسی فرد کے اپنے مذہب ہی کو درست قرار دینے اور ایمان نہ رکھنے والوں کی تذلیل و تحقیر کے ذریعے۔ ہو سکتا ہے مذہبی عدم رواداری کی لہر کسی امریکہ جیسے ملک میں خصوصاً بہت زوردار ہو' جہاں ایک مذہب یعنی عیسائیت قوم کے وجود میں آنے کے وقت سے غالب چلی آ رہی ہے۔

کیا مذہبی عدم رواداری ایک قدرتی مظہر ہے' شدید مگر بے ہدایت یقین کی ناگزیر ضمنی پیداوار؟ بیشتر لوگ دوسرے مذاہب کا پہلے مطالعہ کیے بغیر مذہبی وابستگی قائم کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے وہ کہیں نا قابل برداشت اور کہیں نرم مذہبی عدم رواداری کی طرف مائل ہو جاتے ہوں۔ میرے ایک ہمسائے جواں سال وکیل اور تازہ نو مسلم ایلن یو (Allen Yow) اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں: ''ممکن ہے مذہبی عدم رواداری کی طرف مائل ہو جانا کسی حد تک انسانی فطرت ہو۔ میری مثال میں اسلام سے وابستگی ایک بے حد ذاتی اور روحانی فیصلہ تھا۔ میں نے اسلام کو قبول کر کے اپنے والدین کے مذہب عیسائیت پر اسے ترجیح دی۔ بیشتر

لوگوں کو اس قسم کا انتخاب درپیش نہیں ہوتا۔ زیادہ تر عیسائی اپنے آباؤ اجداد کے مذہبی راستے پر ہی گامزن رہتے ہیں۔ یہ بات اکثر و بیشتر مسلمانوں اور یہودیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ حقیقتاً ان کے لیے یہ کوئی انتخاب' ایک مذہب کے مقابلے میں دوسرے مذہب کا شعوری چناؤ نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے اکثر عیسائیوں کو اسلام کے بارے میں غلط معلومات دی گئی ہیں' اور میں نے دیکھا ہے کہ یہی غلط آگہی عدم رواداری کو پیدا کرتی ہے۔ کسی ایسے مذہب سے عدم رواداری برتنا آسان ہوتی ہے جسے تم جانتے نہیں ہو"۔ 2

عام طور پر مذہب کسی شخص کی اخلاقی جہت کی جستجو میں ایک وسیلے کا کردار ادا کرتا ہے' ایک جستجو جو کہ شدید اور شخصی ہوتی ہے ـــ یا اسے ہونا چاہیے۔ اس امر کو جان کر کسی کو حیران نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے مذہب ہی کو درست سمجھنے کا میلان عدم رواداری کو جنم دیتا ہے۔ یہ انسانی انا کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے اور ان لوگوں میں خاص طور پر شدید ہوتی ہے جو دوسرے مذاہب کے بارے میں تھوڑا علم رکھتے ہیں یا بالکل ہی لاعلم ہوتے ہیں۔

اپنے ایک تیس سالہ دوست کے ساتھ میرے تازہ ترین مکالمے میں مذہبی عدم رواداری مرکزی موضوع رہا۔ وہ ایک وسیع المطالعہ پیشہ ور (پروفیشنل) ہیں جو ایک صاحب بصیرت اور صاحب فکر انسان ہیں اور نہ تو کبھی ہیجان زدہ ہوئے ہیں اور نہ ہی مبالغہ آمیزی کرتے ہوئے بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ وہ خط و کتابت اور گفتگو میں اس وصف کا اظہار کرتے ہیں جسے وہ کفایت لفظی کہتے ہیں۔ ان کی آرا اور تصورات ہمیشہ دل کش ہوتے ہیں۔ وہ ایک منتخب افسر اور شائع ہونے والے مبصر کی حیثیت میں جماعتی سیاست کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ ہمارے برسوں سے جاری تبادلۂ خیال میں وسیع موضوعات کا احاطہ کیا گیا اور اکثر و بیشتر ہم مذہب پر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ وہ پہلے اپسکو پیلیئن (Episcopalian) ہوتے تھے لیکن حال ہی میں ان کی مذہبی وابستگی اور دلچسپی یونی ٹیریئن چرچ (Unitarian Church) کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔

اس موقع پر جب میں نے اپنے تازہ ترین پروجیکٹ یعنی زیر نظر کتاب کے لکھنے کا بتایا تو ہماری باقی ماندہ گفتگو مذہب ہی کے حوالے سے ہوئی۔ ان کی درخواست پر میں ان کا نام درج نہیں کر رہا۔ انہوں نے واضح کیا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں یا اسلام پر گفتگو کرنے کا اہل نہیں پاتے اور نہ ہی یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انہیں ایسا تصور کرے۔ تاہم ان کے خیالات اس کتاب سے متعلق رکھتے ہیں ... مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے

حوالے سے کسی عیسائی سیاست دان کے ردعمل کے متعلق قابل قدر اضافہ تھے۔

اپنی بحث کے اختتام سے پہلے ہی میں نے انہیں بتایا کہ مسلمانوں کے ساتھ میرا انفرادی تجربہ تقریباً بغیر کسی استثنا کے خوشگوار رہا ہے۔ میں نے انہیں بامروت، فیاض، مہمان نواز اور اچھے سامع پایا ہے۔ وہ امریکہ کا جزولاینفک بن چکے ہیں۔ اسلام امریکہ کا دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے اور اگر مسلمانوں کی موجودہ شرح پیدائش برقرار رہی تو جلد ہی ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہو جائے گی۔

انہوں نے ایک قابل غور اور اپنے معمول سے ہٹ کر طویل جواب دیا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے کبھی کسی مسلمان یا کسی دوسرے شخص سے اسلام کے بارے میں تبادلۂ خیال نہیں کیا ہے۔ میں یہ دکھاوا نہیں کروں گا کہ میں اسلام کے بارے میں آگاہی رکھتا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی کسی ایسے شخص سے کسی بھی موضوع پر تبادلۂ خیال کیا ہو، جسے میں مسلمان کے طور پر جانتا ہوں۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ مسلمان رہنما جو کچھ کر رہے ہیں میں تو اس سے خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے تو ایک سعودی ریڈیکل نے پریشان کیا ہوا ہے کہ جو افغانستان میں رہتا ہے، خود کو مسلمان کہلواتا ہے اور جس پر الزام ہے کہ وہ دہشت گردی کے منصوبے بناتا ہے۔ گزشتہ رات ٹیلی ویژن پر اس کا انٹرویو نشر ہوا۔ مجھے اس کا نام تو یاد نہیں تاہم مجھے تو وہ ذہنی مریض کے طور پر یاد ہے۔''

میں نے پوچھا کیا اس کا نام اسامہ بن لادن تو نہیں ہے؟

''بالکل اس کا نام یہی ہے۔ اس انٹرویو نے تو اس کا اور اسلام کا بُرا تصور پیش کیا۔ ہو سکتا ہے آپ کے مسلمان دوست بہت اچھے ہوں لیکن گزشتہ ہفتے میں نے ٹیلی ویژن سے مسلمانوں کے بارے میں جو تاثرات حاصل کئے وہ تو بالکل دلکش نہیں ہیں۔ حقیقت میں تو میں نے انہیں خطرناک اور جارحیت پسند پایا۔''

میں ان الفاظ کی شدت پر حیران نہیں ہوا یا اس حقیقت پر کہ انہوں نے اسامہ بن لادن کو افغانستان سے جوڑ دیا تھا۔ بات یہ ہے کہ حالیہ دنوں میں افغان حکومت کے حوالے سے سنسنی خیز خبریں چھائی رہی ہیں۔ اخباروں کی شہ سرخیوں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے جو تاثرات ہم تک پہنچتے ہیں۔ وہ صدمہ انگیز ہیں۔ وہ ایک ایسی خوفناک حکومت کا تصور پروان چڑھاتے ہیں، جس نے شہریوں کے حقوق غصب کر لئے ہیں، عورتوں پر جبر واستبداد کر رہی ہے اور جس نے ایک ایسے دولت مند عرب کو پناہ دے رکھی ہے جو

خطرناک دہشت گرد بن گیا۔

میرے دوست نے آتے ہی کہا تھا کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ اب انہوں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی' کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازے کی طرف بڑھنے لگے' پھر رک گئے' مڑے اور دھیرے سے' لیکن مضبوط لہجے میں بولے:

''میں مسلمانوں کے حوالے سے حیثیت میں متفکر نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اتنے ہی شائستہ اور محنتی ہیں جتنے دوسرے لوگ ___ بلکہ ہوسکتا ہے ان سے قدرے زیادہ ہی ہوں۔ مجھے تو پریشانی ان واقعات سے ہے جو افغانستان میں اسلام کے نام پر رونما ہو رہے ہیں اور اس امر پر کہ اس ملک کے مسلمان لیڈر بغیر کسی احتجاج کے ان دہشت ناک کارروائیوں کو قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر افغان قائدین اسلام کے اصولوں اور قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو پھر اس مذہب کے رہنما ان کے اپنی حکومت کو جھوٹا اسلامی تشخص دینے پر عوامی سطح پر مذمت کیوں نہیں کرتے؟

''کسی شخص کا خیال ہوگا کہ انہوں نے بات کی ہوگی تاہم مجھے کوئی گلہ شکوہ سنائی نہیں دیتا۔ کیا وہ لوگ بولنے سے بوجوہ خوف زدہ ہیں؟ میں تو نہیں سوچ سکتا کہ انہیں خوف زدہ ہونا چاہیے۔ یا شاید وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس معاملے پر تھوڑی بات کرنی ہی بہتر ہے؟ کیا انہیں یہ توقع ہے کہ اول تو امریکی توجہ نہیں دیں گے اور اگر توجہ دی بھی تو جلد فراموش کر دیں گے؟''

میرا خیال ہے اس لیے انہوں نے چھ لاکھ یا اس سے زیادہ اسلام کے پیروکار امریکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر مسلم امریکیوں کا حوالہ دیا تھا۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''یا اس کا مطلب ہے کہ امریکی مسلمان افغان حکومت کے اقدامات سے مطمئن ہیں جبکہ میں تو اس پر بہت خائف ہوں۔''

جب وہ اپنی گفتگو کے اختتام پر پہنچے تو میں نے ان کی آواز میں ایک غیر معمولی کاٹ محسوس کی:

''آپ کہتے ہیں کہ چند برسوں میں امریکی مسلمانوں کی تعداد دگنی ہو جائے گی۔ جب یہ مسلمان سیاست میں عمل دخل حاصل کرلیں گے تو اس سے امریکہ کے مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟ میں جس بات پر متفکر ہوں وہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو موقع ملا تو وہ امریکہ میں اور

ہماری حکومت میں کیسی تبدیلی کرنے کے خواہش مند ہو سکتے ہیں۔"

انہوں نے اپنی گھڑی پر دوبارہ نگاہ ڈالی۔ میں چاہتا تھا کہ گفتگو میں حصہ لوں لیکن مجھے علم تھا کہ اگر میں نے ان کی روانگی میں تاخیر کروادی تو وہ پریشان ہوں گے۔ مزید یہ کہ مجھے تو اس شدت نے دم بخود کر دیا تھا جو میں نے ان کے آخری الفاظ میں پائی تھی۔ جب میں ان کے ساتھ بیرونی دروازے تک جا رہا تھا تو میں نے سادگی سے کہا: "آپ نے اہم سوال اٹھائے ہیں' میں ان پر غور کروں گا۔"

میں نے اس وقت تو ان باتوں کا جواب نہیں دیا جو انہوں نے کہی تھیں۔ اگرچہ میں نے ان پر کئی برسوں سے سوچا نہیں تھا تاہم میں خود بھی اسامہ بن لادن اور طالبان کی زیادتیوں پر مسلمانوں کے عدم احتجاج پر حیران اور الجھا ہوا تھا۔ میں نے امریکی مسلمانوں سے تبادلۂ خیال کے ذریعے جانا کہ وہ لوگ "افغان حکومت کے اقدامات سے مطمئن نہیں تھے۔" تاہم میں نے ان غلط کاموں پر احتجاج نہ تو دیکھا اور نہ ہی سنا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ کیلیفورنیا' الی نوائے اور ٹیکساس کے کئی مسلمان رہنماؤں نے تو احتجاجی بیانات جاری کیے تھے لیکن ذرائع ابلاغ نے انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔

واضح بات ہے کہ میرے شائستہ اور عالی دماغ دوست کو اس بات کی پریشانی تھی کہ اگر مسلمانوں نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ وہ امریکہ کے سیاسی نظام پر اثر انداز ہو سکیں تو امریکی طرز حیات میں کیسی تبدیلی آ سکتی ہے۔ مزید برآں میں نے تصور کیا کہ اور کتنے زیادہ امریکی انہی کی طرح متفکر ہوں گے' خصوصاً وہ جنہوں نے ٹیلی ویژن پر ایسی رپورٹیں دیکھیں اور اخبارات میں ایسے مضامین پڑھے جنہوں نے انہیں پریشان کر دیا۔ ہو سکتا ہے ایسے سامعین و ناظرین کی تعداد لاکھوں میں رہی ہو۔ مجھے مطالعے اور سوچنے کے لیے وقت مطلوب تھا اور میں جانتا تھا کہ مجھے ان غیر حل شدہ معاملات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان پر توجہ دینا ضروری تھا۔

جب میں نے دیکھا کہ میرا دوست کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا ہے تو میری سوچوں کا رخ اپنے دس سالہ پرانے ایک ذاتی تجربے کی طرف مڑ گیا جو تقریباً افغانستان جتنی ہی دوری پر واقع ملک جنوبی افریقہ میں ہوا تھا۔ جہاں میں نے ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل مسلمان رہنما احمد دیدات کے ساتھ اپنے گمنام دوست کے اٹھائے ہوئے سوالات جیسے سوالات پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔ وہ ڈربن' جنوبی افریقہ میں قائم بین الاقوامی مرکز اشاعت اسلام

(Islamic Propagation Centre International) کے بانی اور صدر تھے۔

طویل قامت، پرشکوہ سفید ڈاڑھی والے احمد دیدات جہاں بھی گئے توجہ کا مرکز بن گئے۔ انہوں نے اعتماد کا ایسا انداز وضع کیا جس نے انہیں ایک فطری رہنما بنا دیا۔ اس شام انہوں نے مسلمانوں والی ایک روایتی ٹوپی، ایک سفید عبا اور ایک مغربی سوٹ جیکٹ (Suit Jacket) زیب تن کی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گردن پر اپنی قمیض کو کھلا رکھا ہوا تھا جبکہ اس کے کالر جیکٹ کے کالروں کو صفائی سے ڈھانپے ہوئے تھے۔

اس رات گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے احمد دیدات نے اسلامی حکومت کا ایک ایسا تصور پیش کیا جو برسوں بعد ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے ذریعے طالبان کے بارے میں ابھرنے والے تصور سے بالکل مختلف تھا جب ہم کیپ ٹاؤن کے میدان میں بہت بڑے ہجوم کے اکٹھے ہونے سے پہلے گفتگو میں حصہ لینے کے لیے تیار تھے تو انہوں نے موضوع کو ایک غیر معمولی، گھیردار انداز میں ابھارا۔ دیدات نے مجھے بتایا کہ انہوں نے اس عمارت کی لابی (Lobby) میں سامعین کے خریدنے کے لیے دو کتابیں رکھی ہیں۔ انہوں نے میری کتاب They Dare to Speake out کا ایک اپنا ایڈیشن شامل کیا تھا۔ دوسری کتاب کو انہوں نے ''عالمی حکومت کے آئین کا متن'' قرار دیا۔

اس سے میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں طویل عرصے سے ایسی بین الاقوامی تنظیموں میں دلچسپی لے رہا ہوں جو انسانی حقوق کا تحفظ کرتی ہیں اور دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہیں۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ اس کتاب کو کس نے لکھا ہے اور اس نے کس قسم کی حکومت تجویز کی ہے؟ میں نے سوچا کہ آخر مجوزہ نئی حکومت ایسا کیا کر سکتی ہے کہ جسے اقوام متحدہ اور دوسری بین الاقوامی تنظیمیں حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ میں حیران رہ گیا جب احمد دیدات نے عوامی جلسے کے آغاز سے تھوڑا ہی پہلے مجھے بتایا کہ عالمی حکومت کا آئین قرآن ہے۔ تب تک پروگرام کے شروع ہونے کا وقت ہو چکا تھا اور میرے پاس احمد دیدات سے مزید سوالات کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ اس شام تقریریں ختم ہونے اور سامعین کے لابی میں سے ہو کر رخصت ہو جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ کتابوں کی فروخت حیران کن تھی یعنی دو ہزار قرآن اور نو سو میری کتابیں فروخت ہوئی تھیں۔

اس شام بعد میں ایک مقامی کاروباری (بزنس مین) کے گھر رات کا کھانا کھانے کے بعد احمد دیدات نے واضح کیا کہ انہوں نے قرآن کو عالمی حکومت کا آئین کیوں کہا تھا۔

"قرآن صرف نماز کے اوقات ہی نہیں بتاتا بلکہ روزمرہ زندگی کے لیے تفصیلی ضوابط پیش کرتا ہے۔ یہ خاندان، پڑوسیوں اور دنیا کے تمام افراد کے ساتھ تعلقات نبھانے کا لائحہ عمل مہیا کرتا ہے۔ یہ ایک عالمی حکومت کے لیے مطلوبہ تمام ضوابط فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک خوب منظم اور ہمہ گیر نظام پیش کرتا ہے جس میں تمام نسلوں اور مردوزن کے لیے مساوی طور پر انصاف اور رواداری غالب ہوتی ہے۔"

اسی وقت میں نے اپنے محسوسات اپنے تک ہی رکھے تھے تاہم ان کی وضاحت نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ مجھے کبھی توقع نہیں تھی کہ کوئی حکومتی نظام کسی مقدس کتاب سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ حقیقت تھی کہ میں نے ساری زندگی امریکی آئین کا انسانی تاریخ میں انسانوں کے تشکیل دیئے ہوئے بہترین نظام حکومت کی حیثیت سے احترام کیا تھا۔ کیا احمد دیدات امریکی آئین کو ڈبونا چاہتے تھے؟ میں اپنی سادگی میں قرآن کو مسلمانوں کے لیے بے حد اہم اور اس کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے لیے باعث فیضان تو تصور کرتا تھا لیکن میں کبھی اسے ایک ہمہ گیر عالمی حکومت کی بنیاد تصور نہیں کرسکتا تھا۔

اس رات اپنے ہوٹل واپس آتے ہوئے میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ اس جنوبی افریقی کا مدعا کیا تھا؟ کیا وہ اسلام کا جھنڈا لہراتی ہوئی ایک ایسی عالمی حکومت کی پیش گوئی کررہا تھا، جس میں قرآن آئینی بنیاد ہوگا؟ یا اس کا بیان ان عیسائی پادریوں جیسا تھا جو یقین کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کا پرچار کرتے ہیں مگر اتنی لمبی عمر پانے کی توقع نہیں کرتے کہ اس واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں؟ کیا احمد دیدات نے اس امید کے اظہار کے لیے اس ڈرامائی انداز کو اختیار کیا تھا کہ سلام کسی جھنڈے کو بھی کیا جائے، دنیا میں قرآنی اصول نافذ ہوں گے؟ ان اصولوں کو کس طرح نافذ کیا جائے گا؟

وہ جس عالمی تنظیم کا تصور کررہے ہیں کیا وہ جمہوری ہوگی یا آمرانہ؟ احمد دیدات بہت زیادہ سفر کرچکے ہیں اور انہوں نے دوسری مذہبی روایتوں کے تنوع اور قوت کا مشاہدہ کیا ہوا ہے اور انہیں اس حقیقت کا ضرور ادراک ہوگا کہ قرآن کو پوری دنیا کے لیے حکومت کی بنیاد بنانے کا امکان کس قدر بعید خیال ہے، افق سے بھی پرے کا۔

اگلی صبح ناشتے پر مجھے پتا چلا کہ احمد دیدات کیپ ٹاؤن سے روانہ ہوگئے ہیں اور اگلے روز تک مزید تبادلۂ خیال کے لیے عدم دستیاب ہیں۔ اسی اثنا میں ان کے عملے کے ایک سینئر رکن نے میرے تفکرات بھانپ لیے۔ ڈربن میں واقع تنظیم کے ہیڈکوارٹر کا دورہ کرتے

ہوئے انہوں نے کہا: ''میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے ''اعلانِ آزادی'' کے ابتدائی الفاظ ہر جگہ کے مسلمانوں کے لیے بہت قابل قدر ہیں۔ یہ اعلان کرتے ہوئے کہ تمام افراد خدا کی نگاہ میں برابر ہیں اور انہیں خدا نے مساوی حقوق عطا کیے ہیں' یہ دستاویز ان جذبات کا اظہار کرتی ہے جو اسلام میں بہت اہم ہیں اور تمام مسلمان انہیں عزیز جانتے ہیں۔''

میں قرآن یا رسول اللہ حضرت محمد ﷺ کی حیات و تعلیمات کے بارے میں بہت کم جانتا تھا جبکہ شریعت کے بارے میں تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور افسوس آج میں احمد دیدات سے وضاحت نہیں حاصل کر سکتا کیونکہ 1996ء میں آسٹریلیا کے ایک تبلیغی دورے کے بعد ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور اب وہ بولنے اور لکھنے سے قاصر ہیں۔

میں نے 1999ء کے اوائل میں فیصلہ کیا کہ اینڈریو پیٹرسن سے دریافت کروں کہ جنوبی افریقی رہنما کے کہنے کا مقصد کیا تھا۔ انہیں یقین ہے کہ احمد دیدات نے امریکی نظام حکومت کو حقیقی اسلامی ریاست سے ہم آہنگ پایا:

''قرآن و شریعت اور امریکی آئین میں بہت سی اہم چیزیں مشترک ہیں۔ ان تینوں میں انسانی مساوات' انسانی حقوق کے فروغ' جان و مال کے تقدس' لوگوں کی رائے کے تحت حکومت نیز لوگوں کے مشورے سے حکومتی فیصلہ سازی کے اصول مشترک ہیں۔ قرآن ایک ایسے جمہوری نظام کی بات کرتا ہے جس میں عوام سے باقاعدہ اور بھرپور مشورہ لیا جاتا ہے۔ اس نظام میں لوگ اپنے رہنما خود منتخب کرتے ہیں اور اتفاق رائے سے پالیسی بنانے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔''

چند دن بعد ایک اہم اتفاق کے تحت نور ناصری نے عوامی معاملات کے ایک مبصر اور تیونس کی حزب اختلاف کی جماعت النہضہ کے ایک قابل احترام رہنما راشد الغنوشی کا ایک حوصلہ بخش بیان مجھے بھجوایا۔

''احیا کی معاصر تحریک نے مسلمانوں کو دوبارہ یہ جاننے کا اہل بنا دیا ہے کہ اسلام آج کی دنیا میں کارآمد ہے۔ نہ تو یہ اسے مجموعی طور پر مسترد کرتا ہے اور نہ ہی اس میں کھو جانے کی تائید کرتا ہے۔ یہ پیش رفت اب مسلمانوں کو ایک ایسے جدید سیاسی نظام (آرڈر) کی بات کرنے کی اجازت دیتی ہے جو حکومت کے مطلق اقتدار کو محدود کرنے والی آئینی بنیادوں کے مطابق لوگوں کی رائے سے جواز حاصل کرتا ہے۔''

اس بیان میں مزید کہا گیا کہ یہ تحدیدات (Limitations) شخص کے حقوق

اور عزت کا تحفظ کرتی ہیں ''خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم' عورت ہو یا مرد۔'' [3]

مزید تسلی اور حوصلہ ''اسلامی دنیا کی ساخت اور ڈھانچہ'' (The Nature and Structure Of Islamic World) کے مصنف اور اسلام پر ایک سند (اتھارٹی) ڈاکٹر رالف بریبینٹی سے حاصل ہوئی:

''جغرافیائی اعتبار سے بکھری ہوئی ایک اہم تحریک چل رہی ہے جس کا مقصد اسلام کو عصر حاضر سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس کی دوبارہ تعبیر کرنا ہے......ایسی اصلاحات کی طرف مائل افراد اردن' مصر' ترکی' الجیریا اور ایران میں موجود ہیں۔ وہ مغرب کے تعلیم یافتہ پیشہ ور افراد ہیں۔ وہ اسلام سے قطع تعلق نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو سچے اور عملی مسلمان ہیں۔'' [4]

ڈاکٹر آغا سعید' جو علم سیاسیات کے ایک یونیورسٹی پروفیسر اور مسلمانوں کی سیاسی فعالیت کے حامی ہیں' یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کے پیروکار امریکی آئین سے خوش ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی امریکی حکومتی نظام کے ڈھانچے یا اصولوں میں بنیادی تبدیلی کا حامی نہیں۔

ڈاکٹر سعید کہتے ہیں کہ درحقیقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ شکوہ اس بات پر ہے کہ امریکی قیادت آئین اور اعلانِ آزادی میں بیان کیے گئے اصولوں کو سختی سے اور یکساں طور پر نافذ کرنے میں ناکام رہی ہے۔

لاس اینجلس کے ایک ہوٹل کے کمرے میں لیے گئے ایک طویل انٹرویو میں انہوں نے اس تصور کو رد کیا کہ مسلمان' یا کوئی اور مذہبی گروہ' کسی روز امریکہ پر تسلط جما لے گا:

''ایسا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اگر انہوں نے تسلط جما بھی لیا تو مجھے یقین ہے کہ وہ آج بروئے عمل آنے والے اصولوں اور ڈھانچے ہی کو برقرار رکھنا چاہیں گے۔ لیکن تسلط؟ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھار دیا جانے والا یہ انتباہ کہ مسلمان امریکہ کے لیے ایک اندرونی خطرہ ہیں' مضحکہ خیز ہے۔ اس سے مجھے وہ پرانی چیخ پکار یاد آتی ہے کہ روسی آرہے ہیں اور یہ کہ ہمیں امریکہ کو کمیونسٹ انقلاب سے بچانا ہے۔

''ہوسکتا ہے کسی زمانے میں زیادہ سے زیادہ آٹھ یا دس مسلمان امریکی ایوانِ نمائندگان کے لیے منتخب ہو جائیں۔ یہ تعداد کل ارکان کا دو فیصد بنتی ہے۔ اس وقت تو کوئی مسلمان کانگرس کا رکن نہیں ہے۔ تاہم مسلمان نظام کا حصہ بننا پسند کریں گے' حتیٰ کہ ایک ایسا

حصہ بھی جو عددی اعتبار سے بہت چھوٹا ہو۔ انہیں موجودگی حاصل کرنی چاہیے۔ کانگرس میں ہونا اہم ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ مسلمانوں کو انسانوں کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے' یک رخے تصور کے طور پر نہیں۔

''امریکی مسلمان انسانی وقار' قانون کے جائز عمل' قانون تک سب کی مساوی رسائی' قانون کے آگے سب لوگوں کی برابری' مواقع کی مساوات کے امریکی اصولوں کے مکمل طور پر حامی ہیں۔ میں ان اصولوں کی پوری حمایت کرتا ہوں۔ میں ان میں سے کسی کو بھی تبدیل کرنا پسند نہیں کروں گا بلکہ میں تو دل سے ان کا نفاذ دیکھنا پسند کروں گا۔

''بہت سے مسلمان' کئی غیر مسلموں کی طرح چاہتے ہیں کہ ان اصولوں کو ہر کسی کے لیے زیادہ ہمہ گیری کے ساتھ اور یکساں طور پر نافذ کیا جائے۔ صرف چند مسلمان ہی ایسا کہیں گے کہ وہ ڈھانچے اور بنیادی اصولوں میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے چند لوگ کہیں کہ وہ ایک شرعی کونسل کے قیام کو پسند کریں گے جو امریکہ میں اسلامی قانون کو نافذ کرے تاہم ایسے بیانات بھی پوری طرح قابل یقین نہیں ہیں۔ میں تو ایک بھی ایسے مسلمان کو نہیں جانتا جو امریکی حکومت کے بنیادی ڈھانچے اور اصولوں کو تبدیل کرنا چاہتا ہو۔'' 4

مسلمان علما (سکالرز) اس بات پر متفق ہیں کہ ایک حقیقی اسلامی ریاست مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے حقوق کی بھی پوری حفاظت کرے گی۔ ڈاکٹر جان ایل ایسپوزیٹو (Dr.John L.Esposito) کا مرتب کردہ ''انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ'' بتاتا ہے کہ:

''آج کی بیشتر مسلمان ریاستوں کے آئین میں بلا لحاظ مذہب' جنس اور نسل تمام شہریوں کی برابری کا اصول موجود ہے...... (اگرچہ) کچھ خاص عسکریت پسند مسلمان گروہ...... غیر مسلموں کے حوالے سے معاندانہ بدگمانی کی وکالت کرتے ہیں۔''

لبرل یا جدیدیت پسند مسلمان رہنما ایسے ہی خیالات پسند کرتے ہیں۔

''اسلام مسلمانوں کو جدید عقلیت کی بنیاد پر اپنی حکومت قائم کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ نیز حکومت کے ان اصولوں کی بنیاد پر جو قوموں کے تجربے سے آزمائے اور ثابت کیے جا چکے ہیں۔'' 5

انسائیکلوپیڈیا کے اسی حصے میں قرآن سے بھی حوالہ درج کیا گیا ہے:

''مذہب میں کوئی جبر نہیں ہے'' (قرآن 2:256)

اس کے بعد مزید لکھا گیا ہے:

''اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ شہری حقوق و فرائض کے حوالے سے مسلمان اور غیر مسلم مساوی ہیں...... لبرل (یا جدیدیت پسندوں) کے مطابق دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے ہوئے ان بنیادوں پر معاشرتی لین دین اور تعلقات قائم کرنے کا چیلنج درپیش ہوتا ہے جو تغیر پذیر حالات کے مطابق ڈھلنے کی اجازت دیتی ہیں...... یہ سوچ اور یہ طرز حیات اسلام کے مذہبی فلسفے سے مماثل ہوسکتا ہے۔'' 6

یہ حوالے واضح کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی بنیادی لچک کا حامل ہے جو اس بدلتے ہوئے وقت کے مطابق ڈھلنے کے قابل بناتی ہے۔ مصنفہ رابن رائٹ (Robin Wright) اکیسویں صدی کے پہلے پچیس برسوں کے دوران عرب دنیا میں اسلام کے اثر و نفوذ ـــــ اور انفرادی آزادی میں اضافے کی پیش گوئی کرتی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں احمد دیدات نے میرے سامنے جس خیال کا اظہار کیا تھا' اس سے ملتی جلتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے وہ اسلام کو موجودہ حکومتوں کا ''نہایت ہمہ گیر متبادل'' قرار دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''یہ ایک قانونی فورم (Forum) اور ایک جائز ڈھانچہ مہیا کرتا ہے۔'' نیز ''یہ ایسا واحد توحید پرست مذہب ہے جو روحانی عقیدوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کو چلانے والے مخصوص قوانین بھی پیش کرتا ہے۔'' وہ تبدیلی کے اس عمل کے دوران انفرادی آزادی کے بڑھنے کی پیش گوئی بھی کرتی ہیں: ''سچا صاحب ایمان بننے کے لیے انسان کو مذہب کے معاملے میں ضرور آزاد ہونا چاہیے۔''

وہ اس فلسفے کو دور حاضر کے ایرانی مسلمان اصلاح پسندوں (ریفارمرز) میں مقبول پاتی ہیں اور لکھتی ہیں:

''آزادی عقیدے سے مقدم ہوتی ہے ـــ ایک ایسے مذہب کے لیے کواہم جست' جس کے نام کے ہی معانی ''اطاعت'' ہوں۔ آخری بات یہ کہ اسلام جامد نہیں ہے بلکہ یہ تو تبدیلی کا محرک ہے۔'' 7

میں رائٹ کی پیشگوئی میں اس امید کی کرن پاتا ہوں کہ مسلمان ممالک لوگوں کو مذہبی وابستگی کے انتخاب کی آزادی دیں گے۔ اگر ان کی پیش گوئی سچ نکلی تو آنے والے عشروں میں یہ حکومتیں کسی حد تک امریکی نظام سے زیادہ قریب ہو جائیں گی۔ مذہبی آزادی اور دوسروں کے مذہب کے لیے رواداری امریکی نظام (سٹرکچر) کے بنیادی اجزا ہیں۔

ٹیکساس کے مسلمان لیڈر عنایت لالانی ایم۔ڈی اسلام میں جدیدیت پسندوں' جن کے وہ حامی ہیں' اور روایت پسندوں میں ایک نظریاتی کشمکش سے خبردار کرتے ہیں۔ وہ اس کشمکش کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین کشاکش سے زیادہ لحاتی تصور کرتے ہیں اور یہ خصوصیات بیان کرتے ہیں:

''اپنے آپ کو عالم کے طور پر پیش کرنے والے کچھ مسلمان ایسے بیانات دیں گے کہ ''جمہوریت غیر اسلامی'' ہے یا ''اسلام میں انسانی حقوق کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' بہرحال اسلام کو بدنام کرنے والے لوگ ایسے بیانات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

''مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو کوئی متبادل حل پیش کیے بغیر' مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حوالے سے' ہر عملیت پسندانہ سوچ کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ مذہبی عقائد کے حوالے سے بہت زیادہ حساس ہیں اور اگر آپ ان کے پہلے سے طے شدہ خیالات سے اتفاق نہ کرنے والی رائے کا اظہار کریں تو وہ فوراً آپ کے عقیدے کو زیر بحث لے آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ اپنا ''علم'' قرآن کی بجائے روایات سے اخذ کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی روایات دوسروں کے حقوق کو غصب کرتی ہیں اور واضح طور پر غیر اسلامی ہیں۔ ان میں سے کچھ مسلمان ''علما'' دیانت داری کے ساتھ یقین کرتے ہوئے کہ وہ اسلام کے ساتھ مخلص ہیں' اسلام دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔'' [8]

اینڈریو پیٹرسن بھی اس سے ملتے جلتے مسئلے کو دیکھتے ہیں۔ ''تمام مسلمان روشن خیال نہیں ہیں۔ میں تو کبھی خالصیت پسندوں (Purists) کے ذہنوں تک رسائی نہیں پا سکوں گا۔ ان میں سے کچھ لوگ مسلمانوں کو مغرب سے الگ تھلگ کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔''

انہیں یقین ہے کہ خالصیت پسندوں کو رہنمائی حاصل کرنے کے لیے چارلس ڈارون سے استفادہ کرنا چاہیے:

''میں کبھی چارلس ڈارون کے نظریات کا مشتاق نہیں رہا تاہم میں اس کی اس بات سے متفق ہوں کہ ''نہ تو مضبوط ترین نوع زندہ رہتی ہے نہ ہی ذہین ترین' بلکہ وہ' جو کہ تغیر کو سب سے زیادہ قبول کرنے والی ہوتی ہے۔'' مجھے یقین ہے کہ اس کے بیان کا اطلاق ہر مقام پر ہوتا ہے اور ہر شخص کو کسی بھی شے کی مخالفت کرنے سے پہلے غور و تدبر ضرور کرنا چاہیے۔ ڈارون کا بیان مجھے بائبل کا دعویٰ یاد دلاتا ہے: ''عجز والوں کو سلطنت ملتی ہے'' نیز اس سے رسول خدا حضرت محمد ﷺ کی وہ ہدایت یاد آتی ہے جو آپ ؐ نے ایک روز اپنے صحابہ ؓ کے ساتھ کہیں

جاتے ہوئے کی تھی۔ آپؐ نے ان کو تلقین کی تھی کہ سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔"

رالف بریبینٹی لکھتے ہیں:

"یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ایسے وقت جب اسلام نو آبادیاتی تسلط سے آزاد ہے اور جب اس کے بعض طبقوں کو امارت و ثروت نصیب ہے' اسے داخلی جھگڑوں نے پارہ پارہ اور طاعون زدہ کر دیا ہے......" 9ے

جب میں سوچتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو امریکہ میں سیاسی تسلط حاصل ہو گیا تو وہ امریکی نظام حکومت کے ڈھانچے میں کیسی تبدیلیاں لائیں گے تو درج بالا تفکرات حاوی ہوتے ہیں۔

مجھے احمد دیدات سے ہونے والی گفتگو دوبارہ یاد آ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ امریکی اعلان آزادی اور امریکی آئین میں پیش کیے گئے اصولوں کو قرآن میں دیئے گئے اصولوں سے ہم آہنگ اور موافق تصور کرتے تھے۔ اس سے ملتا جلتا نتیجہ اس حقیقت سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے جسے ایسپوزیٹو کے انسائیکلوپیڈیا میں یوں بیان کیا گیا ہے: "اب بیشتر مسلمان ریاستوں کے آئین تمام شہریوں کے بلا لحاظ مذہب' جنس اور نسل مساوات کے اصولوں کی توثیق کرتے ہیں۔" میں نے جو کچھ دیکھا' پڑھا اور سنا ہے اس سے یہ سمجھا ہے کہ اسلامی حکومتی اصول امریکی آئین کے لیے خطرہ ہونے کی بجائے اس سے ہم آہنگ ہیں۔

جب احمد دیدات سے 1989ء میں میری گفتگو ہوئی تھی تب جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کا غلبہ تھا۔ اس زمانے میں ان کی قوم کی حکومت کا بنیادی ڈھانچہ قرآن اور امریکی آئین ہر دو کے مثالیوں (آئیڈیلز) اور اصولوں کی صریح خلاف ورزی اور کاٹ کرتا تھا۔

ان کے ملک کی حکومت پر ہنوز غلیظ تعصب کا غلبہ تھا اور وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے محتاط رہتے تھے۔ انہوں نے نجی گفتگو تک میں حکومتی پالیسی کے بارے میں کھل کر بیان دینے سے گریز کیا تھا۔ اس زمانے میں اگرچہ سفید فام برتری پسندوں کی درشت سیاست نے جنوبی افریقہ کو حقیقتاً باقی ساری دنیا سے الگ تھلگ کر دیا تھا' اس کے باوجود انہوں نے اس اعتماد کا اظہار کیا تھا کہ مساوات اور رواداری کے اصول آخرکار دنیا بھر میں رائج ہو جائیں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس طرح سفید فام اقلیت کی وہ پالیسیاں' جنہوں نے دیدات اور اکثریت میں موجود دوسرے جنوبی افریقی شہریوں کو ووٹ دینے سے روک رکھا تھا' آخرکار ختم ہو جاتی تھیں۔

دیدات کے جنوبی افریقہ میں نسل پرستانہ نظام کے تحت دوسرے درجے کے شہری

کی حیثیت سے تجربے کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ وہ کبھی کسی ایسے نظام کی حمایت نہیں کر سکتے جو کسی بھی انسان کو دوسرے درجے کے انسان کی حیثیت دیتا ہو۔ مجھے یقین ہے دیدات کو اس بات پر یقین ہے' جس طرح مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں فرداً فرداً حکومتیں اور بین الاقوامی تنظیمیں قرآن اور امریکی آئین میں پیش کیے گئے مساوات' عدل' رواداری اور ہمدردی کے اصولوں کو بتدریج فروغ اور ترقی دیں گی۔

جب امریکی مسلمان شہریت کا حلف اٹھاتے ہیں تو امریکی آئین کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور مجھے محض چند ہی ایسے مسلمان ملے ہیں جو پیدائشی امریکی شہری بھی ہوں اور اس عہد کی پاسداری سے انکار کرتے ہوں۔ ڈینور نگیٹس (Denver Nuggets) کے لیے کھیلنے والے باسکٹ بال کے مشہور کھلاڑی محمد عبدالرؤف نے جب اسلام قبول کیا تو انہوں نے ابتدا میں پرچم کو سلامی دینے سے انکار کر دیا تاہم جب مسلمان رہنماؤں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسا کرنے سے اسلامی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تو انہوں نے اپنے فیصلے میں تبدیلی کر لی اس کے برعکس ایک عیسائی تنظیم ''سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹس (Seventh Day Adventists) کے ارکان کا ایمان ہے کہ انہیں صرف اور صرف خدا کی اطاعت کرنی چاہیے۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے تمام مسلمان شناسا اس حقیقت کے باوجود کہ امریکی فوجداری نظام انصاف قرآن سے فیضان یافتہ ''سنت رسولؐ '' سے مختلف ہے' امریکی پرچم' قوانین اور آئین کے تحت اپنے فرائض کو تسلیم کرتے اور ان کا احترام اور اطاعت بغیر تحفظات کے کرتے ہیں۔

اسلام میں زنا کی سزا موت اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تاہم وہ ان سزاؤں پر عمل درآمد سے پہلے عینی شاہدوں کی گواہی یا رضاکارانہ اعتراف جرم کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مجرم کی نیت دیکھ کر فیصلہ کیا جائے نیز ان سزاؤں پر عمل درآمد کے معاملے میں عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔ مثال کے طور پر کسی ایسے شخص کو سزا نہیں دی جا سکتی جس نے خوراک چوری کی ہو اور وہ مرد یا عورت یہ ثابت کر دے کہ یہ چوری اس نے بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی۔

صرف چند مسلمان ممالک ــــ مثلاً سعودی عرب' پاکستان اور سوڈان ــــ ہی میں قرآن میں بیان کردہ سخت ترین سزائیں رائج ہیں۔ دیگر مسلمان ملکوں میں ایسے نظام ہائے قوانین ہیں جو مغربی اصولوں سے اثر پذیر ہیں۔ جن ملکوں میں عیسائی یا دوسرے مذاہب

کے پیروکار اکثریت میں ہوں وہاں مجرموں کو اسلامی قانون کے تحت سزا نہیں دی جا سکتی تاہم نور ناصری لکھتے ہیں کہ "ہر شخص اس بات سے متفق ہے کہ اسلامی سزاؤں کا امتناعی اثر نہایت کارگر ہے۔"

پالیسی اور مقتدرہ کے دیگر شعبوں میں بھی اسلام اور امریکی حکومتی روایات میں بنیادی اہداف مشترک ہیں۔ دونوں ہی تمام انسانوں کے لیے امن، انصاف اور انفرادی آزادی کے لیے مخلص ہیں۔ مسلمان اعلانِ آزادی کی اس شق کو مانتے ہیں کہ تمام انسانوں کو برابر تخلیق کیا گیا ہے۔ اسلامی روایت کی جڑیں اس فلسفے میں ہیں کہ حکومت کو عوام کے سامنے لازماً جواب دہ ہونا چاہیے، جنہیں اسلام زمین پر خدا کے نائبین کہتا ہے۔[10]

اپریل سوکت لکھتی ہیں: "بیشتر مسلمان امریکہ یا مغربی دنیا کو جمہوریت کے موجد یا محافظ نہیں مانتے۔ اس کے برعکس وہ اسے اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ نہ ہی وہ مسلمانوں کو مغربی آدرشوں کی نقل کرنے والے مانتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ اکثر تیقن کے ساتھ کہتے ہیں کہ امریکہ اسلامی اصولوں کا اطلاق کر رہا ہے۔"

مجھے یہ تجسس تھا کہ اگر امریکی حکومت کی بنیادی دستاویزات کو تحریر کرتے ہوئے قرآن کا کوئی اثر رہا ہے تو اس سے آگاہ ہوؤں۔ میں نے لائبریری آف کانگرس سے کہا کہ وہ اعلانِ آزادی کو تحریر کرنے والے تھامس جیفرسن اور جیمز میڈیسن کے کاغذات تلاش کرے جن کے نوٹس امریکی آئین کی تیاری کے اجلاسوں کا مکمل ترین ریکارڈ ہیں۔ میڈیسن کے نوٹس میں اسلام یا قرآن یا کسی دوسرے مذہب کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ مزید برآں اس امر کی بھی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ان کی لائبریری میں قرآن موجود تھا۔ جیفرسن کی لائبریری میں، جو اپنے عہد کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی، قرآن کا ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ 1764ء میں شائع ہونے والا جارج سیل (George Sale) کا ترجمہ ہے جسے "عمومی طور پر محمد ﷺ کا قرآن (Alcoran of Mohammad) کہا جاتا تھا۔"[11] اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ جیفرسن نے اعلانِ آزادی کو لکھتے ہوئے اس کے متن سے استفادہ کیا ہو۔

جو لوگ اس اعلان سے پریشان ہیں کہ امریکی آئین میں پیش کیے گئے حکمرانی کے اصول قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان یہ مانتے کہ امریکی حکومت کا ڈھانچہ اسلامی ریاست کے مثالیے کے بنیادی اصولوں سے سنگین حد تک متصادم ہے تو وہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں امریکی شہریت کے خواہاں کیوں ہوئے؟

امریکی شہریت حاصل کرنے کے طویل اور مبارزت طلب سفر کو اختیار کرتے ہوئے لاتعداد مسلمانوں نے عملاً امریکہ کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کئی بلکہ بیشتر مسلمانوں کو یقین ہے کہ امریکہ ایک ایسے حکومتی ڈھانچے کا حامل ہے' جو حکومت کی دوسری صورتوں کی نسبت اسلامی ریاست کے مثالیے سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ مسلمان تارکین وطن کا رخ امریکی ساحلوں کی طرف ہوتا ہے۔

ایک غیر مسلم ملک امریکہ کے لیے یہ کشش کیوں' جس کا حکومتی ڈھانچہ دنیا میں سب سے زیادہ سیکولر ہے اور جس کی کل آبادی میں مسلمانوں کی تعداد تین فیصد سے بھی کم ہے؟ انسان عاقلانہ انداز میں یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ امریکہ کو ایک ایسے مقام کے طور پر منتخب کرتے ہیں جو معاشی مواقع کی سرزمین ہے اور جو ان کے خاندانوں کے بسنے اور مذہب پر عمل کرنے کے لیے ایک اچھی جگہ ہے۔ یہاں سے جانے سے پہلے ہر کوئی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لیے امریکہ کی طویل اور شاندار جدوجہد نیز رواداری اور انسانی حقوق سے اس کی وابستگی کی تھوڑی بہت آگاہی حاصل کر جاتا ہے۔

ایک مسلمان رہنما' جو گمنام ہی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں' بیان کرتے ہیں: ''مسلمان اکثر اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انہیں سیاسی جبر واستبداد کے غلبے والے اپنے آبائی وطن کی نسبت یہاں اسلام پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔'' انہیں یقین نہیں ہے کہ اگر مسلمان یہ سنیں گے کہ امریکی حکومت مسلمانوں کو دنیا میں سب سے زیادہ تحفظ دے رہی ہے تو انہیں صدمہ پہنچے گا یا وہ مشتعل ہو جائیں گے۔

بہر حال امریکہ کو ایک اسلامی ریاست نہیں کہا جا سکتا اور اگر ایسا ہو تو اس اعلان سے غیر مسلموں میں یقیناً زبردست منفی ردعمل ابھرے گا اور ان کے ساتھ ساتھ کچھ مسلمانوں میں بھی۔ تاہم غور وفکر کرنے کے بعد سب کو یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ امریکی نظام قرآن میں بیان کردہ اسلامی ریاست کے بنیادی عناصر پر ہی مشتمل ہے۔ ابراہام لنکن نے اپنے گیٹس برگ (Gettysburg) والے مشہور خطاب میں جب یہ کہا تھا ''عوام کی حکومت' عوام کے ذریعے' عوام کے لیے'' تو انہوں نے حقیقی اسلامی ریاست کی روح کو بیان کیا تھا۔ اسلام اور امریکی آئین دونوں ہی ایسے قائدین کا تقاضا کرتے ہیں جنہیں عوام نے منتخب کیا ہو' جو عوامی رائے سے منتخب ہونے والی اسمبلی کے اشتراک سے کام کریں' جو نسل' مذہب' قومیت یا جنس سے بالاتر ہو کر ہر انسان کو خدا اور قانون کے روبرو مساوی تصور کریں اور جو ہر شخص کے لیے مساوی

طور پر تحفظ اور عدل کا اہتمام کریں۔

مذکورہ بالا جائزے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں امریکی حکومتی نظام کو مذہب کے دائرے میں لانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ حکومت لازمی طور پر دنیوی ہوتی ہے اور بیشتر لوگوں کے لیے مذہب سے کم اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ تاہم حکومت مذہب کو بروئے عمل لانے والے اقدامات پر اثر انداز ہوسکتی ہے اور مذہبی وابستگی کے لئے اہمیت رکھنے والی انفرادی آزادیوں کو مستحکم یا محدود کرسکتی ہے۔ امریکہ کے بانیوں نے دانائی کے ساتھ مذہب اور ریاست کو الگ الگ کر دیا تھا لیکن اسی حکمت و دانائی کے ساتھ مذہبی وابستگی کی آزادی کی ضمانت بھی فراہم کردی تھی۔

امریکہ کو دوسری قوموں سے جو شے ممتاز کرتی ہے وہ ہے بنیادی اصولوں کے نفاذ کے لیے اس کی حکومت اور بیشتر شہریوں کی بھرپور اور مخلصانہ جدوجہد۔ ان اصولوں میں مذہبی رواداری سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

یہ ہمت افزا خیالات امریکہ میں اسلام کے حوالے سے حاوی غلط تصورات کے سلسلے میں میری آسودہ خاطری کا باعث نہیں بنتے۔ مجھے ڈر ہے کہ بیشتر امریکی اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مسلمان ایک اس قسم کی حکومت قائم کرنا پسند کرتے ہیں جو غیر مسلموں کی تحقیر کرے اور ہمارے معاشرے کے ہر دلعزیز اصولوں کو نقصان پہنچائے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس غلط فہمی کے شکار لوگ بہت بااثر ہیں۔

میرا یہ بھی خیال نہیں ہے کہ تمام امریکی مسلمان امریکی حکومت یا آئین کو کامل تصور کرتے ہیں۔ دوسرے شہریوں کی طرح' بشمول میرے' امریکی طرز حیات کے فوائد سے لطف اندوز ہوتے ہوئے' بہت سے مسلمان چاہتے ہیں کہ قانون کا نفاذ بہتر ہو خواہ اس کے لیے آئین میں دو ایک ترامیم ہی کیوں نہ کرنی پڑیں۔

آغا سعید ایک انتہائی اہم مسئلے کا ذکر کرتے ہیں یعنی ہمارے معاشرے کے اصولوں کا بھرپور اور مخلصانہ اطلاق۔ انہوں نے درست نشاندہی کی ہے کہ ہماری حکومت سے امریکہ کے تمام شہریوں پر ان اصولوں کے اطلاق میں کوتاہی ہوئی ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مذہبی رواداری بھی ایسے ہی مخلصانہ اطلاق کی حق دار ہے۔ تاہم عدم رواداری مسلمانوں' عیسائیوں اور یہودیوں کے رویے میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ آئین یا مذہبی متن میں اپنے اصولوں کو اہداف کے طور پر بیان کردینا ہی کافی نہیں ہوتا ہے۔

کسی حکومت یا مذہب کی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ وہ روزمرہ زندگی پر بنیادی اصولوں کا بھرپور اطلاق کرے۔ سابقہ سوویت یونین اور اس جیسی ہنوز برقرار دیگر آمرانہ حکومتوں نے اپنے قوانین میں تو اظہار کی آزادی' مذہب کی آزادی' آزادانہ انتخابات اور دوسری آزادیوں کی ضمانت دی ہوتی ہے لیکن ان کے اطلاق میں ناکام رہتی ہیں۔ ایسی حکومتوں کے بنیادی حقوق کے وعدے کھوکھلے ہوتے ہیں۔

حواشی

1. یو ایس اے ٹوڈے' مورخہ 2000-1-18 اور 2000-1-20
2. انٹرویو' 1999-12-1
3. پیپلز ڈیلی' 1999-7-20 (قاہرہ)
4. ''دی نیچر اینڈ سٹرکچر آف دی اسلامک ورلڈ'' از رالف بریبینٹی' صفحہ 83
5. ''ماڈرن اسلامک ورلڈ'' مرتبہ جان ایل ایسپوزیٹو' جلد سوم' صفحات 111-110
6. ایضاً' جلد اول' صفحات 359-358
7. ٹائم' 2000-5-2' صفحہ 109
8. انٹرویو' 1999-5-2
9. ''دی نیچر اینڈ سٹرکچر آف دی اسلامک ورلڈ'' از رالف بریبینٹی' صفحہ 85
10. عنایت اللالانی سے انٹرویو' 2000-2-6
11. کیٹالاگ آف دی لائبریری آف تھامس جیفرسن' جلد دوم (یونیورسٹی پریس آف ورجینیا)' صفحہ 90

چھٹا باب

اسلام میں عورت کا مقام اور پردہ

اگر چہ اسلام اور دوسرے مذاہب کے اصول اور تقاضے یہ ہیں کہ عورتوں کے حقوق اور وقار کا تحفظ اور احترام کیا جائے پھر بھی معاشرے میں بلا لحاظ نسل، قومیت، معاشی رتبہ یا مذہب عالمی سطح پر ان کی خلاف ورزی فروغ پا رہی ہے۔

بالٹی موز میری لینڈ میں واقع جانز ہاپکنز سکول آف پبلک ہیلتھ کی جنوری 2000ء میں جاری کردہ ایک رپورٹ میں حیرت ناک نتائج پیش کیے گئے ہیں کہ: ''دنیا میں ہر تیسری عورت کے ساتھ یا تو زنا ہوتا ہے یا اسے مارا پیٹا جاتا ہے یا اس کے ساتھ غلط برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔'' امریکہ سمیت بیس ملکوں میں مطالعہ کے بعد حاصل ہونے والے نتائج کی بنیاد پر اس دستاویز میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اپنے انٹرویو سے پہلے 70 فیصد عورتوں نے کبھی کسی کو اس غلط سلوک کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔[1]

ایسا لگتا ہے کہ یہ امریکیوں کی عادت بن گئی ہے کہ کچھ مسلمان ملکوں میں عورتوں کے ساتھ برتے جانے والے شدید امتیاز کو اس بات کے ثبوت کے طور پر استعمال کریں کہ اسلام عورتوں سے بدسلوکی کی اجازت دیتا ہے۔ ایسا امتیاز ــــ اکثر و بیشتر بہت شدید ــــ موجود تو ہے تاہم مسلمان رہنما اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عورتوں پر ہر قسم کا جبر اسلامی قوانین اور فلسفے کی خلاف ورزی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس امتیاز کا سرچشمہ قرآن یا سنت نہیں بلکہ قبائلی رسمیں ہیں۔

تاریخ میں اسلام نے عیسائیت اور یہودیت کی نسبت عورتوں کو بہت زیادہ آزادی عطا کی ہے۔ قاہرہ میں واشنگٹن پوسٹ کے بیورو چیف کی حیثیت سے تین سال کام کرنے والے یہودی صحافی تھامس ڈبلیو لپ مین لکھتے ہیں: ''ایک ایسے معاشرے پر جس میں

عورتیں املاک ہوتی تھیں' انہیں معمولی اشیا کی طرح برتا جاتا تھا' اکثر غلامی جیسی صورت حال میں رکھا جاتا تھا' قرآن نے ایسے اوامر ونواہی نافذ کیے جنھوں نے ان بدترین زیادتیوں کا قلع قمع کر دیا' عورتوں کے جائیداد کے حقوق کی ضمانت دی اور مردوں کو ہدایت کی کہ وہ عورتوں کے ساتھ مہربانی اور فیاضی کا برتاؤ کریں...... قرآن نے عورتوں کی قانونی حیثیت کے بارے میں جو احکامات دیئے ہیں وہ اس کے نزول کے دور سے آگے کے ہیں اور اسلامی قانون عورتوں کو بعض ایسے حقوق عطا کرتا ہے جو انہیں مغربی قانونی ضابطوں سے زیادہ آزادی بخشتے ہیں...... قرآن اور حدیث نے عورتوں کی عزت واحترام کو یقینی بنانے والے ایسے قوانین رائج کیے جنھیں اسلام سے پہلے کے معاشرے نے نظر انداز کر دیا تھا نیز اس نے خاندان کے استحکام پر زور دیا۔'' 2 ایک عیسائی رہنما ولیم بیکر لکھتا ہے: ''جب ہم اسلام سے پہلے عورتوں کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہم ان کی دو تہائی تعداد کو غلامی جیسی کیفیت میں پاتے ہیں...... عورتیں دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ثقافت میں مرد کی برتری والے جہان میں قریباً غیر مرئی ہوتی تھیں۔'' 3

زیادہ تر امریکی لپ مین اور بیکر کے پیغامات کو نہیں پڑھتے۔ میں جب بھی کسی عام اجتماع سے خطاب کرتا ہوں تو اکثر شروع میں یہ سوال پوچھتا ہوں: کیا اسلام میں عورتوں کے ساتھ مردوں کی نسبت پست سلوک ہوتا ہے؟ اس کا جواب ہمیشہ با آواز بلند اثبات میں ملتا ہے۔ امریکہ میں مسلمان عورتوں کے حوالے سے منفی تصورات گہرے' عام اور تشویش انگیز ہیں۔ یہ منفی تصورات مختلف اثرات کے تحت ابھرتے ہیں یعنی غلط فہمی' مسلمان ملکوں میں مروج ضابطوں میں اختلاف' کسی حد تک کینے اور زیادہ تر لاعلمی سے۔

حالیہ برسوں میں مسلمانوں کے ساتھ سوال جواب کی درجن بھر اور غیر مسلموں کے ساتھ 60 نشستوں کے بعد میں دو نتائج پر پہنچا ہوں: اول' بیشتر امریکی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام عورتوں کے حوالے سے متعصب اور بعض اوقات سفاک ہے اور دوم یہ کہ امریکی مسلمان عورتیں اس تاثر سے بھرپور اختلاف کرتی ہیں۔

اسلام کے حوالے سے بعض گمراہ کن تاثرات مذہب کی اساس پر لباس' روزگار' شادی اور حتیٰ کہ مصافحہ میں اختلاف سے ابھرتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کی ظاہری وضع قطع ہی ممتاز ہوتی ہے' اکثر تو غیر مسلم امریکیوں کے سامنے آنے والی اسلامی موجودگی کی واحد براہ راست علامت ہوتی ہے۔ یہ کسی حد تک روایتی کیتھولک ننوں سے مشابہ ہوتا ہے — ایک

لمبی، ڈھیلی ڈھالی عبا اور ٹھوڑی پر مضبوطی سے بندھا ہوا سر ڈھانپنے والا رومال، جس میں تمام بال پوشیدہ ہوتے ہیں، صرف چہرہ اور ہاتھ ہی عیاں ہوتے ہیں۔ رومن کیتھولک ننوں کی طرح، جنہوں نے بعد ازاں قدرے کم روایتی پوشاک پہننی شروع کر دی تھی، مسلمان عورتیں اپنے بالوں کو ڈھیلے سکارفوں سے ڈھانپ لیتی ہیں۔ بہت سے عورتیں خصوصاً افریقی النسل عورتیں سر پر ''پگڑیاں'' باندھتی ہیں اور ہو سکتا ہے عوام انہیں مسلمان کے طور پر شناخت نہ کرتے ہوں۔ تاہم ایسی عورتیں بھی ہیں جو مسجد میں نماز ادا کرنے کے وقت سر ڈھانپنے کے علاوہ سر کو کھلا ہی رکھتی ہیں۔

مسلمان مردوں کا لباس کم امتیازی ہوتا ہے تاہم چند مسلمان، خصوصاً مسجدوں کے امام اور اسلامی سکولوں کے اساتذہ پگڑی یا ٹوپی اور لمبی عبا جیسی جلابیہ پہنتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ ڈاڑھی مذہبی تقاضا ہے تاہم سب اس سے متفق نہیں ہیں۔ ہمارے شہر کے مرد مسلمانوں میں سے دو کلین شیو ہیں، ایک کی لمبی ڈاڑھی ہے جبکہ تیسرے کی ترشی ہوئی ڈاڑھی ہے۔

زینب البری نے مجھے بتایا کہ اسلام میں لباس کے حوالے سے مردوں اور عورتوں دونوں سے حیا کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ تاہم وہ تسلیم کرتی ہیں کہ عورتیں بعض معاملات پر غیر متفق ہیں۔ بیشتر مسلمان عورتیں ٹینک ٹاپس (Tank Tops) یا شارٹس (Shorts) پہننے کا سوچیں گی بھی نہیں جبکہ بہت سی مسلمان عورتیں اس روایتی لباس کو مسترد کرتی ہیں جس میں صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوتے ہیں۔ مسلمان عورتیں شاذ و نادر ہی اس حالت میں عوامی جگہوں پر آتی ہیں کہ ان کے بازو یا پنڈلیاں عریاں ہوں۔ نور ناصری کہتی ہیں کہ ''اسلام نے کبھی کسی مخصوص ''روایتی'' طرز کے لباس کا حکم نہیں دیا۔ آپ دیکھیں گے کہ عالمی سطح پر مسلمان جن رسموں پر عمل پیرا ہیں ان میں مشترک بات یہ ہے کہ جسم کی غیر ضروری اور توجہ مبذول کروانے والی نمائش سے گریز برتا جاتا ہے۔ آپ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لباس کے لیے جو اہم صفت آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں وہ ہے ''شائستہ اور حیادارانہ''۔

اکتوبر 1999ء میں عمان، اردن میں لوسیلی اور میں نے دو گھروں میں رات کے کھانوں میں شرکت کی۔ بیشتر مہمان مسلمان تھے لیکن کسی عورت نے سر ڈھانپا ہوا نہیں تھا۔ ایک اور موقع پر ایک عوامی ڈنر میں تین سو سے زیادہ جوڑے مدعو تھے، جن میں بیشتر مسلمان تھے لیکن چند ایک خواتین نے ہی سر ڈھانپا ہوا تھا۔ بہت سی عورتیں ذاتی پسند سے شائستہ اور

حیادارانہ لباس پہنتی ہیں۔ اردن کے مضافاتی علاقوں سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے ڈرائیور آرمی سارجنٹ سمیح مجالی سے' جو تین بچوں کا باپ تھا' دریافت کیا کہ اس کے آبائی شہر کرک' جو اردن کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے' کی عورتیں باپردہ رہتی ہیں؟ اس نے جواب دیا "ہاں اور میری بیوی بھی انہیں میں شامل ہے۔ وہ روایتی ملبوسات پہنتی ہے' اس لیے نہیں کہ اس کا باپ' ماں یا شوہر تقاضا کرتے ہیں بلکہ اپنی مرضی سے۔"

جب ایک دفعہ پہلے میں نے ایسے ہی جذبات سماعت کیے تھے تو اس کے بعد ایک شاندار اور دانشورانہ مباحثہ ہوا تھا۔ 1997ء میں شکاگو میں مسلمان سامعین کے روبرو میرے تبصرے کے بعد ایک عورت سر پر روایتی رومال باندھے اور لمبی پوشاک زیب تن کیے میرے پاس آئی اور بولی "میں نے یہ لباس اپنی پسند سے پہنا ہے۔ اگر میں چاہوں تو مغربی حیادارانہ لباس بھی پہن سکتی ہوں اور اس کے باوجود بھی میں سچی مسلمان رہوں گی۔ نہ تو مسلمان عورتوں سے بدسلوکی ہوتی ہے نہ امتیاز برتا جاتا ہے۔ ہمیں تعلیم حاصل کرنے' کاروبار یا پیشہ وارانہ زندگی میں داخل ہونے کا حق حاصل ہے۔ جب ہماری شادی ہوتی ہے تو ہم اپنا نام خود منتخب کر سکتی ہیں اور اپنی قسمت کی خود مالک ہوتی ہیں۔ ہمیں طلاق کا بھی حق حاصل ہے۔"

میں درمیان میں بول پڑا "میں نے سنا ہے کہ عورت کی نسبت مرد زیادہ آسانی کے ساتھ طلاق دے سکتا ہے۔" انہوں نے جواب دیا "بعض اسلامی معاشروں میں ایسا ہوتا ہے تاہم وہاں بھی عورت کو شادی کے وقت طلاق کا حق دیا جاتا ہے۔ امریکہ اور بیشتر دوسرے ملکوں میں مسلمان عورتوں کو غیر مسلم عورتوں کی طرح طلاق کا حق حاصل ہے۔ طلاق کے حوالے سے اسلامی قوانین اور روایات کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ کسی جوڑے کے لیے طلاق بہتر ہے بہ نسبت دلوں میں کینہ رکھ کر زندگی بسر کرنے کے اور عیسائیوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ رومن کیتھولک چرچ نے طلاق کو صدیوں سے قانونی حمایت سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ چیز عیسائیت کی ایک سب سے بڑی خامی بن گئی ہے۔"

مجھے ایک اور یک رخے تصور سے آگاہی ہوئی۔ "اگلے روز روٹری کلب کی ایک میٹنگ کے دوران میں نے ایک عورت کو یہ کہتے سنا' شاید مذاق کے طور پر' کہ مسلمان عورتوں پر لازم ہے کہ جب وہ اپنے خاوند کے ساتھ گھر سے باہر جا رہی ہوں تو ان سے دو قدم پیچھے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ غلطی پر تھی۔"

مسلمان خاتون بمشکل اپنے قہقہے ضبط کر سکیں اور بولیں: ''یہ بالکل غلط ہے۔ عورت اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہے اور اسلام میں دونوں برابر ہیں۔ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا کہ میاں اور بیوی اس طرح برابر ہوتے ہیں جیسے ''کنگھی کے دو وندانے۔'' یہ سن کر مجھے تو جھرجھری سی آگئی کیونکہ لوسیلی اکثر و بیشتر مجھے یاد دلاتی ہے کہ جب ہم سیر پر جاتے ہیں تو میں عمومی طور پر اسے کئی قدم پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔ تاہم اس کی وجہ میری زندگی بھر کی بہت تیز چلنے کی عادت ہے' کسی قسم کا احساس برتری نہیں۔''

کیا رسول کریم ﷺ نے کنگھی کے دندانوں والی بات واقعی کہی تھی؟ کیا یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟ اس سوال کے جواب کی تلاش نے مجھے بے شمار احادیث رسول ﷺ سے متعارف کروایا۔ آپ ﷺ سے ہزاروں احادیث منسوب ہیں' بعض کو مصدقہ تسلیم کیا جاتا ہے اور بعض کو نہیں۔ نور ناصری بتاتے ہیں کہ احادیث کے چار قسموں کے مجموعے ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مصدقہ احادیث کو سند تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے راوی سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ دوسرے درجے میں ایسی احادیث آتی ہیں جن کے راوی کم استناد کے حامل ہیں تاہم ایسی احادیث بھی قابل قبول ہوتی ہیں۔ یہ سب احادیث برسوں تک زبانی طور پر بیان کی جاتی رہی تھیں اور بعدازاں انہیں قلمبند کر لیا گیا۔

نور ناصری کو یاد ہے کہ انہوں نے لڑکپن میں مذکورہ حدیث کو سنا تھا۔ واشنگٹن ڈی۔سی کے مسلمان مذہبی عالم محمد العنوطی کہتے ہیں کہ روایت یہ کہتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے صنفوں کے حوالے کے بغیر کہا تھا: ''لوگ کنگھی کے وندانوں کی طرح ہیں۔'' تاہم یہ حدیث منطقی طور پر میاں بیوی پر بھی صادق آتی ہے۔

نور ناصری اس روایتی اسلامی رائے کو تسلیم کرتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے کہا تھا: ''شوہر اور بیوی کنگھی کے دو دندانوں کی طرح برابر ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورت' خواہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ' انسان کی حیثیت میں خالق کے عطا کردہ حقوق کے حوالے سے برابر ہیں نیز خلیفۃ الارض کے طور پر اس کی تفویض کردہ ذمہ داریوں کے حوالے سے۔ عورت اور مرد کو کسی بھی کام میں کنگھی کے دندانوں کی طرح پورا پورا تعاون باہمی کرنا چاہیے۔ انہیں خاندان میں اور مجموعی طور پر معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ لازماً تعاون کرنا چاہیے۔''

ہوسکتا ہے قاری کو یہ بحث جزئیات مبنی محسوس ہو تاہم اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ

حضرت محمد ﷺ کی احادیث پر کس قدر عالمانہ غور و فکر کیا جاتا ہے۔ بیرونی لوگوں کے لیے اسلام میں عورتوں اور مردوں کی برابری ہمیشہ نمایاں نہیں رہی ہے۔ مسلمان عورت کے مرد کے پیچھے چلنے جیسے یک رخے تصورات کے پھیلنے کی ایک وجہ ان کی اصلاح نہ کرنا ہے۔

یہ یک رخے تصورات کالجوں کی نصابی کتابوں تک میں موجود ہیں۔ ویڈ سورتھ پبلشنگ، بیلماؤنٹ، کیلیفورنیا کی شائع کردہ ڈیوڈ ناکس اور کیرولین شاخت کی لکھی ہوئی کتاب ''میرج اینڈ دی فیملی: اے بریف انٹروڈکشن'' میں اسلامی عقائد اور روایات کے حوالے سے درج ذیل غلط اور توہین آمیز مواد شامل ہے:

''جو عورت اپنے خاوند کے ساتھ کہیں جا رہی ہو لازم ہے کہ وہ اس سے چند قدم پیچھے ہی رہے۔''

''عورت مردوں کو کھانا کھلانے کے بعد ہی کھانا کھائے۔''

''دوسروں کی موجودگی میں بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے خاوند سے نہ تو بات کرے اور نہ اس کی طرف دیکھے۔''

اور سب سے زیادہ اشتعال انگیز بیان یہ ہے:

''جدید مذاہب میں سب سے زیادہ مرد اساس (Male Oriented) مذہب اسلام میں عورت کی حیثیت بیٹے پیدا کرنے کے ذریعے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

ویڈ سورتھ پبلشنگ نے، یہ ایک ایسی فرم ہے جو علوم انسانی اور سماجی و کرداری سائنسوں کے لیے میٹرک کے بعد کی نصابی کتابیں فراہم کرتی ہے، اس کتاب کی تقسیم روک دی ہے اور انفرادی خریداروں اور کتابوں کی دکانوں کو ایک ''اغلاط نامہ'' بھیج دیا ہے جس میں ان جھوٹے بیانات کی اصلاح کی گئی ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ ان اغلاط ناموں کو پہلے سے تقسیم شدہ کتابوں میں شامل کر دیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے نقصان تو ہو چکا ہے۔ ایسے اضافی صفحات اکثر گم ہو جایا کرتے ہیں یا مطلوبہ کتابوں میں صحیح جگہ پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ [4]

ویڈ سورتھ کی طرف سے اصلاح کی یہ کوشش ابراہیم ہوپر کی طرف سے احتجاج کرنے پر عمل میں آئی تھی، جو واشنگٹن میں واقع کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشن (CAIR) کے کمیونیکیشن ڈائریکٹر ہیں۔ ابراہیم ہوپر ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یہ حقیقت کہ اس پروپیگنڈے کا ہدف سادہ ذہن طالب علم ہیں، صورتحال کو مزید سنگین بنا دیتی ہے...... چودہ سو

سال سے زیادہ عرصہ پہلے اسلام نے عورتوں کو املاک تصور کرنے کی روایت کا قلع قمع کر دیا تھا' بچیوں کو قتل کرنے کی اسلام سے پہلے کے دور کی رسم پر پابندی لگا دی تھی اور عورتوں کو اپنی آمدنیوں اور دولت پر مکمل اختیار عطا کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے عورتوں کو وراثت' طلاق اور کاروبار کی ملکیت کا حق بھی دیا ہے۔ 5

ایسا ہی ایک یک رخا تصور اپر آرلنگٹن' اوہیو کے ہیسٹنگز مڈل سکول میں چھٹی جماعت کے بارہ سالہ مسلمان طالب علم کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ کریم اور اس کے ہم جماعتوں کو ان کے استاد سکاٹ ہال نے ایک تحریری امتحان میں ''مشرق وسطی کے ملکوں میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ اور امریکہ میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ کے مابین موازنہ'' کرنے کا کہا۔ کریم نے اپنے والد تیمور الحسینی سے پوچھا کہ وہ اس مسئلے سے کس طرح نمٹے۔ اس نے کہا کہ استاد نے یہ الفاظ لکھے ہیں: ''مشرق وسطی میں مرد اور عورتیں اکٹھے کھانا نہیں کھاتے اور اسلامی احکامات کے تحت عورتیں احتراماً اپنے شوہروں کے پیچھے چلتی ہیں۔'' اس کے والد نے حیران ہو کر پوچھا: ''کیا سکول میں تمہیں ایسی چیزیں پڑھائی جاتی ہیں؟'' کریم نے جواب دیا ''جی ہاں' مسٹر ہال نے ہمیں یہ بتانے کے لیے سکول میں وڈیو بھی دکھائی تھی۔'' اس کے والد نے احتجاجاً کہا: ''تم یقینی طور پر جانتے ہو کہ اسلام عورتوں کو شوہروں کے پیچھے چلنے کا حکم نہیں دیتا اور نہ ہی مردوں اور عورتوں کو اکٹھے کھانا کھانے سے منع کرتا ہے۔'' کریم نے کہا: ''جی ہاں میں جانتا ہوں لیکن میں امتحان میں اچھا گریڈ حاصل کرنا چاہتا ہوں اس لیے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ جواب غلط ہے میں نے اسے لکھا ہے کیونکہ مجھے پتا ہے مسٹر ہال اسے درست سمجھتے ہیں۔'' 6

الحسینی نے سکول کو ایک احتجاجی خط لکھا تو اشتعال انگیز وڈیو کو سکول لائبریری سے ہٹا لیا گیا اور کریم کے استاد نے کلاس میں اعلان کیا کہ اسلام کے حوالے سے وڈیو میں پیش کی گئیں معلومات غلط تھیں۔ سکول کے پرنسپل نے الحسینی سے وعدہ کیا کہ دیگر اہلافی مواد کا بھی احتیاط کے ساتھ معائنہ کیا جائے گا۔

قرآن مسلمان مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ یہ اجازت' جسے سلام المریعتی اور دوسرے امریکی مسلمان غلط قرار دے کر رد کرتے ہیں' غیر مسلموں میں ایک عمومی غلط فہمی کے طور پر موجود ہے۔ مزید برآں غیر مسلموں کو کثیر الازواجی کے حوالے سے سخت پابندیوں کا بھی بہت کم علم ہے۔ قرآن آخرت میں ان لوگوں کو سخت عذاب سے

خبردار کرتا ہے جو زیادہ شادیاں تو کر لیں مگر ہر بیوی کے ساتھ مکمل طور پر برابری کا سلوک روا نہیں رکھیں۔

اردن سے اپریل سوکت اسلام میں کثیرالازواجی کے حوالے سے اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتی ہیں: ''جب کثیرالازواجی والی قرآنی آیت نازل ہوئی تو اس کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ مرد کو چار بیویوں تک ہی محدود کر دیا جائے۔ اس زمانے میں بعض مردوں کی بیس تک بیویاں ہوتی تھیں۔ بائبل میں بعض ایسے بادشاہوں کا ذکر ہے جن کی دس بیویاں تھیں۔ اس کا دوسرا مقصد ایک حالیہ جنگ میں بہت سے مسلمانوں کے شہید ہونے سے بیوہ ہو جانے والی عورتوں اور یتیم ہو جانے والے بچوں کے مسائل کا تدارک تھا۔

''اس زمانے میں کثیرالازواجی کو مراعات نہیں بلکہ معاشرتی ذمہ داری تصور کیا جاتا تھا۔ میں اپنے آپ کا تو ایک مرد کی بہت سی بیویوں میں شامل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تاہم میں ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو بہت خوش و خرم ہیں۔ لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ میں ایسی مثالوں سے بھی آگاہ ہوں جن میں اس ''ذمہ داری'' کو مکمل طور پر غلط استعمال کیا گیا اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہوئی ہے۔'' اینڈریو پیٹرسن لکھتے ہیں: ''کثیرالازواجی ''سماجی تحفظ'' (سوشل سکیورٹی) سے بہت پہلے رائج کی گئی تھی۔ یہ چند مسلمان ملکوں میں موجود تو ہے تاہم اس پر عمل کرنے والے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔''

میں نے مصر، اردن اور سعودی عرب میں موجود اپنے شناساؤں سے دریافت کیا تو ان میں سے کوئی بھی اپنے ایک ایسے شناسا کا نام نہیں بتا سکا جس نے ایک سے زیادہ شادیاں کر رکھی ہوں۔ ایک ریٹائرڈ اردنی سفیر ماذن نشاشبی نے مجھے بتایا: ''کثیرالازواجی ایک قدیم رسم ہے اور موجودہ دور میں دور دراز واقع صحرائی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔'' وہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام کی آمد سے پہلے سے موجود ہے اور اس کے عمل میں لانے کی بڑی وجہ اس دور کا مخصوص قبائلی بدوی طرز حیات تھا۔

بعض امریکیوں کو یقین ہے کہ اسلامی ملکوں کے مسلمان نیز امریکی مسلمان کثیر الازواجی پر عمل پیرا ہیں تاہم امریکی مسلمان رہنماؤں نے مجھے یقین دہانی کروائی کہ اگر کثیرالازواجی سے قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہو تو اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ امریکی مسلمان تو اس پر شاذ ہی عمل کرتے ہیں۔ امریکہ میں اس کی جو چند ایک مثالیں موجود ہیں تو انہیں کجروی قرار دینا ہی بہتر ہے۔

واشنگٹن کی امریکن مسلم کونسل فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر اور اسلامی امور کے قائد عبدالرحمٰن العمودی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ امریکی مسلمانوں میں کثیرالازواجی بہت ہی کم ہے۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے کسی ایک بھی ایسے امریکی مسلمان کے بارے میں نہیں سنا جس نے زیادہ شادیاں کر رکھی ہوں۔ جہاں کثیرالازواجی موجود ہے وہاں نتائج سنگین ہو سکتے ہیں کیونکہ امریکہ کا قانون ایک مرد کی ایک ہی بیوی کو تسلیم کرے گا۔ اضافی بیویوں کو خانذانی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔'' 7

ہارورڈ یونیورسٹی' واشنگٹن ڈی۔سی کے پروفیسر ڈاکٹر سلیمان نیانگ' جو اسلامی آبادی کے ایک ماہر بھی ہیں' یقین رکھتے تھے کہ چند ایک مسلمان — زیادہ سے زیادہ ایک ہزار — کثیرالازواجی پر عمل پیرا ہیں۔ ''ان میں سے بیشتر اندرونی شہروں میں بسنے والے غریب' غیر تعلیم یافتہ افریقی امریکی ہیں جو شاید اس بات سے پوری طرح آگاہ بھی نہ ہوں کہ کثیرالازواجی قرآن اور قانون میں ممنوع ہے۔'' وہ کہتے ہیں کہ مرد ایک سے زیادہ ''بیوی'' کو مذہبی ذمہ داری کے طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ خاندان میں سب کو فائدہ دینے والے وسائل اکٹھے کرنے کے لیے قبول کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کچھ اسلامی ملکوں میں قانون اور مذہبی منظوری کے ساتھ کثیرالازواجی پر عمل پیرا افراد کی نسبت خود کو مسلمان کہلوانے والے امریکیوں میں کثرالازواجی کم رسوماتی اور خفیہ ہوتی ہے۔ 8

سلام المریتی کہتے ہیں: ''بہرحال کثیرالازواجی امریکہ میں خلاف قانون ہے۔ تاہم اس حقیقت کے مدنظر کہ امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی کم از کم ساٹھ لاکھ ہے مجھے یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ہو سکتا ہے کثیرالازواجی چند مسلمانوں میں موجود ہو۔ غالباً ایسے لوگ غیر تعلیم یافتہ' غریب اور دوسرے مسلمانوں سے کٹے ہوئے ہوں گے۔'' 9 المریتی اور العمودی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ جہاں رہتے ہوں وہاں کے قانون کی اطاعت کریں اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ امریکہ کے کثیرالازواجی مخالف قوانین کی جان بوجھ کر خلاف ورزی کر رہے ہوں۔

تمام دستیاب مواد سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں سے زیادہ عیسائی کثیر الازواجی پر عمل پیرا ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے بیشتر عیسائی حیرت انگیز اور پریشان کن پائیں گے۔

مغربی ریاستوں میں کم از کم بیس ہزار عیسائی — اصل تعداد ہو سکتا ہے تقریباً

35000 ہو — کثیرالازواجی پر کھلم کھلا عمل پیرا ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ اپنے آپ کو بنیاد پرست مورون کہلواتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ روایتی طور پر عیسیٰ کے آخری زمانے کے اولیا کے چرچ (Church of Jesus Christ of Latter Day Saints) سے وابستہ ہیں۔ یہ فرقہ ایک صدی پہلے تک کثیرالازواجی کی اجازت دیتا تھا' پھر اسے چرچ اور سرکاری قانون نے غیر قانونی قرار دے دیا۔

کم سے کم ایک ہزار امریکی عیسائی' جو مورون ورثے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے' کثیرالازواجی میں کھلم کھلا ملوث ہیں۔ وہ کثیرالازواجی کو جائز قرار دینے والے پرانے عہدنامے کے اقتباسات پیش کرتے ہیں اور انٹرنیٹ کی متعدد ویب سائٹوں کی سرپرستی کرتے ہیں جو کثیرالازواجی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ [10]

غیر مسلم اس تہذیبی پابندی سے بہت کم آگاہ ہیں جو بعض مسلمان عورتوں پر خاندان سے باہر کے مردوں سے مصافحہ کرنے پر عائد ہے۔ بعض مسلمانوں کے مطابق یہ پابندی رسول کریم ﷺ کی عائد کردہ ہے تاہم دیگر مسلمان اس بات کو نہیں مانتے۔ امام محمد الھوطی کہتے ہیں کہ اس امر پر وسیع اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ خاندان سے باہر صنف مخالف سے مصافحہ کرنا اسلامی قانون کے صریحاً خلاف نہیں ہے تاہم "جہاں تک ممکن ہو اس سے گریز کرنا چاہیے۔"

میں نے سعودی عرب کے ایک حالیہ دورے میں دو خاتون ماہرین امراض جلد میں مصافحے کے حوالے سے اختلاف پایا۔ دونوں نے شنگلز (Shingles) نامی بیماری کی علامات دیکھنے کے لیے میرے سر اور کندھوں کا معائنہ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو استعمال کیا لیکن جب میں دفتر سے روانہ ہونے لگا تو صرف ایک نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا۔ دوسری نے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا اور چونکہ مجھے پہلے بھی دوسری مسلمان عورتوں کی طرف سے ایسے ردعمل کا سامنا ہو چکا تھا اس لئے میں نے اس کے انکار کی زیادہ فکر نہیں کی۔ تاہم میرے ہسپتال سے نکلنے سے پہلے ہی اس ڈاکٹر نے جس نے مصافحہ سے انکار کر دیا تھا' مجھے ٹیلی فون پر تلاش کیا تاکہ مجھے یقین دلا دے کہ وہ تو فقط ایک مذہبی ہدایت پر عمل پیرا تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اسے بدتمیز تصور کیا جائے۔

وائیلاح ہنداوی' جو اردنی ہیں اور دبئی میں رہتی ہیں۔ حال ہی میں ان کی شادی ہوئی ہے۔ انہوں نے 1990ء میں میرے گھر کا دورہ کیا تھا۔ وہ درج ذیل وضاحت پیش

کرتی ہیں: ''مسلمان مرد ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ طور پر ہاتھ ملاتے ہیں تاہم حقیقی عزت و احترام کے تحت وہ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے۔ بہت سی مسلمان عورتیں خاندان سے باہر کے کسی مرد کو چھونا مناسب تصور نہیں کرتیں تاہم آپس میں کوئی رشتہ نہ رکھنے والے مرد عموماً مصافحہ کرتے ہیں۔'' ان کی بات سننے نے مجھے 1974ء میں جنوبی یمن کے اپنے پہلے دورے کے دوران ہونے والا تجربہ یاد دلا دیا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی جب مجھے عدن کی سیر کروانے والی پروٹوکول افسر نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میرا ہاتھ تھامے رکھا۔

غیر مردوں کے ساتھ مصافحہ نہ کرنے کی روایت مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی شرمسار کر سکتی ہے۔ اردن میں ایک فلسطینی مہاجر کیمپ میں مغربی لباس زیب تن کیے ایک مسلمان خاتون محسن محسنی بھی کیمپ کے ایک مسلمان رہنما' ایک امام کے استقبال کے لیے قطار میں کھڑی تھی۔ جب سلام کرنے کی اس کی باری آئی تو امام نے مصافحے کے لیے اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔ وہ شرمسار ہو کر اپنی نشست پر لوٹ گئی اور اپنے ساتھیوں سے بولی ''یہ اسی کا نقصان ہے۔''

زینب البری ہاتھ نہ ملانے کی رسم کو اسلامی قانون نہیں مانتیں تاہم وہ کہتی ہیں: ''اگر کوئی مرد یا عورت نماز پڑھنے لگی ہے تو ہو سکتا ہے وہ مصافحے کو مسترد کر دے۔ کیونکہ اس طرح اس کا وضو ٹوٹ جانے کا احتمال ہے۔ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوا کرتی۔'' جس انداز سے مسلمان مرد اور عورتیں آپس میں سلام کرتے ہیں وہ ہر علاقے میں مختلف ہے۔ بیشتر ملکوں میں مصافحہ سلام کا عمومی انداز تصور ہوتا ہے تاہم ممکن ہے بعض روایت پسند لوگ سوائے خاندان کے افراد کے اسے نامناسب تصور کریں۔ لفظی سلام کی عام شکل ہے السلام علیکم (تم پر رحمت ہو)۔

1999ء میں ماہ ستمبر کی ایک شام میں نے کیلیفورنیا میں واقع ایک مسجد کے لیکچر ہال میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ مرد اور عورتیں ہال میں الگ الگ بیٹھے تھے اور لکڑی کی دیواری واضح طور ان کے درمیان حائل تھی۔ میری تقریر کے بعد بہت سی عورتیں' جن میں سے بیشتر نے روایتی لباس پہنا ہوا تھا' سلام اور گفتگو کرنے کے لیے میرے پاس آئیں۔ کچھ نے مجھ سے مصافحہ کر لیا باقیوں نے مصافحہ تو نہیں کیا مگر گرمجوشی کے ساتھ زبانی سلام ضرور کیا۔ میں جس سے ملتا ہوں عادت کے مطابق اس سے مصافحہ کرتا ہے اور میں مسلمان عورتوں کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہوئے بھی ایسا ہی کرتا ہوں' چاہے انہوں نے روایتی لباس پہنے ہوں۔

ایک عورت بولی: ”مجھے اس لیکچر میں مردوں اور عورتوں کو الگ الگ بٹھانے کی سمجھ نہیں آئی۔ ہم دوسرے مواقع پر آزادانہ طور پر ملتے ہیں' ایک لیکچر سنتے ہوئے ہم اکٹھے کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟“ جب میں نے ایک مقامی مسلمان رہنما سے اس پالیسی کے حوالے سے دریافت کیا تو اس نے کہا: ”ہمیں یقین ہے کہ بیشتر عورتیں اس طرح راحت محسوس کرتی ہیں۔“ پھر اس نے مزید کہا: ”یہ ایک روایت ہے جو مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے عورتوں کی مردوں سے علیحدگی کے تقاضے سے ابھری ہے۔“

ہوسکتا ہے دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے امریکی مسجدوں میں عورت' مرد کی اس علیحدگی کو عجیب خیال کریں' تاہم کبھی یہ امریکہ کے غیر مسلموں میں بھی رائج ہوتی تھی۔ اس زمانے میں کچھ عیسائی فرقوں کی عورتیں عبادت کے دوران چرچ میں مردوں سے الگ بیٹھتی' جب گھر سے باہر جاتیں تو نقاب اوڑھتی اور نہ صرف چرچ کی تقریبات میں بلکہ ہر وقت لمبے' حیادارانہ لباس پہنتی تھیں۔ البری کو یقین ہے کہ اسلام میں عبادت کی بعض صورتیں ابتدائی زمانوں سے تھوڑی سی مختلف ہوگئی ہیں۔ ”مرد اور عورتیں ہمیشہ الگ الگ نہیں رہے ہیں۔ ابتدائی زمانوں میں وہ ایک ہی صف میں مردوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تھیں۔۔۔ شاید عورتوں کا ایک گروہ اور پھر مرد اور یوں سلسلہ آگے چلتا تھا۔ تاہم رسول کریم ﷺ نے دیکھا کہ اس طرح مردوں کی توجہ بھٹک جاتی ہے لہذا انہوں نے علیحدگی کی ہدایت کی۔“ وہ ہنسی کو روکتے ہوئے مزید کہتی ہیں: ”میرا اندازہ ہے کہ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ عورتوں کی نسبت مردوں کی توجہ زیادہ بھٹکتی ہے۔“

اینڈریو پیٹرسن اس علیحدگی کے مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”مسلمانوں میں نماز کے اجتماعات لڑکوں سے لڑکیوں یا لڑکیوں کے لڑکوں سے ملاقات کے مقام نہیں ہوتے۔ اس قسم کے رویے کے خلاف سخت ہدایت کی گئی ہے۔ نماز کا مقصد صرف نماز اور اللہ کا شکر ادا کرنا ہوتا ہے۔“ پیٹرسن کہتے ہیں کہ عورتیں ہمیشہ نماز کے دوران مردوں کے پیچھے نہیں ہوتی تھیں: ”واشنگٹن ڈی۔سی کی ایک مسجد میں عورتیں مردوں سے الگ تو ہوتی ہیں لیکن ان کے پیچھے نہیں بلکہ عین برابر میں دائیں طرف کھڑی ہوتی ہیں۔ میں نے دوسری مسجدوں میں بھی ایسا ہی دیکھا ہے۔ بعض مسجدوں میں ایک پردہ عورتوں کو مردوں سے الگ کرتا ہے۔ ہوسٹن کے ایرانی ثقافتی مرکز میں عورتیں مردوں کے بائیں طرف اور پیچھے کھڑی ہوتی ہیں لیکن عین پیچھے نہیں۔“

وہ بتاتے ہیں کہ سنی اور شیعہ مسلمانوں میں زیادہ تر اختلافات تنظیمی ہیں اور نمازوں میں معمولی سا فرق ہے۔ شیعہ مسلمان نماز کے دوران پتھر کے ٹکڑوں یا پکی ہوئی مٹی کی ڈلیوں پر پیشانی ٹکاتے ہیں۔ یہ عمل انہیں اپنے فانی ہونے کا احساس دلاتا ہے' یہ ایک علامت ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہیں گے اور ان کے جسم اسی مٹی میں مل جائیں گے جس سے ہم سب پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ شیعہ ہر رکعت کے بعد قریب والے نمازیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ نماز میں ایک مرحلے پر وہ ہاتھ پکڑتے ہیں اور ایک ساتھ انہیں اوپر اٹھاتے ہیں۔''[11]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ رومن کیتھولک عبادت اور بعض پروٹسٹنٹ چرچوں میں ایک خاص مرحلے پر عبادت کرنے والے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہیں۔

جب 1989ء میں لوسیلی اور میں نے جنوبی افریقہ کا دورہ کیا تو ہم نے دیکھا کہ مرد اور عورتیں کام کی جگہوں پر بھی الگ الگ رہتے ہیں اور ایسا کرنے کا مقصد عورتوں کی عزت و احترام کا تحفظ تھا۔ احمد دیدات کی تنظیم بین الاقوامی مرکز برائے اشاعت اسلام کی وسیع و عریض عمارت میں ہم نے دیکھا کہ مرد اور عورتیں الگ الگ منزلوں پر کام کر رہے ہیں۔ احمد دیدات کے بیٹے یوسف نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا: ''اس طرح جنسی ترغیبات بہت ہی کم ہو جاتی ہیں۔'' اسی سہ پہر انہوں نے لوسیلی کو اس سے ملتا جلتا قانون سکھایا۔ انہوں نے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہیر ڈریسر کی دکان میں اسے لے جانے سے نرمی سے انکار کر دیا کیونکہ وہ دونوں کار میں تنہا ہوتے' جو کہ اسلامی حیاداری کی خلاف ورزی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس حقیقت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ عمر میں ان کی ماں کے برابر ہیں۔

بعدازاں جب ہم ان کے والدین کی رہائش گاہ گئے تو یوسف نے مسلمان خاندان میں ذمہ داریوں کی تقسیم کی ایک اور اسلامی روایت سے آگاہ کیا۔ ''میرے والد شہر کے وسط میں واقع اسلامی مرکز کے صدر ہیں لیکن اس گھر میں میری والدہ ہمیشہ صدر ہوتی ہیں۔'' لوسیلی مسکرانے لگی اور اس نے ان کی بھرپور ستائش کی۔

میں نے ابھی حال ہی میں لاس اینجلس میں ایک مسلمان خاتون کا انٹرویو لیا جو نماز میں عورت مرد کی علیحدگی پر معترض ہیں۔ وہ عورتوں کو مرد کے پیچھے کھڑا کرنے کو ان کی تذلیل تصور کرتی ہیں۔ ''میں طویل مدت سے مسجد میں داخل بھی نہیں ہوئی۔ میں مردوں کے پیچھے نماز پڑھنے کو رد کرتی ہوں۔''

انہوں نے اس کی ایک اور وجہ بھی بیان کی: ''دو سال پہلے کی بات ہے' رمضان

کے اختتام پر میں زکوٰۃ جمع کروانے مسجد گئی۔ میں ایسے لباس میں تھی جیسا میں نے اب پہنا ہوا ہے۔'' انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے حیادارانہ مغربی انداز کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں امام تک پہنچی تو اس نے عربی میں یہ دعا پڑھتے ہوئے اپنی نظریں پرے ہٹالیں' کہ ''اے اللہ! مجھے اس ناکافی لباس والی عورت کو دیکھنے کے گناہ پر معاف کر دے۔'' مجھے تو غصہ آ گیا۔ میں واپس مڑی' اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلی گئی اور تب سے میں کبھی دوبارہ مسجد میں داخل نہیں ہوئی۔''

جب میں نے ان سے پوچھا کیا وہ اپنے آپ کو اب بھی مسلمان مانتی ہیں تو انہوں نے فوراً اور زور دے کر کہا: ''یقیناً میں مسلمان ہوں۔ اللہ پر ایمان رکھتی ہوں' دن میں پانچ وقت نماز ادا کرتی ہوں' رمضان میں روزے رکھتی ہوں اور غریبوں کی مدد کرتی ہوں۔'' پھر انہوں نے مزید کہا: ''اسلام حیا کا تقاضا کرتا ہے' لمبی عباؤں اور سر کے رومالوں کا نہیں۔ حیادارانہ مغربی لباس پہن کر میں اپنے مذہب کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔'' میں نے اس سے پوچھا' کیا دوسری مسلمان عورتیں بھی عموماً مغربی لباس پہنتی ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے تعداد کا تو علم نہیں تاہم میرے شناساؤں میں مغربی لباس پہننے والیوں کا تناسب 40 فیصد ہے' ممکن ہے زیادہ ہی ہو۔''

دی نیش وائل ٹینیسین'' (The Nashville Tennessean) کے 3/ اگست 2000ء کے شمارے کے سیکشن ''لونگ'' میں پہلے صفحے پر ایک فیچر شائع کیا گیا جس کا عنوان تھا: ''فیشن اور مذہب میں توازن: حسن (اور حیا) کا آئینہ دار اسلامی فیشن شو۔'' نیشول میں پہلی مرتبہ 325 ڈالر مالیت کے رنگ برنگے اسلامی ملبوسات پہن کر ماڈلوں نے ایک بینکوئٹ ہال کے سٹیج پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے سامعین کے سامنے نمائش کی۔ سٹاف رائٹر تسنیم انصاریہ گریس کی لکھی ہوئی رپورٹ اس جملے سے شروع ہوئی: ''مسلمان عورتوں کے لیے سٹائل روحانی ہوتا ہے۔ قرآن عورتوں کو ہدایت دیتا ہے کہ حیادارانہ لباس پہنیں' اپنی جنسی کشش کو نہ ابھاریں تاکہ دنیا ان کے جسم کے زاویوں کی نہیں بلکہ کردار کی قدر کرے...... ملبوسات دم بخود کر دینے والے ہیں۔ ارغوانی' سرخ' مالٹئی اور نیلے لباسوں پر سنہری حاشیہ لگا ہوا ہے۔ ملتے جلتے رنگوں والے سر کے رومال شانوں پر ڈھلکے ہوتے ہیں یا انہیں سر پر اکٹھا کر کے جوڑا بنایا جاتا ہے۔ سکرٹ جوتوں کو چھو رہے ہوتے ہیں۔'' خدیجہ مجید نے' جو مراکش کی باشندہ اور یہاں استاد ہیں' اس شو کو دیکھا' وہ کہتی ہیں: ''بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ مسلمان

عورتیں صرف سیاہ اور سفید چادریں ہی اوڑھتی ہیں۔ مجھے تو ملبوسات سے بے حد لگاؤ ہے۔ میں شوخ رنگوں کو بہت پسند کرتی ہوں۔"

مسلمان عورتیں قابل فہم انداز میں اپنے لباس کے بارے میں وضاحت کرنے میں پہل نہیں کرتیں تاہم میں نے دیکھا کہ وہ اپنے مذہب کے ہر پہلو کے حوالے سے کیے گئے سوالات کے جواب ہمیشہ خوشی کے ساتھ دیتی ہیں۔ بدقسمتی سے امریکی سوال کرنے کے معاملے میں شرمیلے واقع ہوئے ہیں اور مسلمان عورتیں' غیر مسلم عورتوں کی طرح' مردوں کے ساتھ گفتگو میں کبھی کبھار ہی پہل کرتی ہیں۔

ماضی میں مجھے اکثر حیرت ہوتی تھی کہ بعض مسلمان عورتیں سر کو کیوں ڈھانپتی ہیں اور چہروں پر نقاب کیوں ڈالتی ہیں' جبکہ دیگر سکارف باندھتی ہیں اور بعض ایسی کوئی شے استعمال نہیں کرتیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسلمانوں سے دس برس کی قریبی رفاقت کے باوجود میں اس سوال کا جواب کبھی نہیں جان سکا اور نہ ہی میں اس کتاب کے لکھنے سے پہلے اتنی عقل رکھتا تھا کہ کسی سے پوچھ لیتا۔

اس معاملے پر مسلمانوں میں اتفاق رائے نہیں ہے کہ عورتوں کا سر ڈھانپنا مذہبی تقاضا ہے۔ بعض اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حکم واضح ہے۔ سلام المریعتی کہتے ہیں: "اہم بات یہ ہے کہ جو مسلمان پردے کو مذہبی حکم تصور کرتے ہیں' ان کا احترام کیا جانا چاہیے اور انہیں بھی دوسروں کا احترام کرنا چاہیے۔"

ایک عیسائی نے' جو ٹیکساس کے ایک پبلک سکول کا پرنسپل ہے' 2000ء کے آغاز میں ایک قابل ذکر مثال قائم کرتے ہوئے فٹ بال کھیلتے وقت ایک مسلمان لڑکی کو سر پر سکارف باندھنے کی اجازت دے دی۔ طے شدہ وقت پر کھیل شروع ہونے سے دو منٹ پہلے ہیڈ ریفری نے' جو ٹیکساس کی ساکر آفیشلز ایسوسی ایشن کا رکن تھا' سام ہوسٹن ہائی سکول کی لڑکیوں کی ٹیم کی خاتون کوچ کو کہا کہ اس لڑکی کو سر پر سے سکارف اتارنا یا میدان سے باہر آنا ہوگا۔ اس نے لڑکی کے لباس کے کسی دوسرے حصے کی بات نہیں کی تھی۔ لباس میں حیاداری کے اسلامی تقاضے کے تحت لڑکی نے سر کے سکارف کے علاوہ پینٹ اور لمبی آستینوں والی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کا صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ ریفری کا الٹی میٹم خاص طور پر حیران کن — اور رنج کا باعث — تھا کیوں وہ لڑکی' جو ٹیم کی باقاعدہ رکن تھی' اس برس گزشتہ پانچ میچوں میں سر پہ سکارف باندھ کر حصہ لے چکی تھی اور اسی ایسوسی ایشن کے ریفریوں نے کوئی

اعتراض نہیں کیا تھا۔

پرنسپل رکی کیمپ (Ricky Kempe) کھیل کے میدان میں پہنچے تو انہیں مذکورہ الٹی میٹم کا علم ہوا' انہوں نے لڑکی کو سکارف سمیت کھیلنے کی اجازت دے دی۔ ریفری اڑ گیا: ''سر کا سکارف ضوابط کے خلاف ہے اور میں ضابطوں پر عمل کرواؤں گا۔ پرنسپل بھی' جو کہ چرچ آف کرائسٹ کا رکن تھا' اپنے موقف پر ڈٹ گیا۔ ''فٹ بال کے ضابطے وفاقی قانون کی پامالی نہیں کر سکتے۔ لڑکی کو آئین کی پہلی ترمیم اور مذہبی امتیاز کے خلاف حکومتی قانون کے تحت اپنے مذہبی تقاضے پورے کرنے کا حق ہے۔'' جب کیمپ نے وفاقی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دی تو ریفری ایسا ہو گیا اور اس نے لڑکی کو سکارف سمیت کھیلنے کی اجازت دے دی۔ طلبا کی ریاست گیر ضوابط بنانے والی تنظیم ٹیکساس یونیورسٹی انٹر کالجیٹ لیگ نے بعد ازاں پرنسپل کے موقف کی تائید کی۔ لاس اینجلس کی مسلم پبلک افیئرز کونسل نے ''مذہبی آزادی اور تکثیریت کے لیے ڈٹ جانے'' نیز ''حق کی خاطر جرأت کا مظاہرہ کرنے'' پر پرنسپل کے لیے تعریفی بیان جاری کیا۔[12] کیمپ نے بعد میں کہا: ''سام ہوسٹن ہائی سکول میں مذہب اسلام اور اسلامی لباس کوئی مسئلہ نہیں ہیں۔ میں چار سال سے اس کا پرنسپل ہوں اور اس دوران صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ باقاعدگی سے سر پر سکارف باندھ کر آنے والی مسلمان طالبات کا ایک طالب علم نے مذاق اڑایا۔'' ان کا اندازہ تھا کہ سکول کے اڑھائی ہزار طلبا میں سے سو طالب علم مسلمان ہیں۔ ''مسلمان اچھے طالب علم ہوتے ہیں تقریباً تین چار لڑکیاں ہمیشہ سر پر سکارف باندھتی ہیں اور وہ پڑھائی میں بہت عمدہ ہیں۔'' سکارف والے تنازعے نے کوئی شکایات پیدا نہیں کیں۔ انہوں نے بتایا: ''مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ مجھے تقریباً تیس ای میل موصول ہوئی ہیں اور سب کی سب تائیدی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض موصول نہیں ہوا۔''

نور نصیری سر کے سکارف کا تاریخی پس منظر بیان کرتی ہیں:

''کچھ مسلمان ملکوں میں چہرے پر نقاب ڈالنا ایک بہت پرانی ثقافتی روایت ہے' تاہم اس کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اسلام کی مقدس تحریروں میں نقاب کا نہ تو کوئی تقاضا ہے اور نہ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے اور اس کے ابتدائی زمانے کے عرب میں عورتیں نقاب استعمال کرتی تھیں۔ قرآن (24:31) میں عورتوں کو اپنی چھاتیوں کو ڈھانپنے کا حکم دیا گیا ہے جبکہ اسلام کی آمد سے پہلے چھاتیوں کو کھلا رہنے دیا جاتا تھا۔ قرآن

کے ایک قابل احترام مفسر مقاتل واضح کرتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ چہرے کو نہیں بلکہ چھاتیوں کو لازماً ڈھانپنا چاہیے۔

''سر کا سکارف جسے عموماً حجاب کہا جاتا ہے' ایک دوسرا معاملہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن میں عورتوں سے اپنے بال ڈھانپنے کا کوئی تقاضا نہیں کیا گیا۔ چوبیسویں سورت کی آیات 31-30 ملاحظہ کیجئے' ان میں عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی حیادارانہ لباس پہننے کا کہا گیا ہے۔ تاہم بہت سے مسلمان یہ مانتے ہیں کہ عورتوں کے لیے سر کا سکارف مذہبی حکم ہے۔ وہ اس تقاضے کے حق میں جو حوالہ دیتے ہیں وہ رسول کریم ﷺ کی گفتگو میں دی گئی ایک ہدایت ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب کوئی عورت بالغ ہو جائے تو اسے اپنے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں رہنے دینا چاہیے سوائے ان کے'' آپ ﷺ نے اپنے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ ''عمومی طور پر مسلمانوں کا ایمان ہے کہ رسول کریم ﷺ کی ہدایات کو مذہبی احکامات کے طور پر ماننا چاہیے کیونکہ قرآن اس کا حکم دیتا ہے۔ میری بیوی (زینب البری) روزانہ صرف نماز کے وقت یا مسجد میں داخل ہوتے وقت سر پر سکارف باندھتی ہے۔''

نصیری کی اس وضاحت سے مجھے لباس کے وہ فرق یاد آ گئے جن کا مشاہدہ میں نے ڈیئربورن (Dearborn) اور بغداد دونوں مقامات پر مختلف خاندانوں میں کیا ہے۔ جبکہ کسی عورت نے بھی اپنے چہرے پر نقاب نہیں ڈالا ہوا تھا۔ بڑی خاندان میں ماں اور دو بیٹیاں تو سروں پر سکارف باندھتی اور لمبے لباس پہنتی تھیں۔ باقی دو بیٹیاں' بغداد کے اچھے خاندان کی نوجوان خواتین کی طرح مغربی لباس پہنتی تھیں اور اپنے بالوں کو نہیں ڈھانپتی تھیں۔ ان کا یہ عمل عراقی دارالحکومت میں یا ڈیٹرائٹ میں غیر معمولی نہیں لگتا تھا۔

ایک دن ڈیئربورن کے ایک ہوٹل کی لابی میں کئی مسلمان نوجوان لڑکیاں مجھ سے سیاست پر گفتگو کر رہی تھیں اور میں نے دیکھا کہ ان میں سے صرف ایک نے سر پر سکارف باندھا ہوا تھا۔ بعدازاں میں نے دیکھا کہ مسجد میں وہ ایک گروپ کی صورت میں داخل ہوئیں اور انہوں نے بھی دوسری تمام عورتوں کی طرح سر پر سکارف باندھے ہوئے تھے۔

میری نوجوانی میں عورتیں چرچ میں ہمیشہ اپنے سر ڈھانپتی تھیں اور بعض نے تو اس رسم کو جاری رکھا۔ بیشتر چرچ عبادت کرنے والوں کو حیادارانہ لباس پہننے کی ہدایت کرتے اور بعض صرف انہی کو داخل ہونے دیتے ہیں جو اس ہدایت پر عمل کرتے ہیں۔ روم میں ایک روز ویٹیکن سٹی کی سیر کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ منی سکرٹ پہننے والی عورتوں کو سینٹ پیٹر کے کیتھڈرل

میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔

امریکہ میں مسلمان عورتوں کے لباس سے مسلمان ملکوں میں غالب رسوماتی تنوع کی عکاسی ہوتی ہے۔ تہذیبی تقاضے — چہرے پر نقاب — اور حیادارانہ لباس کے اسلامی تقاضے میں فرق ہمیشہ نمایاں نہیں ہوتا۔ بہت سی مسلمان عورتیں گھروں میں عموی لباس پہنتی ہیں۔ جب وہ گھر سے باہر جاتی ہیں تو مذہبی تقاضوں کے تحت ڈھیلا ڈھالا لمبا لبادہ پہن لیتی ہیں۔

اپنے سفروں کے دوران میں نے ملائیشیا' جنوبی افریقہ یا مشرق وسطیٰ میں بہت کم یکسانیت پائی تاہم سعودی عرب میں دیہاتی اور شہری علاقوں میں مرد اور عورتیں روایتی لباس پہنتے ہیں اور تمام عورتیں سر ڈھانپتی ہیں اور چہرے پر نقاب ڈالتی ہیں۔

میں نے یمن کے ایک حالیہ دورے میں دیکھا کہ شمال میں عورتیں بالخصوص روایتی لباس پہنتی ہیں جبکہ مرد عموماً مغربی لباس پہنتے ہیں' خصوصاً شہروں میں بیشتر عمر رسیدہ عورتیں سیاہ لباس پہنتی ہیں جبکہ نوجوان عورتیں شوخ رنگوں کے لمبے کپڑے پہنتی ہیں۔ کوئی قانون مطلق دکھائی نہیں دیتا۔ تیز (Taiz) کے ایک ہوٹل میں ڈیسک کلرک کے طور پر کام کرنے والی لڑکی نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور چہرے پر بھی سیاہ نقاب ڈالا ہوا تھا۔

دوسرے مسلمان ملکوں میں مرد وزن کے لباس کے حوالے سے رسموں میں بہت ہی زیادہ فرق پائے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ دیہی علاقوں میں ان کا رجحان روایت پسندانہ تھا جبکہ شہروں کے اندر مردوں میں مغربی لباس عام پایا۔ عورتوں کا لباس بعض اوقات مغربی ہوتا ہے تاہم مکمل طور پر حیادارانہ۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے باہر ملائیشیا واحد ملک ہے جس کا میں دورہ کر چکا ہوں۔ یہاں بیشتر مرد مغربی لباس پہنتے ہیں جبکہ عورتوں کا لباس متنوع ہوتا ہے' بعض رنگ برنگے لبادے پہنتی اور سر پر سکارف باندھتی ہیں جبکہ دیگر بغیر کسی سکارف کے مغربی لباس زیب تن کرتی ہیں۔ افریقہ میں عورتوں کے لباس اور مردوں کی پگڑیاں اور عبائیں شوخ رنگوں کی ہوتی ہیں۔ مغربی افریقی مرد مخصوص انداز کی ٹوپیاں پہنتے ہیں جو کوفی کہلاتی ہیں۔ جبکہ عورتیں سر پر کپڑا لپیٹتی ہیں — یہ سب کے سب شوخ رنگوں کے ہوتے ہیں۔

زینب البری ماخذ کی وضاحت کرتی ہیں: ''ابتدائے اسلام کے وقت مسلمان عورتوں کی تعداد تھوڑی تھی اور وہ پڑوسی قبائلی مردوں کا آسان ہدف ہوتی تھیں جبکہ لباس کے

حوالے سے شناخت ان کے تحفظ میں مدد دیتی تھی۔ اس وقت سے بہت سی مسلمان عورتیں اپنے آپ کو لباس کے ذریعے مسلمان شناخت کروانا پسند کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی حد تک ن سے حیا ہوتا ہو تاہم اس سے اپنے مذہب پر فخر کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہم مقامی امریکیوں کو برہنہ وحشی کہا کرتے تھے۔ حالانکہ وہ برہنہ نہیں ہوتے تھے۔ آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایسا لگتا ہے جتنا زیادہ ہم اپنے جسموں کی نمائش کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ مہذب ہوتے ہیں۔ تھوڑا بہتر ہوتا ہے! ایسا لگتا ہے لباس کی رسم سیاست' معیشت اور پیرس کے منی سکرٹ والے فیشن سے تحریک پاتی ہے۔ لیکن اسلام کا یہ ضابطہ کبھی تبدیل نہیں ہوا کہ مرد اور عورتیں حیادارانہ لباس پہنیں۔"

آج بہت سی مسلمان عورتیں بالوں کو ڈھانپنے کے حوالے سے "انتخاب پسند" (Pro-Choice) ہیں تاہم دیگر کا ایمان ہے کہ انہیں عوامی مقامات بشمول جائے روزگار پر سر پر سکارف لازماً باندھنا چاہیے۔ ڈیلس فلیٹ' الی نائے کے اسلامی اطلاعاتی مرکز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر موسیٰ قطب لکھتے ہیں: "اللہ نے حجاب کو عورت کے تحفظ کے لیے لازمی قرار دیا ہے' اس کی حیثیت پست کرنے کے لیے نہیں۔" وہ قرآن کی سورۃ نمبر 33' آیت نمبر 59 کا حوالہ دیتے ہیں: "اے پیغمبر ﷺ! کہہ دیجئے ...... مومن عورتیں اپنے لباس سمیٹ کر رکھیں۔ یہی ایسا ممکن ہے کہ انہیں پہچان لیا جائے اور نقصان نہ پہنچے۔" وہ قرآن کی سورۃ نمبر 24' آیت 31 کا حوالہ دیتے ہیں' جس میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ "اپنی چھاتیاں ڈھانپیں اور زیورات کی نمائش مت کریں سوائے اپنے خاوند (یا قریبی عزیزوں) کے سامنے۔"

ایک مسلمان اکثریت والے ملک ترکی کی حکومت نے ایک حیرت انگیز پالیسی نافذ کی ہے جس کے تحت کچھ خاص عوامی جگہوں پر سر ڈھانپنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک کی شروع کی ہوئی سیکولرازم کی روایت پر عمل کرتے ہوئے حکومت نے سرکاری سکولوں اور حکومتی دفتروں میں عورتوں کے سر ڈھانپنے کی ممانعت کی ہے۔ مئی 1999ء میں حکمرانوں نے ایک ایسی نومنتخب خاتون مسلمان رکن کو پارلیمنٹ میں بیٹھنے سے روک دیا جس نے حلف برداری کی تقریب میں اپنے سر سے سکارف ہٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ [13]

نگاہوں کا دباؤ عورتوں کے انتخاب پر اثر انداز ہونے والا ایک عامل ہو سکتا ہے۔ ایک شام یمن کے دارالحکومت صنعا کے ایک بازار میں تین نوعمر بچوں کے ساتھ ایک مکمل طور پر باپردہ عورت ہمارے بیٹے کریگ سے باتیں کرنے لگی۔ بعد میں ایک قریبی دکاندار نے بتایا

کہ کسی یمنی عورت کے لیے ایسی پہل ایک غیر معمولی بات ہوتی۔ اس نے اپنا اور اپنے بچوں کا یہ کہہ کر تعارف کروایا کہ وہ سٹاکٹن' کیلی فورنیا کے رہائشی ہیں اور بتایا کہ یہ ان کا کسی مسلمان ملک کا پہلا دورہ ہے۔

جب ہماری بیٹی ڈائنا گفتگو میں شریک ہوئی تو اس خاتون نے' جو مسلمان تھی' کہا کہ اس نے مغربی لباس پہننے کا فیصلہ کیا تھا مگر جلد اسے تبدیل کر کے باپردہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''کسی نے اس تبدیلی کے لیے مجھ پر زور نہیں دیا تھا بلکہ لوگ اس طرح مستقل طور پر گھور رہے تھے کہ میں نے روایتی لباس پہننے کا فیصلہ کر لیا۔'' انہوں نے مزید بتایا کہ ان کے بچوں کے لیے یمن کی سیر ایک تہذیبی صدمہ (Culture Shock) ثابت ہوئی ہے کیونکہ جب وہ کیلی فورنیا میں اپنے گھر ہوتے تھے تو سکیٹ بورڈز (Skate Boards) سے کھیلتے' فلمیں دیکھنے اور میکڈانلڈز ریستورانوں اور شاپنگ بازاروں (Malls) کو جایا کرتے تھے۔ صنعا میں فاسٹ فوڈ ریستوراں کھلنا شروع ہو گئے ہیں لیکن قاہرہ اور عمان کی طرح یہاں سینما نہیں ہیں۔

مغربی ثقافت پر گفتگو کی خواہش میں صنعا یونیورسٹی کی بہت سی طالبات ڈائنا کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ سب نے روایتی لباس پہنے اور نقاب اوڑھے ہوئے تھے تاہم ڈائنا کو اکا دکا لڑکیاں اونچی ایڑی والے جوتے اور شوخ رنگوں والی قمیض پہنے بھی دکھائی دیں۔ دوستی اور مہمان نوازی کی ایک مروت آمیز علامت کے طور پر ان میں سے ایک لڑکی نے ڈائنا کو ایک انگوٹھی پیش کی۔ ہم نے دیکھا کہ بیشتر مرد اساتذہ نے مغربی لباس پہنا ہوا تھا۔

بعد ازاں ڈائنا نے عورتوں کے لباس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''نقاب میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ ان کے پار دیکھنا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ کوئی شخص صرف ان کی آنکھوں میں جھانک کر ہی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔'' جب میں نے اینڈریو پیٹرسن کو یہ بات بتائی تو انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا: ''رسول کریم ﷺ نے فرمایا تھا' آنکھیں روح کی کھڑکی ہوتی ہیں۔''

نماز اور عورتوں کے لباس میں چولی دامن کا تعلق ہے۔ جیسا کہ البری وضاحت کرتی ہیں: ''زنانہ لباس ایک حد تک نماز کے تقاضوں کا تابع ہوتا ہے۔ تمام مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب پر مستقلاً عمل کریں نہ کہ صرف ہفتے میں ایک صبح۔ انہیں دن کے مخصوص اوقات میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنے کا کہا گیا ہے۔'' وہ نماز ادا کرنے کا

طریقہ بتانے کے بعد لکھتی ہیں: ''اس سے واضح ہوتا ہے کہ عورتوں کو روایتی طور پر شرم و حیا کے تقاضوں کے تحت نماز کے دوران مردوں کے پیچھے کھڑا ہونے کے لیے کہا گیا ہے۔''

مسلمانوں میں بعض ایسی رسوم بھی موجود ہیں جو کبھی امریکہ کے غیر مسلموں میں موجود تھیں۔ آج بھی چند عیسائی فرقوں کی عورتیں چرچ میں مردوں سے الگ بیٹھتی ہیں اور گھر سے باہر جاتے وقت لمبے حیادارانہ لباس پہنتی اور بالوں کو ڈھانپتی ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا' حیادارانہ لباس کا قانون مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یکساں طور پر لاگو تھا' حتیٰ کہ عوامی جگہوں پر نہانے اور ٹینس' دوڑ اور تیراکی جیسے کھیلوں کے لیے بھی۔ مجھے اپنے لڑکپن کے زمانے کے ہیرو ٹینس چیمپئن ایلسورتھ وائنز کی تصویریں یاد ہیں' جن میں وہ لمبا سفید پاجامہ (ٹراؤزرز) پہنے کورٹ کے گرد دوڑتے دکھائے گئے تھے۔ اس دور کی خاتون چیمپئن ہیلن ولز موڈی بھی ہمیشہ حیادارانہ لباس پہنتی تھیں۔ ان کا سکرٹ ان کے گھٹنوں کے نیچے تک ہوتا تھا۔

یہ ایک نسل پہلے کی بات ہے کہ امریکی عورتیں بھی اپنے چہروں پر نقاب ڈالا کرتی تھیں۔ ایسا وہ مذہبی حکم کے تحت نہیں بلکہ آج کی مسلمان عورتوں کی طرح روایتی طور پر کرتی تھیں۔ جنازوں میں سیاہ نقاب موزوں تصور کیے جاتے تھے جبکہ دوسرے مواقع پر ہلکے رنگوں والے نقاب استعمال کیے جاتے تھے۔ انیسویں صدی میں امریکی عورتیں عموماً ٹخنوں تک لمبے لباس اور سر پر بغیر چھجے کی ڈوری والی ٹوپی پہنا کرتی تھیں۔

زینب البری مسلمان خاندان میں کام کی روایتی تقسیم کی وضاحت کرتی ہیں: ''یہ مسلمان شوہر کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر کی ضروریات کے لیے پیسہ کمائے جبکہ اس کی بیوی کی اولین ذمہ داری بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کرنا ہے۔'' یہ بات قابل غور ہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے بیشتر امریکی خاندانوں میں بھی ذمہ داریوں کی ایسی ہی تقسیم رائج ہوتی تھی۔ اس کے بعد سے یہ روایت کمزور ہوگئی۔ مسلمان اور غیر مسلم عورتیں زیادہ تعداد میں گھر سے باہر کام کرنے اور اپنے خاندان کے لیے کمانے لگیں۔

ممکن ہے کچھ عیسائی اور یہودی عبادت گاہوں کی نسبت اسلام میں مردانہ شاونیت کم نمایاں ہو۔ روایت پسند ربی اور رومن کیتھولک نیز مشرقی آرتھوڈوکس پادری سب مرد ہوتے ہیں۔ کئی پروٹسٹنٹ فرقوں میں عورتیں برسوں سے پادری کے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں لیکن باقی فرقوں میں پیشوائیت مردوں ہی کو حاصل ہے۔ ایک ممتاز بپٹسٹ رہنما اور

"دی سڑگل فار بپٹسٹ انٹیگرٹی" نامی کتاب کے مصنف ہوسٹن کے جان ایف۔ باف بتاتے ہیں کہ 1998ء میں سب سے بڑی پروٹسٹنٹ برادری جنوبی بپٹسٹ کنونشن کی نئی قیادت نے اعلان کیا کہ یہ فرقہ چاہتا ہے کہ "تمام عورتیں اپنے خاوندوں کی اطاعت کریں۔" اس نے ایک ترمیم کی منظوری دی' جواب اس فرقے کے عقیدے کا ایک جزو ہے کہ "عورت کا فرض ہے کہ وہ کامل اطاعت کرتے ہوئے اپنے خاوند کا ہر حکم بجالائے۔" [14]

تاہم اسلام میں بھی بعض پدریتی (Patriarchal) روایات موجود ہیں جو عورتوں سے امتیاز برتتی ہیں۔ مسلمان شوہر کو طلاق کا حق پہلے ہی سے حاصل ہوتا ہے جبکہ عورت کو نکاح کے وقت یہ حق محفوظ کروانا پڑتا ہے۔ مزید برآں مسلمان مرد کسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کر سکتا ہے جبکہ مسلمان عورت کے کسی غیر مسلم سے شادی کرنے پر پابندی ہے۔ میرے ایک مسلمان شناسا کے مطابق اگر کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے شادی کرے تو اس کا یہ اقدام قانون شکنی تصور ہوگا جبکہ بعض تو اسے زنا کہتے ہیں۔

کچھ مسلمان ملکوں میں اس قانون پر اتنی سختی سے عمل کیا جاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے جوڑوں کو کسی غیر مسلم ملک میں منتقل ہو جانا پڑتا ہے۔ ایک امریکی مسلمان' جنہوں نے گمنام رہنے کو ترجیح دی ہے' کہتے ہیں: "اس نکتے پر مجھے خدشہ ہے کہ مسلمان سکالر جدید عہد کے قدم سے قدم نہیں ملا رہے۔ یہ مسئلہ آنے والے طویل عرصے تک موجود رہے گا۔" بہرحال امریکہ میں یہ مسئلہ بہت معمولی دکھائی دیتا ہے جہاں کئی امریکی مسلمان عورتوں نے غیر مسلم مردوں سے شادیاں کی ہوئی ہیں۔

سیاسی میدان میں مسلمان ملکوں میں عورتوں نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں انہیں امریکی خاتون سیاست دانوں کے لیے باعث رشک ہونا چاہیے۔ زینب البری بتاتی ہیں کہ ہر امریکی صدر اور نائب صدر مرد رہا ہے جبکہ پاکستان' بنگلہ دیش اور ترکی جیسے مسلمان ملکوں میں عورتیں اعلیٰ ترین انتخابی عہدوں پر خدمات انجام دے چکی ہیں۔ 1999ء میں ایک مسلمان خاتون میگھاوتی سوکارنو پتری انڈونیشیا کی نائب صدر منتخب ہوئیں اور 2000ء میں منتخب مرد صدر نے انہیں ٹھوس اختیارات سونپ دیئے۔ ایک خاتون حال ہی میں ایران میں نائب صدر کے طور پر خدمات انجام دے چکی ہیں۔

امریکی عورتوں کو' خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم' ووٹ دینے کا حق حاصل کرنے میں ایک سو بتیس سال انتظار کرنا پڑا۔ لیکن ان بیشتر مسلمان ملکوں میں' جہاں جمہوری عمل وجود

رکھتا ہے' عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش ووٹ دینے کا حق حاصل کیا۔ آج مسلمان عورتیں جنوبی ایشیا کے مسلمان ملکوں کے ساتھ ساتھ مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں ووٹ دینے کا حق رکھتی ہیں۔ ایک قابل ذکر استثنا میں کویت میں مردوں پر مشتمل مشاورتی اختیارات کی حامل اسمبلی نے دسمبر 1999ء میں کویتی عورتوں کو ووٹ کا حق دینے کے خلاف ووٹ دیا۔ صرف اکیس برس سے زیادہ عمر کے مرد' جو کم از کم بیس برس سے کویت کے شہری چلے آرہے ہوں' ووٹ دے سکتے ہیں یا کوئی عہدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ [15]

ایک حوالے سے غیر مسلم خواتین ایک طویل مدت سے چلی آرہی اسلامی روایت کو اپنا رہی ہیں۔ بہت سی غیر مسلم دلہنیں شادی کے بعد اپنا کنوارے پن والا نام ہی برقرار رکھنے کا فیصلہ کر رہی ہیں' یہ روایت ایک نسل پہلے تقریباً انجانی تھی' جبکہ اسلام میں صدیوں سے اس روایت کو اسلامی قانون اور عمل کے ذریعے تحفظ حاصل ہے۔

سلام المریعتی کہتے ہیں کہ اسلام خاوند اور بیوی میں مساوات' ہم آہنگی اور ہمدردی کو فروغ دیتا ہے۔ وہ دو اسلامی قانونی تقاضوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے مطابق عورت کی ذاتی آمدنی کو اس کا شوہر اس کی مرضی کے بغیر خرچ نہیں کر سکتا نیز خاوند کو گھر کے کام کاج میں لازماً ہاتھ بٹانا چاہیے یا اپنی بیوی کی مدد کے لیے گھریلو ملازمہ رکھنی چاہیے۔ تاہم المریعتی اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بدقسمتی سے ان میں سے بہت سے مثالیوں کو ہماری جدید دنیا میں نظرانداز کیا جا رہا ہے۔'' [16]

عیسائیوں اور یہودیوں کو اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے زیادہ غوروفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی ثقافت اور ماضی و حال کی مذہبی روایات مسلمانوں سے بہت اشتراک رکھتی ہیں۔

حواشی

1۔ شیلا ہاچکن' اے پی' 21-1-2000

2۔ ''انڈرسٹینڈنگ اسلام'' از تھامس ڈبلیو۔ لپ مین (نیویارک: مینٹر بکس' 1990ء)۔

3۔ ''مور اِن کامن دین یو تھنک'' از ولیم بیکر صفحات 62-63

4۔ دیگر پبلشر بھی اسلام کی توہین کر چکے ہیں۔ 1997ء میں سی اے آئی آر کے مطالبے پر کیپٹن پریس' منی سوٹا اور سائمن اینڈ شسٹر' نیویارک نے اسلام اور اسلامی تہذیب کے حوالے سے غلط مواد پر مبنی کتابیں واپس لیں۔

5۔ سی اے آئی آر الرٹ' 99-11

6۔ تیمور الحسینی کا انٹرویو اور ان سے تحریری مراسلت' 1999ء

7۔ انٹرویو' 8-1-2000

8۔ سلیمان نیانگ سے انٹرویو' 19-1-2000

9۔ انٹرویو' 28-1-2000

10۔ ہانس وولفنسن' اے پی' 14-1-2000

11۔ اینڈریو پیٹرسن سے انٹرویو' 23-4-1999

12۔ کیمپ سے انٹرویو 11-2-2000 اور ایم پی اے سی یو ایس اے کی طرف سے ای میل' 9-2-2000

13۔ اے پی' 3-5-1999

14۔ ''فورسنگ گاڈز ہینڈ'' از گریس ہیلسیل صفحہ 108

15۔ یو ایس اے ٹوڈے' 1-12-1999

16۔ لاس اینجلس ٹائمز' صفحہ 8-A15,3 1996ء

ساتواں باب

غیرت کے نام پر قتل اور کمسن بچیوں کا ختنہ

جب میں نے 1997ء میں کیلیفورنیا میں تقریر کے دوران مسلمان سامعین کو بتایا کہ بیشتر امریکیوں کو یقین ہے کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ بے جان املاک جیسا برتاؤ روا رکھا جاتا ہے اور انہیں صنفی امتیاز اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو میرے جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی سامعین میں موجود عورتیں ہنسنے لگیں، وہ واضح طور پر امریکیوں کی اس سوچ پر حقارت کا اظہار کر رہی تھیں۔

میری تقریر کے بعد ایک خاتون سٹیج پر آئیں اور شدت جذبات کے ساتھ اعلان کیا کہ مسلمان عورتیں مردوں کے برابر ہیں۔ انہوں نے کہا: ''یہ یقین کرنا غلط ہے کہ اسلام عورتوں پر جبر کرتا ہے اور ان کو مردوں سے کمتر سمجھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ عورتیں جبر کا شکار ہیں لیکن ہمارے مذہب کے ضابطوں کی وجہ سے بالکل نہیں۔''

ان کی گفتگو سے واضح ہوا کہ امریکہ کی مسلمان عورتوں اور ان کے غیر مسلم ہمسایوں میں ایک بہت بڑا مواصلاتی خلا (کمیونیکشن گیپ) موجود ہے۔ مسلمان عورتوں کے حوالے سے جس جھوٹے تصور کو امریکی درست مانتے ہیں وہ کوئی ہنسنے والی بات نہیں ہے، نہ ہی مسلمان ملک کہلوانے والے بہت سے افریقی ملکوں میں عورت کی حیثیت۔

جو عورتیں میری بات پر ہنسی تھیں اگر وہ یہ جانتیں تو کبھی محظوظ نہ ہوتیں کہ بہت سے، شاید لاکھوں امریکی اسلام کو دو رسومات کی وجہ سے الزام دیتے ہیں۔ ان رسومات کو عورتوں پر سفاکانہ حملے ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی آزادانہ جنسی تعلقات کے الزام میں عورتوں کا ''غیرت کے نام پر قتل'' اور نوجوان لڑکیوں کا ختنہ جسے مغرب میں صحیح لفظوں میں زنانہ اعضا کو کاٹنا (Female Genital Mutilation-FGM) کہا جاتا ہے۔

آزادانہ جنسی تعلقات کے شبہے میں عورتوں کو بہت سے ملکوں میں قتل کر دیا جاتا ہے' ان میں چند مسلمان ملک بھی شامل ہیں۔ مثلاً پاکستان' اردن' جزیرہ نمائے عرب کے کچھ حصے نیز ہندوستان۔ غیر مسلم لاطینی امریکہ میں انہیں ''غصے کے جرائم'' کہا جاتا ہے۔

چونکہ ''غیرت'' کے نام پر قتل اور ایف جی ایم چند ایسے ملکوں میں واقع ہوتے ہیں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں رہتے ہیں اس لیے مغرب میں بہت سے لوگ غلط طور پر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ اسلام ایسے اعمال کی اجازت دیتا ہے۔

ختنے کا عمل بعض اوقات جنسی تلذذ میں اضافے کی بجائے مجامعت کو ناممکن بنا دیتا ہے تاوقتیکہ مزید جراحت (سرجری) نہ کی جائے۔ یہ ایک قبائلی رسم ہے جو اسلام کی آمد سے پہلے کے زمانوں کی یادگار ہے اور تیرہ سے انیس سالہ یا نوجوان لڑکیاں اس کا نشانہ بنتی ہیں۔

ایک سروے سے ظاہر ہوا ہے کہ افریقہ میں بیس لاکھ عورتوں کے مختلف قسم کے ختنے کیے گئے ہیں۔1 ایسی عورتوں کی اکثریت صومالیہ اور مصر کے دیہاتوں میں رہتی ہے۔

فروری 1999ء میں پاپولیشن کونسل نے 1997ء میں کیے گئے نو ہزار مصری بچوں اور ان کے والدین کے سروے کی بنیاد پر خبر دی کہ دس سے انیس سال کی عمر میں 84 فیصد لڑکیاں ختنے کا شکار ہوئی تھیں۔ رپورٹ میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ اس عمل میں کمی آئی ہے' بتایا گیا ہے:

''90 فیصد سے زیادہ مصری لڑکیوں کے ختنے لگ بھگ پانچ چھ سال کی عمر میں کروا دیئے جاتے ہیں۔ تقریباً 70 فیصد آپریشن صحت کے لیے ضرر رساں ماحول میں گھروں ہی میں کروائے جاتے ہیں اور بعض اوقات خون بہہ جانے یا زخم خراب ہو جانے کی وجہ سے اموات بھی واقع ہو جاتی ہیں...... یہ رسم ان مذہبی اور ثقافتی عقیدوں کی وجہ سے برقرار ہے کہ یہ عورتوں کی شہوت کو اعتدال میں رکھنے نیز لڑکیوں میں زیادہ نسائیت پیدا کرنے اور شادی کے اہل بنانے کے لیے ضروری ہے۔'' 2

اس سے ایک سال قبل فروری 1998ء میں مصر کی وزیر صحت اسماعیل سلام نے عورتوں کے ختنے پر پابندی کی مخالفت اور ختنے کو مذہبی فرض قرار نہ دینے والے مصر کے ایک بزرگ مسلمان کی اتھارٹی کو خاطر میں نہ لانے پر مسلمان ''بنیاد پرستوں'' پر تنقید کی۔ سلام نے کہا: ''ہم جانتے ہیں کہ امیر لوگ' سرکاری افسر اور بڑے مذہبی پیشوا اپنی عورتوں کے ختنے نہیں کرواتے۔'' 3

عورتوں کا ختنہ بعض دیگر ممالک میں بھی مروج ہے' جن میں سے چند مسلمان

ہیں۔ جبکہ جنوبی یورپ اور لاطینی امریکہ میں اس کا رواج کم ہے نیز فریشنز مینیجمنٹ سسٹمز کے صدر ڈاکٹر چیری تھیوڈیوکس کے مطابق امریکہ کے کچھ ہمسایہ ملکوں میں بھی۔4

اگرچہ اکتوبر 1996ء میں عورتوں کے ختنے کو امریکہ میں خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا تاہم امریکی رکن کانگرس پیٹریشیا شروڈر کی سربراہی میں بیس سال سے چلنے والے مہم کی وجہ سے تازہ افریقی نسل والی کچھ عورتوں کے ختنے اب بھی کیے جاتے ہیں۔ بیماریوں پر قابو پانے اور ان سے تحفظ کے مرکز (The Centre for Disease Control and Prevention) نے تخمینہ لگایا ہے کہ امریکہ میں آباد ڈیڑھ لاکھ افریقی النسل عورتوں اور لڑکیوں کے یا تو ختنے ہو چکے ہیں یا وہ اس کے خطرے سے دوچار ہیں۔ مرکز بیان کرتا ہے:

''یہ کام عورتوں کو باوفا رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے اور شدید پیچیدگیوں' زخم خراب ہونے نیز موت کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔'' 5

والدین۔۔۔ عموماً باپ۔۔۔ اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ ختنہ کب کیا جانا چاہیے۔ مصر میں' جہاں ایف جی ایم کی صدیوں پرانی مضبوط روایت موجود ہے' اس پر اتنے خفیہ انداز میں عمل کیا جاتا ہے کہ کچھ بہت تعلیم یافتہ مصری اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ یہ روایت تقریباً مٹ چکی ہے۔ بیشتر ملکوں میں بستی بستی گھومنے والی کوئی غیر لائسنس یافتہ عورت انتہائی گندے اور غلیظ ماحول میں لڑکی کو بے ہوش کیے بغیر اس کا ختنہ کرتی ہے۔ کبھی کبھی صاف ماحول میں ایک لائسنس یافتہ ڈاکٹر ختنہ کرتا ہے تاہم اسے تب بھی خفیہ ہی رکھا جاتا ہے۔

ایف جی ایم کو اکثر مردانہ ختنے سے مماثل قرار دیا جاتا ہے تاہم ایسا کرنا گمراہ کن اور غلط ہے۔ دونوں کا طریقۂ کار اور نتائج بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مردانہ ختنے میں عضو تناسل کی صرف سپاری کی کھال کاٹی جاتی ہے۔ یہ ختنہ ساری دنیا میں عام ہے' عیسائیت' اسلام اور یہودیت اسے ضروری قرار دیتے ہیں جبکہ کئی برسوں سے اسے صحت کے لیے مفید قرار دے دیا گیا ہے۔ مردانہ ختنہ ایک ایسی رسم ہے جو اسلامی اور یہودی خاندانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مرد کی صحت' شہوت یا بچے پیدا کرنے کی صلاحیت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس کے برعکس ایف جی ایم عورتوں کو شدید نقصان پہنچاتا ہے۔ پاپولیشن کونسل ایف جی ایم کے درج ذیل نقصانات بیان کرتی ہے: اندام نہانی پر زخم یا زخم کا خراب ہو جانا' بانجھ پن' تشنج' حیض کے دوران درد' اندام نہانی کی شکل کا بگڑ جانا' درد کے ساتھ پیشاب آنا' پیشاب کا رک جانا' مجامعت کے دوران درد' بچے کی پیدائش میں دشواریاں' بچے اور ماں کی صحت اور زندگی کو

خطرہ لاحق ہونا' خون کے ضیاع اور صدمے کے نتیجے میں موت۔ ختنے کی جراحت خواہ معمولی سی ہو یا بڑی' اسے ایک شرمندگی سمجھتے ہوئے راز ہی رکھا جاتا ہے۔

کینیا میں زنانہ اعضائے تناسل کی جو جراحت کی جاتی ہے اس کا مقصد بظر (کلائیٹورس) کے صرف سرے کو ہی کاٹنا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے یہ مردانہ ختنے کے مماثل ہوتی ہے لیکن اسے صحت کے حوالے سے درست تصور نہیں کیا جاتا۔ اس کے برعکس یہ بھی خطرناک نتائج کو جنم دیتی ہے۔ چاقو کے ذرا سا پھسلنے سے زنانہ جنسیت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

کینیا میں ختنے کو خفیہ نہیں رکھا جاتا بلکہ یہ تو ایک عوامی تقریب ہوتی ہے جو سات دنوں پر محیط ہوتی ہے اور اس دوران لڑکی کے بالغ ہونے کا جشن منایا جاتا ہے۔ قبائلی اور نسلی رسومات سے اس کا گہرا ربط ہے جبکہ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جدید کینیا کے بانی اور قومی رہنما جومو کینیاٹا (Jomo Kenyatta) نے اپنی کتاب ''ماؤنٹ کینیا کے روبرو'' میں اس تقریب اور ختنے کے عمل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں وہ اس تقریب کے لیے کی جانے والی خاندان اور برادری کی تیاریوں اور ختنے سے پہلے بے ہوش کرنے نیز ختنے کے بعد کیے گئے حفظان صحت کے اقدامات کا احوال بیان کرتے ہیں۔

اگست 1996ء میں کینیا کے نیشنل ویمن گروپ نے ''خطرناک اور درد انگیز'' روایتی ختنے کی جگہ ایک نئی غیر جراحتی رسم کو فروغ دینا شروع کیا۔ اسے ''لفظوں کے ذریعے ختنہ'' کا نام دیا گیا ہے اور اس میں نوجوان لڑکیوں کو ہفتہ بھر تنہائی میں رکھ کر تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ پہلے ہی سال ڈیڑھ سو خاندانوں نے اس رسم کو اپنایا۔[6]

ختنہ ایک سفاکانہ عمل ہے جو کہ جہالت' غربت اور مردانہ برتری کے شاونیت پسندانہ تصور کی پیداوار ہے۔ کچھ علاقوں کے مرد ایسی عورتوں کو شادی کے قابل تصور نہیں کرتے جن کے ختنے نہ ہوئے ہوں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں اس رسم کا رواج بہت ہی کم ہے۔

مصر کے دیہی علاقوں' صومالیہ اور دیگر ایسے افریقی ملکوں میں' جہاں ایف جی ایم کا رواج ہے وہاں تعلیم محدود ہے اور زندگی کی صورت حال غیر مہذبانہ ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی فروغ کے لیے حکومت کی طویل عرصے سے کی جانے والی شاندار کوششوں کے باوجود مصر کے دیہی علاقوں میں ناخواندگی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اوسطاً ہر روز ایک نیا سکول کھولا جا رہا ہے لیکن آبادی میں اضافے کی شرح اس سے بہت زیادہ ہے۔ مصر کی موجودہ آبادی چھ کروڑ چالیس لاکھ ہے جس میں ہر سال دس لاکھ سے زیادہ افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔[7]

اس یک رخے تصور کے برعکس، جو ایف جی ایم کو صرف اسلام سے جوڑتا ہے، وسطی اور مغربی افریقہ کے بہت سے غیر مسلم ملکوں میں بھی اس کا رواج ہے۔

اس قبیح رسم کو اسلام سے جوڑنے کی کسی حد تک وجہ یہ حقیقت بھی ہے کہ امریکی خبری ذرائع ابلاغ (نیوز میڈیا) افریقی طرز حیات کے بارے میں بہت کم معلومات مہیا کرتا ہے نیز کئی حوالوں سے خود بھی درست اطلاعات نہیں رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکی عوام اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایف جی ایم بہت سے ایسے ملکوں میں بہت زیادہ عام ہے جہاں مسلمان محض اقلیت میں ہیں مثلاً کینیا، گھانا، بینن اور لائبیریا۔ نہ ہی بیشتر امریکیوں کو اس حقیقت کا پتا ہے کہ افریقی ملکوں کی دوسری غیر مسلم عورتوں کی طرح بے شمار عیسائی اور یہودی عورتیں بھی اس ظلم کا نشانہ بن چکی ہیں۔ مثال کے طور پر ایتھوپیا میں عیسائی ایف جی ایم کو رسالوں، کتابوں اور دستاویزی فلموں کے ذریعے ایک مرکزی عالم گیر تنازعہ بنانے سے پہلے دنیا کے ایک ارب بیس کروڑ مسلمانوں کی بیشتر تعداد تھوڑا عرصہ پہلے تک اس سے ناواقف تھی۔ اس سے پہلے صرف افریقہ کے کچھ مخصوص علاقوں میں ہی اس رسم کی عمومی آگاہی تھی۔

پلٹزر انعام یافتہ کتاب ''دی کلر پرپل'' کی مصنفہ ایلس واکر نے 1992ء میں اپنی پہلی کتاب ''خوشی کے راز کی آگاہی'' کے ذریعے بہت شہرت حاصل کی۔ انہوں نے اس کتاب میں افسانوی اسلوب میں ایف جی ایم کی رسم اور اسے برقرار رکھنے کے لیے مختلف تہذیبوں میں رائج اساطیری کہانیوں پر کڑی تنقید کی تھی۔ اس کتاب میں ایک ایسی افریقی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ختنے کے عمل سے گزرتی ہے اور اپنی باقی ماندہ ساری زندگی اس سے پیدا ہونے والے نتائج بھگتتے ہوئے اس کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش میں بسر کر دیتی ہے۔ واکر کی کتاب کی مقبولیت کے باوجود ایف جی ایم کے بارے میں آگہی محدود ہی رہی یہاں تک کہ جون 1999ء میں ''ریڈرز ڈائجسٹ'' نے ''سائیلنٹ نو مور'' کے عنوان سے واِرس ڈیری کا مضمون شائع کیا۔ جس میں صومالیہ کی اس بہادر اور خوبصورت دوشیزہ نے ایف جی ایم کے حوالے سے اپنی بپتا بیان کی تھی۔ دنیا کے اس کثیر الاشاعت رسالے میں شائع ہونے والے ان کے مضمون نے پوری دنیا میں لاکھوں لوگوں کو اس ظالمانہ رسم سے آگاہ کروایا۔

ڈیری کا مضمون شائع ہونے سے پہلے اخباروں اور نجی گفتگوؤں میں ایف جی ایم کا ذکر کبھی کبھار ہی کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ شرمندگی اور حیاداری تھی کہ اس جراحت کا

شکار ہونے والی عورتیں خواہ ان کا تعلق اسلام' عیسائیت یا دیگر مذاہب سے ہو' اپنی قریبی سہیلیوں سے بھی اس مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے ہچکچاتی تھیں۔ صرف کینیا جیسے ملکوں کے علاوہ' جہاں ختنے کا رواج بہت محدود ہے' اس رسم پر متعلقہ خاندان میں بھی زیادہ گفتگو نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیری کی طرح وہ عورتیں جن کا ختنہ ہونے والا ہوتا ہے' انہیں عمومی طور پر اس کے بارے میں کوئی پیشگی علم نہیں ہوتا کہ ختنہ کب اور کیوں کیا جائے گا۔

اس مضمون کی وجہ سے ڈیری' جن کی تصویر ریڈرز ڈائجسٹ کے سرورق پر شائع ہوئی تھی' ختنے کا شکار ہونے والی عورت کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہو گئیں۔ ان کی صحت کے مسائل نے اس وقت جنم لیا جب ان کی عمر پانچ برس تھی اور ان کے باپ نے' جو صومالیہ میں رہنے والا ایک چرواہا تھا' گھر سے دور ایک صحرا میں بغیر بے ہوش کیے ان کے نسائی اعضا کو کٹوانے کا انتظام کیا۔ یہ کام ایک خانہ بدوش عورت نے ایک ٹوٹے ہوئے خون آلود استرے سے انجام دیا تھا۔

جراحت کے بعد زخم کو سختی سے سی دیا گیا' اور اتنا تنگ سوراخ کھلا رہنے دیا گیا کہ کئی برس تک ڈیری پیشاب بھی بمشکل ہی کر سکتی تھیں نیز بالغ ہونے کے بعد ایک دفعہ خون کے صرف چند قطرے ہی نکلتے تھے۔ ان کے حیض کے ایام درد انگیز اور طویل ہوتے تھے۔ برسوں بعد لندن میں آپریشن کے ذریعے ان کو معمول کی غیر تکلیف دہ حالت میں لایا گیا۔ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر ایک ماڈل کی حیثیت سے بڑی تیزی سے شہرت حاصل کر لی۔ وہ شادی شدہ ہیں' چار سالہ بیٹے کی ماں ہیں اور اپنے خاندان سمیت نیو یارک سٹی میں رہتی ہیں۔

رسالے میں ڈیری نے اپنی ادا کردہ جسمانی قیمت کا ذکر کیا: ''صحت کے مسائل کے علاوہ' جن سے میں نبرد آزما رہتی ہوں' میں جنس کی لذت سے محروم ہو گئی ہوں۔ مجھے ادھورا پن اور معذوری محسوس ہوتی ہے...... میں ان لاکھوں لڑکیوں کے لیے آواز بلند کر رہی ہوں' جو ایف جی ایم کا شکار ہو چکی ہیں اور جو اس کی وجہ سے بے موت ماری جا چکی ہیں۔''

ایف جی ایم کو اسلام سے جوڑنے کے نتیجے میں نیو انگلینڈ کی رہائشی اور کئی برس سے میری شناسا سالنین بیٹ مذہب سے بہت زیادہ بیزار ہو گئیں۔ جب انہوں نے نسائی اعضا کاٹنے کے عمل سے بچ نکلنے والی ٹوگو کی ایک مسلمان لڑکی فوزیہ کیسند جا کی لکھی ہوئی کتاب ''جب تم چیختی ہو تو کیا وہ سنتے ہیں؟'' کا مطالعہ کیا اور پھر اسی موضوع پر رات گئے نشر ہوتے

والا ایک ٹیلی ویژن پروگرام دیکھا تو وہ مشتعل ہوگئیں۔ [8]

اس پروگرام میں دو مسلمان دیکھائے گئے تھے۔ جن میں ایک عورت تھی' جو نسائی اعضا کاٹنے کے عمل کا نشانہ بنی تھی جبکہ دوسرا ایک مرد تھا۔ اس عورت نے' جس کا چہرہ چھپا ہوا تھا' اس ''بے پناہ اذیت اور شرم'' کا ذکر کیا' جس کا تجربہ اس نے آٹھ برس کی عمر میں اس جراحت کا شکار ہونے پر کیا تھا۔ مرد نے ''اخلاقی'' وجوہات بیان کرتے ہوئے اس جراحت کا دفاع کیا۔ بیٹ اس مرد کے دفائی بیانات کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں: ''اس نے لمبی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس جراحت کے ذریعے عورت کے مخصوص اعضا کا وہ حصہ کاٹ دیا جاتا ہے جو جنسی خواہش کو بھڑکاتا ہے۔ اس طرح عورت شادی سے پہلے بے راہروی سے بچ جاتی ہے اور شادی کے بعد شوہر کی وفادار رہتی ہے۔''

اس پروگرام کا بہت دیرپا اثر قائم ہوا۔ ''زندگی میں چند ہی باتوں نے مجھے اتنا زیادہ پریشان کیا ہے۔ جب میں نے اس مرد کی باتیں سنیں تو مجھے بہت برا محسوس ہوا اور مجھے اس پر شدید غصہ آ گیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام اس ظالمانہ جراحت کو پسند کرتا ہے اور میں نے تہیہ کر لیا کہ مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔ اس وقت تک تو میں نے رواداری برتتے ہوئے اسلام کو سمجھنے کی کوششیں کی تھیں لیکن اب بہت ہو چکی تھی۔'' [9]

اس جراحت کے دفاع میں نشر کیے گئے الفاظ ناظرین پر قائم ہونے والے تاثر کی نسبت کم اہم ہیں۔ مثال کے طور پر اس پروگرام میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ بہت سے افریقی ملکوں میں عیسائی اور دیگر غیر مسلم عورتیں بھی اکثر و بیشتر ختنے کا شکار بنتی ہیں۔ اس پروگرام میں صرف اسلام کو نشانہ بنایا گیا تھا اور بیٹ جیسے ناظرین کو یقین ہو گیا کہ نسائی ختنہ اسلامی تعلیمات اور اعمال میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔

اب انہیں اس حقیقت کا علم ہو چکا ہے کہ اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وسیع المطالعہ خاتون ہیں' عوامی مسائل پر خیال افروز تبصرے لکھتی ہیں اور انسانی حقوق کے لیے میری کوششوں میں کئی برسوں سے معاون ہیں۔ ٹیلی ویژن کے جس پروگرام نے انہیں اسلام سے متنفر کیا تھا اس نے دیگر ناظرین میں بھی ایسا ہی ردعمل پیدا کیا۔ اگر نسائی اعضا کاٹنے پر ایک ٹیلی ویژن مذاکرہ انہیں اسلام کے خلاف بھڑکا سکتا ہے تو میرا خیال ہے کہ اس سے اسلام کے بارے میں جو یک رخا تصور سامنے آیا ہے اس سے اسلام کو سمجھنے والوں کے راستے میں اور مسلمانوں کے لیے انصاف کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ حائل

ہو گئی ہے۔

وریس ڈیری کو یقین ہے کہ جراحت کی مشہوری کر کے اور اس کو مٹانے کے لیے چلائی گئی اقوام متحدہ کی تحریک میں خصوصی سفیر کا عہدہ قبول کر کے انہوں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ''میرے دوستوں نے اس پریشانی کا اظہار کیا ہے کہ کوئی جنونی مجھے قتل کر دے گا۔ کیونکہ بہت سے بنیاد پرست لوگ ایف جی ایم کو مذہبی فریضہ تصور کرتے ہیں۔'' جب ڈیری نے اس مہم کی قیادت سنبھالنے کا ارادہ کیا تو ان کے ذہن میں خوف موجود تھا۔ وہ کہتی ہیں: ''مجھے یقین ہے کہ میرا کام خطرناک ہوگا۔ میں خوف زدہ رہنا قبول کرتی ہوں تاہم اس کے ساتھ مجھے ایک موقع بھی حاصل ہوگا۔ یہی کچھ تو میں نے عمر بھر کیا ہے۔''

خوف ان بڑے عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے اسلام کو ایف جی ایم کے حوالے سے بدنام کیا ہے— ایک ایسے مذہب کو جو کہ انصاف' مساوات اور عورتوں کے احترام کی ہدایت کرتا ہے۔ خوف اور اس کی خادمہ یعنی رازداری افواہوں کو پیدا کرتے اور بدگمانی کو پروان چڑھاتے ہیں۔ جیسا کہ ڈیری نے اپنے ذاتی تجربے سے بیان کیا ہے' ہوسکتا ہے ایف جی ایم کو غلط طور پر قرآنی ہدایت قرار دینے والے مذہبی جنونیوں کی طرف سے تشدد کا خطرہ بہت سے مسلمان رہنماؤں کی خاموشی کا سبب ہو۔ جن علاقوں میں ایف جی ایم پر زیادہ عمل ہوتا ہے وہاں کے رہنے والے بیشتر لوگ— امیر و غریب' جوان اور بوڑھے— کم از کم عوامی سطح پر تو انسانی حقوق کی اس شدید خلاف ورزی سے لاعلمی کا عذر اپناتے ہیں۔

مجھے اس وقت کوئی حیرت نہیں ہوئی جب ایک امریکی مسلمان عورت نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی درخواست کے ساتھ میرے سامنے اس قدیم المناک رسم کے حوالے سے جہالت کے کردار کو واضح کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ درج ذیل الفاظ سے ان کی شناخت منکشف ہو جائے: ''مصر' صومالیہ اور دوسری افریقی ریاستوں کے دیہاتی علاقوں میں عورتیں اور نسائی اعضا کاٹنے کا حکم دینے والے مرد سب بہت کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ وہ مذہبی کتابیں پڑھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور قبائلی رسومات اور روایتوں کی مقبولیت کی وجہ سے ان کو اپنانے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض امام اور مسلمان رہنما بھی اسی طرح علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔''

موجودہ دور میں' خوف کے ہوتے ہوئے بھی' ایف جی ایم ایک بڑا بین الاقوامی سکینڈل بن چکا ہے اور اس نے دنیا بھر میں عوامی فکر مندی کو ابھارا ہے کیونکہ عورتیں بہت

بڑے پیمانے پر اس کا نشانہ بنتی ہیں۔ اخباروں کی سرخیوں اور رسالوں نیز ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں میں مسلسل اس کا ذکر رہتا ہے۔ اور چونکہ اس کا تعلق جنس (SEX) اور نسائی اعضائے تناسل کے ساتھ ہے لہٰذا اس کی طرف خبری ذرائع ابلاغ کی بھرپور اور تادیر توجہ یقینی ہے۔ یقینی طور پر یہ ایک ایسی غیر منصفانہ، غیر مساویانہ اور غیر آبرومندانہ سرگرمی ہے جس کی اسلام بھرپور مذمت کرتا ہے۔

ایف جی ایم کو اسلام سے جوڑنے میں ذرائع ابلاغ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کا سبب عموماً وہ رپورٹیں بھی ہیں جو ایسے لوگ لکھتے ہیں جو اس کو صرف اس لیے درست سمجھتے ہیں کہ ہر سال ہزاروں مسلمان عورتیں اس جراحت سے گذرتی ہیں۔ اس کا رواج ان ملکوں میں زیادہ ہے جہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے مثلاً مصر اور صومالیہ، جبکہ یہ ان ملکوں میں عام نہیں ہے جہاں عیسائی یا یہودی اکثریت میں ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ رپورٹر اماموں اور دیگر کمیونٹی لیڈروں سمیت مسلمانوں کے رویے کی وجہ سے الجھن کا شکار ہو جاتے ہوں جو کینیا کی طرح محدود سرجری کی، کھلم کھلا نہ سہی، خاموشی سے منظوری دیتے ہیں۔ ممکن ہے اس منظوری کی وجہ سے طویل عرصے سے عمل میں آنے والی قبائلی رسم کی پیروی کرتے رہنا ہو یا جہالت ہو، ان دونوں کا مرکب ہو یا اعضائے تناسل کی جراحت کے مختلف درجوں کے حوالے سے اسلامی قانون کی حیثیت پر جاری بحث میں ظاہر کی گئی آراء ہوں۔

ادھوری اور الزام دینے والی خبروں کا اکثر و بیشتر بہت زیادہ قصور ہوتا ہے۔ کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشن (CAIR) کے نیشنل ڈائریکٹر نہاد عود کے مطابق: ''اسلام میں اس کی تائید میں کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ غیر مسلم ذرائع نے اس کو ایک اسلامی رسم کے طور پر بیان کیا ہے کیونکہ بعض مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان ذرائع ابلاغ میں ویسی رسائی کے حامل نہیں ہیں اس لیے ان غیر مسلم ذرائع نے یہ یک رخا تصور عام کر دیا ہے۔''[10]

عوام میں پھیلی ہوئی الجھن اور دہشت کو ختم کرنے کے لیے مسلمان علما (سکالرز) کی کوششیں ایک حد تک ہی کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر امدادالدین احمد لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون تین اعمال سے منع کرتا ہے: ''بظر کو مکمل یا جزوی طور پر کاٹ دینا، اندام نہانی کے بیرونی حصے کو مکمل یا جزوی طور پر کاٹ کر سوراخ کو سی دینا یا تنگ کر دینا' یا اعضائے تناسل

کو اس طرح کاٹ دینا کہ عورت جنسی لذت کی اہلیت سے محروم ہو جائے۔'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ اسلامی قانون ''صرف معمولی ساختنہ کرنے کی اجازت دیتا ہے' وہ بھی صرف اس شرط پر کہ اس سے بچی پر کوئی منفی اثرات نہ پڑیں۔'' آگے چل کر وہ نسائی اعضائے تناسل کاٹنے کی تمام صورتوں کو مسترد کر دیتے ہیں اور لکھتے ہیں: ''چونکہ اس کی نہ تو مذہبی اور نہ ہی صحت کے حوالے سے کوئی افادیت ہے اس لیے مسلمانوں کے اس دردناک اور نقصان دہ رسم کو اپنانے کا کوئی جواز نہیں ہے اور اس سے مکمل طور پر پرہیز کرنا ہی بہتر ہوگا۔''[11]

ہائی کونسل آف دی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے چیئرمین ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی لکھتے ہیں: ''قرآن وسنت میں زنانہ ختنے کے بارے میں کوئی احکام نہیں ہیں۔ یہ تو اسلام کی آمد سے پہلے کے زمانوں کی ایک روایت ہے' جس کو اسلام نے ختم کر دیا تھا۔ چار میں سے تین اسلامی فقہی مکتب فکر نے اس کو مذہبی رائے کے قابل معاملہ تصور ہی نہیں کیا اور کہا کہ یہ صرف ایک ثقافتی رسم ہے جس کا کوئی اسلامی جواز نہیں ہے۔''[12]

حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے بہت سے امریکی مسلمانوں سے اس جراحت پر تبادلۂ خیال کیا ہے اور سبھی نے اس کی مخالفت کی' حتیٰ کہ کینیا والی محدود صورت کی بھی۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے صدر اور اسلامک لاکونسل آف نارتھ امریکہ کے ایک رکن ڈاکٹر مزمل صدیقی کہتے ہیں: ''ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید عہد میں مسلمانوں کو جن مسائل کا سامنا ہے ان کی روشنی میں تمام اسلامی مکاتب فکر کے فیصلوں پر نظر ثانی کی جائے۔'' وہ مزید لکھتے ہیں: ''یہ ایک نازک راستہ ہے اور اس پر غیر معمولی احتیاط سے چلنے کی ضرورت ہے۔''[13]

ذرائع ابلاغ نے بعض عوامی احتجاج کو بری طرح نظر انداز کیا ہے حالانکہ وہ قابل ذکر تھے۔ لاس اینجلس کی مسلم پبلک افیئرز کونسل اور ایک گائنا کالوجسٹ' اسلامی مصنفہ اور مقرر مہر حنوط ایم۔ ڈی کے اس رسم کے خلاف دیئے گئے بیانات کو اخبارات نے بہت معمولی کوریج دی۔

کیلی فورنیا کی تنظیم مسلم ویمنز لیگ اس کی مذمت کرتی ہے اور اسلام کے ساتھ اس کے کسی ربط سے انکار کرتی ہے: ''واضح بات ہے کہ عورت کے اعضائے تناسل کاٹنے کا عمل ہمارے مذہب کے مقدس ترین عقائد کی خلاف ورزی ہے۔ اسی لیے ہمیں اس کی مخالفت ضرور کرنی چاہیے اور جو لوگ اس کے نقصان دہ اثرات کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرنے

کے لیے کوشاں ہیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔" لیگ نسائی اعضائے تناسل کاٹنے کے عمل کی مشہوری کے خلاف مسلمانوں کی شدید آزردگی کی نشان دہی کرتی ہے: "بہت سے مسلمان اس رسم اور اسلام کے مابین تعلق ظاہر کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔" یہ ناپسندیدگی قابل فہم تو ہے تاہم نسائی اعضا کاٹنے کو اسلام دشمن یک رخا تصور قرار دے کر رد کر دینا نہ تو سہل ہے اور نہ جلدی ممکن ہوگا۔

زینب البری اسے واضح طور پر رد کرتے ہوئے کہتی ہیں: "اعضائے تناسل کاٹنا اسلام کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن یا احادیث رسول ﷺ میں اس کو جائز قرار دینے والا کوئی حکم موجود نہیں ہے۔" وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتی ہیں: "اگر خدا بظر کو پسند نہیں کرتا تو وہ اسے عورت کے جسم کا حصہ ہی نہ بناتا۔" پھر وہ مزید لکھتی ہیں: "تاہم میں شرمندگی کے ساتھ اعتراف کرتی ہوں کہ میرے آبائی وطن (مصر) میں خود کو مسلمان کہلوانے والے لوگ اب بھی اس پر عمل کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والے باپ اور بعض اوقات ماں اور ہمسائے اس کا حکم دیتے ہیں۔ یہ قرآن کی صریح خلاف ورزی ہے لیکن اس پر بھی اسلامی تنظیموں کے بعض رہنما چپ سادھے ہوئے ہیں۔"

امریکن مسلم کونسل (AMC) کے ایک بانی عبدالرحمٰن العمودی ان ممتاز امریکی مسلمانوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے عورتوں کے اعضائے تناسل کاٹنے کی ہر صورت کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "بظر کی ٹوپی (Hood) کو بھی کاٹنا اسلام میں منع ہے۔ یہ جراحت اسلام اور عورتوں کے وقار کے منافی ہے۔" مجھے یقین ہے کہ میرے تمام شناسا بھی العمودی جیسی سوچ کے حامل ہیں اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی سوچ بھی یہی ہے۔

ڈیری کے ریڈرز ڈائجسٹ میں چھپنے والے مضمون کے جواب میں تین ہزار قارئین نے اقوام متحدہ کے ادارے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن سے نسائی اعضائے تناسل کاٹنے کے حوالے سے معلومات فراہم کرنے کے لیے درخواست کی۔ کانگرس نے ڈیری کی طرف سے شخصی طور پر ثبوت مہیا کرنے کے بعد اقوام متحدہ کے پاپولیشن فنڈ کو اعضائے تناسل کاٹنے جیسے عورتوں کے مسائل حل کرنے کی خاطر دو کروڑ پچاس لاکھ ڈالر فراہم کیے۔ افریقہ میں ان کی چلائی گئی مہم رنگ لا رہی ہے۔ سینیگال نے دوسری افریقی اقوام کی طرح اس رسم کو روکنے کے لیے قانون سازی کی ہے۔ یاد رہے سینیگال کی بیس فیصد عورتیں اس جراحت کا نشانہ بنتی

ہیں۔ سینیگال نے برکینا فاسو، وسطی افریقی جمہوریہ، جبوتی، گھانا، آئیوری کوسٹ، گنی اور ٹوگو کی پیروی کرتے ہوئے جنوری 1999ء میں زنانہ ختنے پر پابندی لگا دی۔

گھانا نے 1994ء میں اس رسم پر پابندی لگا دی تھی لیکن چند ہی لوگوں کو سزا دی گئی اور جراحت جاری رہی۔ آئیوری کوسٹ نے، جس کی ساٹھ فیصد آبادی مسلمان ہے اور چالیس فیصد سے زیادہ عورتیں جراحت کا شکار ہیں، 1998ء میں اس پر پابندی لگائی۔[15] مارچ 1998ء میں وزیر برائے خواتین و خاندانی بہبود (فیملی ویلفیئر) البرٹین گنانزن ہپی نے کہا: ''زنانہ ختنے کی رسم کو ترویج دینے والے تین دلائل کا سہارا لیتے ہیں—— مذہبی حکم، اعضاء کاٹنے کو تطہیر قرار دے کر اور نوجوان لڑکیوں کو بالغ معاشرے میں شامل کرنے کے لیے اعضاء کاٹنے کو ایک طریقہ قرار دے کر۔ ان سب دلائل کا نہ تو کوئی مذہبی اور نہ ہی اخلاقی جواز ہے۔''[16]

یونیسف (UNICEF) کے ڈائریکٹر کیرول بیلامی تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پابندی سے عورتوں کے اس عزم صمیم کا اظہار ہوتا ہے جو انہوں نے ایک ظالمانہ اور ناقابل قبول رسم کو مٹانے کے لیے کیا ہوا ہے، ایک ایسی رسم لڑکیوں کے آزادی، تحفظ اور صحت مند زندگی کے حق کو پامال کرتی ہے۔''[17]

اعضائے تناسل کاٹنے کی رسم کو مٹانے کی مہم اس حقیقت کی وجہ سے بھی زیادہ مبازرت طلب ہوگئی ہے کہ اسلام پر تنقید کرنے والوں کے لیے یہ ایک آسان ہدف ہے۔ اس رسم کے حوالے سے مسلمانوں کی خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جنسی افواہیں پھیلانے والے لوگوں کو ایک موضوع ہاتھ آ گیا ہے۔ اسلام کو بدنام کرنے والے متعصب لوگوں کو اسلام پر تہمت لگانے کا موقعہ مل گیا ہے۔ نیز یہ چیز لاکھوں امریکیوں کے لیے باعث کشش ہے جو پہلے ہی منفی تصورات قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔

ایک اور لائق مذمت رسم جس کو اسلام کے ساتھ اکثر غلط طور پر جوڑ دیا جاتا ہے، وہ ہے ''غیرت'' کے نام پر قتل۔ اردن، پاکستان، مصر اور ہندوستان نیز جزیرہ نمائے عرب میں اس رسم پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت مرد کو اس امر کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ جنسی بے راہروی کے ذریعے خاندان کو بے عزت کروا دینے کی ملزمہ عورت کو قتل کر دے۔ اگرچہ یہ اقدام صریحاً قتل کی واردات ہوتا ہے تاہم اس کا دفاع یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ عورت کے خاندان کی عزت بچانے کے لیے ایسا کیا جانا ضروری تھا جبکہ حکومت عموماً اس کو نظرانداز کر

دیتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کرتی ہے قاتل کو ہلکی سزا دیتی ہے۔[18]

امریکہ میں ''غیرت'' کے نام پر قتل کو اسلام کے ساتھ کسی حد تک غلط طور پر اس لیے منسوب کر دیا جاتا ہے کہ امریکی ٹیلی ویژن نے زیادہ تر پاکستان اور اردن جیسے مسلمان ملکوں میں ہونے والی وارداتوں ہی کی خبریں نشر کی ہیں جبکہ عیسائی اکثریت والے ملکوں میں ہونے والی ایسی ہی وارداتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لاطینی امریکہ میں عیسائی بھی مسلمانوں ہی کی طرح ''غیرت'' کے نام پر عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں لیکن امریکہ میں ان وارداتوں پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

یونیورسٹی آف لوئیس وائل میں الٰہیات کی ایک مسلمان پروفیسر ڈاکٹر رفعت حسن اپنے آبائی وطن پاکستان میں ''غیرت'' کے نام پر ہونے والی قتل کی وارداتوں کے خلاف مہم چلا رہی ہیں، جہاں 1997ء میں تین سو سے زیادہ عورتیں قتل ہوئی تھیں۔ بی بی سی نے حال ہی میں ایک سولہ سالہ پاکستانی عورت کی ہلاکت کی خبر نشر کی جسے اس کے سسرال والوں نے بدچلنی کے الزام میں تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا تھا۔ انسانی حقوق کے مقدمات لڑنے والے پاکستانی وکیل مفتی ضیاء الدین نے ''مقتول خواتین کے عدالتی مقدمات کی حیثیت'' کے عنوان سے اپنے وطن پاکستان میں غیرت کے نام پر ہونے والی قتل کی وارداتوں کے اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ قاتل عموماً بچ نکلتے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں اقوام متحدہ کے ایک کمیشن کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا: ''فرض کیا اگر میں اپنی بیوی کو قتل کر دیتا ہوں۔ میں کسی بادشاہ کی طرح جیل جاؤں گا۔ لوگ میرے لیے جلوس نکالیں گے اور مجھے رہا کر دیا جائے گا۔''

لاس اینجلس ٹائمز میں مارگریٹ ریمیرز لکھتی ہیں: ''کچھ بنیاد پرست مسلمان غیرت کے نام پر قتل کو اسلام میں جائز تصور کرتے ہیں۔ جبکہ دیگر مسلمان اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ مشہوری ہونے سے مغربی اقوام میں مسلمان امتیاز کا شکار ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر رفعت حسن کہتی ہیں: ''ہمیں قرآن کی تفاسیر پر انقلابی (ریڈیکل) انداز سے نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اسلام کی حقیقی بنیادوں پر معاشرے کو تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا ہو گا کہ اللہ کے سامنے مرد و زن مساوی ہوتے ہیں۔ قتل کی ایسی وارداتیں اسلام کے احکامات پر عمل نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے والے لوگ تو اسلام کو مسخ کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر رفعت حسن سارا الزام ''روایتی مسلمان معاشروں میں عمومی طور پر پائے

جانے والے غلط تصورات'' کو دیتی ہیں اور خبردار کرتی ہیں کہ جب تک یہ تصورات موجود رہیں گے اسلام کے پردے میں امتیاز موجود رہے گا۔ قرآن غیبت سے منع کرتا ہے جبکہ غیرت کے نام پر اکثر قتل اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ زینب البری اس حوالے سے لکھتی ہیں:
''قرآن غیبت سے بالخصوص منع کرتا ہے اور اسے ''مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے'' کے برابر قرار دیتا ہے۔''

ڈاکٹر رفعت حسن امریکی مسلمانوں کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:
''نوجوان تو اس پر خوفزدہ اور شرمندہ ہیں......وہ کہتے ہیں کہ غیرت کے نام پر قتل اسلام کے منافی ہے۔ تاہم انہیں کوئی یہ نہیں بتاتا کہ ایسا ہوتا کیوں ہے۔'' امریکہ بھر کے سفر کے دوران انہیں اس رسم کے خاتمے کے لیے چلائی گئی اپنی مہم کی بھرپور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بتاتی ہیں کہ امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹروں کی ایسوی ایشن کے ایک کنونشن سے خطاب کے بعد انہوں نے اس مہم کے لیے مالی امداد کی درخواست کی تو سامعین نے چندہ دینے سے گریز کیا۔ ایک پاکستانی عورت نے انہیں کہا کہ ''غیرت کے نام پر ہونے والی قتل کی وارداتوں کو غیر معمولی اہمیت'' دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

وہ ان باتوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں: ''میں بہت دل شکستہ ہوئی۔ وہ عدم تعاون پر اڑے ہوئے تھے' لیکن میں اس کو ترک نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے تو اللہ اس طرف لایا ہے۔ یہ مہم میرا مقصد حیات بن گئی ہے۔''[19]

وہ اس امر کی ضرورت محسوس کرتی ہیں کہ عالمی سطح پر ایک تعلیمی پروگرام شروع کیا جانا چاہیے۔ ان کو اقوام متحدہ کی ایک پیش رفت کے ذریعے حوصلہ افزائی ملی ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ جون 2000ء میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس میں ''غیرت'' کے نام پر قتل کی وارداتوں کے خلاف سخت اقدامات کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔[20]

زینب البری نسائی اعضائے تناسل کو کاٹنے اور ''غیرت کے نام پر قتل'' کو شیطانی چکر قرار دیتی ہیں۔ ''معاشرتی اور معاشی وجوہات کے تحت ان کا شکار بننے والی عورتوں کے پاس بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مذہب پر ان رسومات نے غلبہ پا لیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ عورتیں بھی اس خوف سے بات نہیں کرتیں کہ ان کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا اور انہیں ذات باہر قرار دے دیا جائے گا۔ تاہم ان ہولناک رسموں کو مٹانے اور اس شیطانی چکر

کو توڑنے کے لیے عورتوں کو لازماً قدم اٹھانا چاہیے۔ مسلمانوں کی حیثیت سے ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کی بہتری کے لیے عمل کرنا ہی ہوگا۔ مسلمان عورتوں کو زیادہ جارحانہ کردار ادا کرنا پڑے گا۔ بہت سی عورتیں اپنے بیٹے اور بیٹی کو الگ الگ معیارات کے تحت پروان چڑھاتی ہیں۔ انہیں دونوں اصناف کو ایک ہی اخلاقیات کا درس دینا چاہیے۔"[21]

میں نے امریکی مسلمانوں کی تنظیموں کی تحریروں کا ایک غیر رسمی جائزہ لیتے ہوئے ایف جی ایم یا "غیرت" کے نام پر قتل کی وارداتوں کے صرف دو حوالے پائے۔ مزید برآں میں نے دیکھا کہ ان رسموں کے حوالے سے ممتاز مسلمان بات کرنے سے عمومی طور پر گریزاں ہیں۔

ایف جی ایم اور "غیرت" کے نام پر قتل مردانہ شاونیت کا حتمی اظہار ہیں اور یہ قدیم قبائلی رسموں کی یادگار ہیں جنہوں نے مردوں کی برتری کو صدیوں سے قائم رکھا ہوا ہے۔

حواشی

1. ریڈرز ڈائجسٹ' 2000-5 صفحہ 222
2. پاپولیشن کونسل' فروری 1999ء
3. ایجنسی فرانس پریس' 1998-2-13
4. انٹرویو' 1999-6-26
5. نیویارک ٹائمز' 1996-10-12
6. افریقہ نیوز آن لائن' 1997-11
7. مومیں فورڈ فاؤنڈیشن کے نمائندوں سے انٹرویو
8. ''جب تم چیختی ہو تو کیا وہ سنتے ہیں؟'' از فوزیہ کیسند جا (ڈیلاکور پریس' 1998)
9. انٹرویو' 1999-11-8
10. خط' 2000-3-1
11. ''نسائی اعضائے تناسل کاٹنا: ایک اسلامی نقطۂ نظر''۔ پمفلٹ نمبر (یتھسڈا: فریڈم انسٹی ٹیوٹ کا مینار)
12. ای۔میل' سید ایم۔سعید' سیکرٹری جنرل آئی ایس این اے' 2000-5-19
13. پاکستان لنک' صفحہ 1' 2000-9-1
14. ایسوسی ایٹڈ پریس' 1999-7-14
15. ایجنسی فرانس پریس' 1998-6-4
16. انٹر پریس سروس' 1998-3-27
17. سی این این' 1999-1-15
18. شہریوں سے ذاتی انٹرویو
19. ایلن گڈمین' بوسٹن گلوب' 2000-3-12 اور لاس اینجلس ٹائمز 2000-3-11 صفحہ B-2
20. واشنگٹن ٹائمز' 2000-6-12
21. انٹرویو' 1999-7-8 اور خط' 1999-8-23

آٹھواں باب

بین المذاہب افہام و تفہیم کی ضرورت

مذاہب کے مابین ابلاغ کا سلسلہ ٹوٹ جانے کے ایک واقعے سے میرا اطمینان قلبی ختم ہو کر رہ گیا اور ہمیشہ سے زیادہ امریکہ میں اسلام کے مسخ شدہ تصور پر میرے توجہ مرکوز کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ مسئلہ اس وجہ سے خصوصیت کے ساتھ تشویش انگیز تھا کیونکہ یہ ہمارے آبائی شہر کے نزدیک واقع ہوا تھا۔

ہوا یوں کہ 16 رفروری 1990ء کو سنگامون سٹیٹ یونیورسٹی' الی نائے' ایک ادارہ جواب سپرنگ فیلڈ میں یونیورسٹی آف الی نائے بن گیا ہے' کے مسلمان طالب علموں نے اسلام پر ایک لیکچر کا اہتمام کیا۔ ان کو امید تھی کہ اس طرح اس علاقے کی عیسائی اور یہودی کمیونٹیوں میں ان کے مذہب کے حوالے سے بہتر آگاہی پیدا ہوگی۔

سامعین میں اضافے کی غرض سے انہوں نے مقامی اخباروں' ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اشتہارات دیئے۔ انہوں نے عیسائیوں کے تین سو سے زیادہ چرچوں اور دو مقامی سینا گوگوں کو اطلاع نامے بذریعہ ڈاک بھجوائے۔ بہت زیادہ سامعین کی آمد کی توقع میں انہوں نے پانچ سو نشستوں والا ہال کرائے پر لیا اور خور و نوش کا وافر انتظام کیا۔ منتظم طلبا میں سے ایک نے' جو اسلام میں ہماری دلچسپی سے آگاہ تھا' ہمیں فون کیا اور اصرار کے ساتھ لوسیلی اور مجھے شرکت کی دعوت دی۔

اس بھرپور اشتہاری مہم کے باوجود کل 75 لوگ ہی آئے' جن میں مسلمان صرف پانچ تھے۔ غیر مسلموں میں چار عیسائی اور ایک یہودی تھا۔ اس سے کئی عوامل کی نشاندہی ہوئی۔ پہلا تو یہ کہ الی نائے کے دارالحکومت میں مسلمانوں کا منفی تصور اتنا ہی گہرا ہے جتنا بیشتر دوسرے امریکی شہروں میں۔ دوسرا یہ کہ پادری اور ربی اپنی کمیونٹیوں میں ہی عمومی طور پر اس

قدر مصروف ہوتے ہیں کہ وہ بیرونی تقریبات میں شرکت سے ہچکچاتے ہیں۔ لیکن اس قلیل حاضری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ منتظمین نے اشتہار تو جاری کر دیئے لیکن مدعوئین کو ذاتی طور پر ٹیلیفون کر کے ان سے شرکت کی باقاعدہ درخواست نہیں کی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اس تقریب کا اہتمام فروری کی ایک سرد شام کو کیا۔ ممکن ہے کہ ہم بھی پینتیس میل دور کار چلا کر نہ جاتے اگر ہمارا ایک شناسا طالب علم ایک رات پہلے ہمیں ٹیلی فون نہ کر دیتا۔

حاضرین کی کم تعداد پر منتظمین مایوسی کا شکار تھے لیکن وہ شام میری زندگی کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی' واقعات کے ایک ایسے سلسلے کی ایک کڑی جو مجھے قدم بہ قدم ایک نئے مبارزت طلب شعبہ عمل میں لے گیا۔

خطیب ڈیوڈ زونک نے' جو پلین فیلڈ انڈیانا کی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے عملے کے رکن اور ایک میتھڈسٹ پادری کے بیٹے ہیں' اسلام کا ایک خاکہ پیش کیا جس میں انہوں نے اسلام' عیسائیت اور یہودیت کے مشترکہ اصولوں اور اعمال کی بابت آگاہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے امریکہ میں اسلام کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں پر بھی بات کی۔ مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ یہ غلط فہمیاں امریکی مسلمانوں کے لیے بے چینی اور اضطراب کا سرچشمہ ہیں لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے امریکہ کو مشرق وسطی کے حوالے سے ایک دانش مندانہ پالیسی تشکیل دینے میں بڑی رکاوٹ کھڑی کی ہوئی ہے۔ ان گمراہ کن تصورات نے امریکیوں کو اس علاقے کے حقائق کی طرف سے اندھا کر رکھا ہے اور امریکی حکومت کو متعصبانہ پالیسیاں بنانے کی طرف مائل کیا ہوا ہے۔

اس وقت مجھے اس حقیقت کا ادراک نہیں تھا تاہم میں اس کی گرفت میں آ گیا تھا۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس دن کے بعد سے میں غلط تصورات کی اصلاح کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس لیکچر کے ایک ہفتے بعد میں نے اپنے آبائی شہر کے روزنامہ اخبار ''جیکسن وائل جرنل کوریئر'' میں ایک مضمون شائع کروایا جس میں میں نے زونک کے لیکچر کا خلاصہ بیان کیا تھا اور حاضرین کی کم تعداد پر ماتم کیا تھا۔ میں نے مضمون کا اختتام اس درخواست پر کیا تھا:

''ہر مذہبی تحریک ریڈیکل عناصر کی حامل ہوتی ہے لیکن جن مسلمانوں سے میرا میل جول ہے میں نے انہیں مہربان' عزت کرنے والے' مہمان نواز اور دوسروں کا لحاظ کرنے والا پایا ہے۔ میں نے مسلمانوں کو دفتروں' کھیتوں اور مسجدوں میں نماز ادا کرتے دیکھا ہے۔ اسلام انہیں دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنے کا کہتا ہے۔ بہرحال نہ تو سارے

مسلمان اسلامی معیارات کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور نہ ہی عیسائی اور یہودی ویسا رویہ اپناتے ہیں جیسا رویہ انہیں اپنانا چاہیے۔

''میں اسلام کی نہیں بلکہ آگہی کی وکالت کر رہا ہوں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو چاہیے کہ وہ اسلام سے شناسا ہوں اور مسلمانوں کو بھی انسان سمجھیں، محض بدنما جھوٹے یک رُخے تصور ہی نہ سمجھیں۔ چونکہ ہم ایک ہر لحہ سکڑتی ہوئی دنیا میں خوش وخرم زندگی بسر کرنے کے لیے کوشاں ہیں اس لیے ہمیں اپنی بھلائی کی خاطر ان جھوٹے تصورات کو مٹا دینا چاہیے جو ہماری بصیرت میں نقص پیدا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات ہماری حکومت کی پالیسیوں کو غلط رخ دے دیتے ہیں۔'' میں باآسانی شاعر رابرٹ برنز کا یہ مصرعہ نقل کر سکتا تھا:

''ہم پسند کریں یا نہیں، ہم سب اس کرۂ ارض پر موجود ہیں اور یہاں سے کہیں جانے کی کوئی راہ نہیں ہے۔''

میرے مضمون کو پریسبائٹیرین چرچ کے خبرنامے (نیوز لیٹر) میں دوبارہ شائع کیا گیا اور 42-1941ء میں میرے منطق اور مذہب کے استاد ڈاکٹر میلکم سٹوارٹ نے، جو اب ریٹائر ہو چکے تھے، اس کا مطالعہ کیا۔ وہ ایک مخلص، صاحب فکر اور باریک بین انسان تھے۔ برسوں بعد جب میں کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا رکن بنا تو ہم دوست بن گئے۔ اریزونا میں واقع اپنے سرمائی گھر میں انہوں نے میرا مضمون پڑھنے کے بعد مجھے ایک تائیدی خط ارسال کیا جس میں ایک تبصرہ اتنا عمیق تھا کہ وہ آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے:

''ہماری دنیا میں اس وقت تک امن کا راج نہیں ہو سکتا جب تک مذاہب کے مابین امن قائم نہیں ہوتا اور مذاہب کے مابین امن اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک ان کے پیروکار ایک دوسرے کے لیے افہام وتفہیم پیدا نہیں کرتے۔ اس عمل کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ اختلافات کی بجائے مشابہت، یکسانیت اور موافقت پر زور دیا جائے۔ امن، اتحاد اور ہم آہنگی ہر مذہب کا اعلانیہ مقصد ہے۔ یہ توقع کرنا بہت دلچسپ ہے کہ اگر تمام مذاہب ان اعلانیہ اہداف کو حاصل کرنے کے لیے تعاون کر سکیں تو کیسی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے!''

انہوں نے ایسے کئی رسالوں کا ذکر کیا جو عالمی مذہب کے موضوع پر شائع کیے جاتے ہیں اور جن کو انہوں نے مذکورہ نتائج تک پہنچنے میں مددگار پایا۔

میں نے دسمبر 1990ء میں عالمی دن (ورلڈ ڈے) پر نیویارک شہر میں مسلم فاؤنڈیشن آف امریکہ کے زیر اہتمام منعقدہ بینکوئٹ میں خطاب کیا۔ میں نے اس تقریر میں

سٹوارٹ کے جملوں کا حوالہ دیا اور رات گئے پانچ بانی ارکان کے ساتھ تبادلۂ خیال کے دوران میں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ سیاسی اعتبار سے فعال ہو جائیں۔ اس شام سلامتی کے حوالے سے مسلمانوں کے تفکرات بھی عیاں ہوئے۔ ہمارے میزبانوں نے پروگرام کے دوران بینکوئٹ ہال کے باہر اور ہمارے سونے کے کمروں کے باہر رات بھر کے لیے پہرے داروں (گارڈز) کا بندوبست کیا تھا۔

الی نائے واپس آ کر مجھے ڈاک کے ذریعے ایک چھوٹی سی کتاب ''ہمسائے: مسلمان شمالی امریکہ میں'' (Neighbours: Muslims In North America) موصول ہوئی۔ یہ مجھے حاصل ہونے والی پہلی ایسی مختصر اور پڑھنے میں آسان دستاویز تھی جس نے مسلمانوں کے بارے میں ایک دوستانہ اور انسانی تاثر قائم کیا۔ اسے ایک رومن کیتھولک پادری ریورنڈ ایلیاس میلن نے تحریر اور فرینڈشپ پریس نے شائع کیا تھا۔ اس میں مختلف پیشوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے 9 مسلمانوں کے مسحور کن انٹرویو پیش کیے گئے تھے۔ میلن نے اپنے تحریر کردہ تعارف میں لکھا: ''ہم نے ایک مذہب کو حقیقی انداز میں سمجھنا تب شروع کیا جب اس کا ایک پیروکار ہمارا دوست بنا۔''

برسوں بعد میرے ایک افریقی امریکی ہمسائے لوتھروارن نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا: ''جسے تم جانتے ہو' اس سے نفرت کرنا مشکل ہوتا ہے۔'' اسرائیل کی ایک یہودی اداکارہ بین المذہبی اتحاد و اتفاق کا ایک خوش آمدیدی پیغام تب لے کر آئی جب وہ 1993ء میں امریکہ منتقل ہوئی۔ ملی اویٹل اسرائیل میں بہت نامور اداکارہ بنیں اور اب اے بی سی کی تیار کردہ ''الف لیلیٰ'' میں شہرزاد کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ جب ان سے عرب اسرائیل تنازعے کے پس منظر میں سوال کیا گیا کہ ایک عرب عورت کے کردار میں وہ کیسا محسوس کر رہی ہیں تو انہوں نے جواب دیا: ''میرا تعلق اس نئی نسل سے ہے جو ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ دنیا میں جتنی زیادہ ثقافتیں ہوں گی اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اور اگر میں اپنے فلسطینی ہمسایوں کا کردار ادا کرتی ہوں تو یہ بہت ہی اچھا ہے۔ وہ ایک خوب صورت ثقافت کے حامل ہیں۔'' 2

میں نے نیویارک سٹی والے تجربے کے بعد لیکچروں اور گفتگوؤں میں میلکم سٹوارٹ کے نظریے کو بار بار پیش کیا اور ''ہمسائے'' کو ضرور پڑھنے کا مشورہ دیا۔ ایک موقع اپریل 1991ء میں ٹیمپا' فلوریڈا میں دستیاب ہوا جب میں نے مقامی اسلامی سوسائٹی کے ایک ڈنر اجلاس میں خطاب کیا۔ میں اس سے پہلے دن مسلمان بچوں کے لیے قائم کیے گئے

ایلیمنٹری سکول کا دورہ کر چکا تھا اور میں نے دیکھا کہ اردگرد کے علاقے کو' جو بھی حال تھا' مسلمان رضا کاروں نے صاف کر کے دیدہ زیب بنا دیا تھا۔ میرے میزبان نے وضاحت کی: ''ہمارے صفائی کے پروگرام کا مقصد صرف مسلمانوں کی مدد کرنا ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کوئی مسلمان نہ تو یہاں کسی جائیداد کا مالک ہے اور نہ کسی طریقے سے براہ راست مالی فوائد حاصل کرتا ہے۔ ہم تو بس اچھے ہمسائے بننا اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مسلمان ٹیمپا کو رہنے کے لیے ایک بہتر جگہ بنانے میں مدد دے کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔''

میں نے اگلی فروری میں نیوجرسی میں مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ جماعتی سیاست میں حصہ لیں۔ میں نے پہلے یہ تاکید میٹیک کے ایک پبلک مڈل سکول میں لیکچر کے دوران کی' پھر ایک نزدیکی مسجد میں اجتماع کے روبرو۔ مسجد سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ میں اپنے کانگرس کے زمانے میں کم از کم ایک مسلمان کی نمائندگی کر چکا ہوں۔ محمد شاکر ان افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے میری تقریر کے بعد ستائشی کلمات ادا کیے۔ جب وہ کالج میں طالب علم تھے اور ایلٹن' الی نائے کے ایک ہوٹل میں جز وقتی (پارٹ ٹائم) ڈیسک کلرک کا کام کرتے تھے تو میں کبھی کبھار اس ہوٹل میں ٹھہرا کرتا تھا۔ یہ علاقہ میرے ضلع میں ہے۔

ستمبر 1993ء میں رفیق جبار نے' جو فلسطینیوں کے حقوق کے ایک ان تھک چیمپئن ہیں اور جنہوں نے بعد کے برسوں میں مجھ پر مسلمانوں کے دروازے متواتر کھولے' شکاگو میں ایک میٹنگ کا اہتمام کیا' جہاں میں نے ایک بار پھر مسلمانوں کو سیاسی عمل میں شریک ہونے کی تاکید کی۔

میرا اگلا پڑاؤ سان جوز' کیلی فورنیا تھا جہاں کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز (CAIR) نے ''مسلم فعالیت کی دعوت'' کے یک روزہ پروگرام کا اہتمام کیا تھا۔ میں اس تنظیم کی امریکی مسلمانوں کے شہری حقوق کے لیے خصوصاً کام کے مقام (ورک پلیس) پر' خدمات کا طویل عرصے سے معترف تھا لیکن میرے علم کے مطابق یہ کسی مسلمان گروپ کی طرف سے ایسا پہلا اجلاس تھا جس میں مسلمانوں کو تاکید کی گئی کہ وہ سیاست میں فعال ہوں۔

سہ پہر میں ہونے والے طویل شاندار مباحثے میں ڈیڑھ سو افراد نے شرکت کی' جن میں زیادہ تر لوگ مسلمان تھے۔ اس مباحثے میں' کم از کم میرے لیے تو ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک افریقی امریکی امام تقریر کرتے ہوئے

ڈیموکریٹک اور ری پبلکن دونوں پارٹیوں پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ امریکہ کا سیاسی نظام اس قدر بدعنوان (کرپٹ) ہے کہ مسلمانوں کو اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ ''میں اپنے لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ سیاست اور سیاست دانوں سے پرے ہی رہیں۔'' مجھ سمیت دوسرے مقرروں نے مسلمانوں کو اس کے برعکس تاکید کی اور کہا کہ انتخابات میں رہنما کردار ادا کریں اور پارٹی یا انفرادی امیدواروں کی مہمات میں حصہ لیں۔

یہ تجربات امریکی مسلمانوں کے سیاسی امکانات پر میرے ایک مضمون لکھنے کا پیش خیمہ بنے۔ یہ مضمون ''واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز'' کے اکتوبر 1992ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ ایک دوماہی رسالہ ہے جو عرب اسرائیل جھگڑے میں دلچسپی رکھنے والے افراد میں بہت زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ میں نے اس مضمون میں اسلام کے حوالے سے عام پائے جانے والے باطل تصورات کا ذکر کیا اور بتایا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مسلمانوں کو امریکی شہریت کے مکمل مواقع اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے پیش گوئی کی کہ وہ اسلام کے حوالے سے پھیلے ہوئے ان باطل تصورات کی اصلاح میں معاونت کرسکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کی داخلی اور خارجی پالیسی پر بھرپور اور تعمیری اثر ڈال سکتے ہیں۔ میں نے نشاندہی کی کہ بیشتر مسلمان صنعتی ریاستوں میں رہتے ہیں جہاں وہ صدارتی انتخابات میں خصوصیت کے ساتھ مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ میں نے خبری ذرائع ابلاغ پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ میں نے لکھا کہ ذرائع ابلاغ میں مسلمان دشمن تعصب کے کسی بھی اظہار کی اصلاح کا مطالبہ کیا جانا چاہیے۔ جھوٹے یک رخے تصورات کو مٹانے کے لیے یہ ایک جوہری اقدام ہوگا اور میں نے کہا اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان امریکی شہریوں کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کریں۔

بیرون ملک موجود ایک مسلمان رہنما نے میرا مضمون پڑھا اور مجھے مسلمانوں کے حوالے سے یک رخے تصورات پر ایک ورکشاپ میں شرکت کی دعوت دی۔ یہ تقریب ملائیشیا میں ستمبر 1996ء میں انٹرنیشنل موومنٹ فار اے جسٹ ورلڈ (منصفانہ دنیا کے لیے بین الاقوامی تحریک) کے زیراہتمام منعقد ہورہی تھی۔ میں نے اس دعوت کو قبول کرلیا کہ یہ اسلام کے بارے میں مزید جاننے اور امریکہ میں مسلمانوں کے حوالے سے پھیلے ہوئے باطل تصورات کی اصلاح کے لیے میرے تجویز کردہ اقدامات کی آزمائش کا ایک موقع تھا۔

اس کانفرنس میں 23 ملکوں سے 44 مندوبین نے شرکت کی۔ امریکہ سے مجھ

سمیت چھ مندوبین آئے تھے۔ ہر کسی نے پہلے سے لکھا ہوا مقالہ پڑھا اور اس کے بعد ہونے والی بحث میں بھرپور حصہ لیا۔ میں نے اسلام کا وہ خوفناک تصور پیش کیا جسے بیشتر امریکی حقیقی مانتے ہیں: "بیشتر امریکی مسلمانوں کو اگر خوف سے نہیں تو تشویش سے ضرور دیکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو تشدد اور ایک ایسی مذہبی جدوجہد کے سرچشمے کی حیثیت سے دیکھتے جو عیسائیت' ہمارے نظام حکومت اور ہماری بنیادی آزادیوں کے لیے ایک خطرہ ہے۔ انہیں یقین ہے کہ مسلمان مرد عورتوں سے بدسلوکی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ بے جان املاک جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ اسلام کو دوسرے مذاہب کے لیے عدم رواداری تصور کرتے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ امریکی مسلمان اپنی شرم سے چھٹکارہ پا کر ان جھوٹے تصورات کو درست کرنے کے ایک جارحانہ پروگرام کو شروع کریں۔ انہیں اسلام کے حوالے سے سچ کو پھیلانے میں لازماً پہل کرنا ہوگی۔"

آخری اجلاس میں تنظیم کی ڈائریکٹر ڈاکٹر چندرا مظفر نے' جو مسلمان ہونے سے پہلے ہندوستانی نژاد ہندو تھیں' ہر شریک کار سے پوچھا کہ وہ ان مخصوص اقدامات کے بارے میں بتائے جن پر وہ واپس جا کر عمل کرے گا۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اسلام کے بارے میں ایک ایسا مختصر سا مضمون لکھوں گا جسے امریکی مسلمان با آسانی اپنے غیر مسلم ہمسایوں کو دے سکیں۔ اپنے اس فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ امریکی مسلمان بوجوہ اپنے ہمسایوں کو اپنے عقیدے کے بارے میں بتانے سے جھجکتے ہیں۔ میں نے مزید کہا کہ عیسائی جو اپنے ہمسایوں کے عقیدے سے آگاہ نہیں ہیں ان سے افہام و تفہیم کے لیے پہل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنے مضمون میں ان مقاصد پر زور دینے کا وعدہ کیا جو مسلمانوں' عیسائیوں اور یہودیوں میں مشترک ہیں۔ نیز ایسے حقائق کو بیان کرنے کا وعدہ کیا جو جھوٹے یک رخے تصورات کی اصلاح میں مدد و معاون ہوں۔

الی نائے واپس پہنچ کر میں نے ٹیلی فون اور ڈاک کے ذریعے چھ مہینوں تک مسلمان لیڈروں اور بہت سے عیسائی عالموں سے مشورہ کیا اور اسلام کے حوالے سے ایک جامع بیان تحریر کیا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے ہر قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

تیس سے زیادہ لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا' جن میں "نیشنل جیوگرافک" رسالے کے ریٹائرڈ سینئر مدیر تھامس جے۔ ایبر کرومی بھی شامل تھے۔ اس تیس سالہ نو مسلم سے میری پہلی ملاقات 1983 میں تب ہوئی تھی جب میں

لکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھے تفصیل کے ساتھ مشورے دیئے۔ دیگر افراد میں فورٹ ورتھ کے فزیشن عنایت لالانی' نیش وائل کے دو مسلمان رہنما ڈاکٹر نور ناصری اور ان کی بیوی زینب البری' ملائیشیا میں قائم "منصفانہ دنیا کے لیے بین الاقوامی تحریک" کی صدر ڈاکٹر چندرا مظفر اور لانگ آئی لینڈ کے اسلامی مرکز کے ڈائریکٹر الحاج غازی وائی۔خانکن شامل تھے۔

چوبیس سے زیادہ خاکوں کے بعد آخری متن بعنوان "آپ کے مسلمان ہمسایوں کی طرف سے ایک دوستانہ بیان" سامنے آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اس لازمی سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک اہم سنگ میل تک پہنچ گیا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ دستاویز اچھے امکان کی حامل ہے کیونکہ یہ شخصی اظہار کا ایک آسان ذریعہ فراہم کرتی ہے' جو کہ ابلاغ کی مثالی سطح ہوتی ہے۔ میں شکاگو' سینٹ لوئیس' ڈیٹرائٹ' لاس اینجلس' این آربر' فلاڈیلفیا' پٹس برگ' ٹورنٹو' ڈلاس' سان فرانسسکو' ایتھنز اور جارجیا میں اس کی نقول تقسیم کر چکا ہوں جبکہ ڈاک کے ذریعے بھی بہت سے لوگوں کو فراہم کر چکا ہوں۔

لیکن مجھے حقیقت پسند ہونا پڑا۔ چونکہ انسانی شرکت کا متبادل کوئی نہیں اس لیے "دوستانہ بیان......" محدودات کا حامل ہے۔ بیشتر امریکیوں کا کوئی مسلمان نہ تو قریبی ہمسایہ ہے اور نہ دور کا' نہ ہی محلے دار ہے۔

یہ امر واضح ہوگیا کہ ایک ایسی کتاب جو عیسائیت اور اسلام دونوں مذاہب کی مشترکہ خصوصیات کو اجاگر کرے وہ معاون ثابت ہوگی۔ کتابیں ایک خاص لافانیت کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ ایک گھرانے سے دوسرے اور ایک نسل سے اگلی نسل تک زندہ رہتی ہیں۔ میرے ذہن میں یہی خیالات تھے جب میں نے زیر نظر کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔

تاہم کتابیں بھی محدودیتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ نسبتاً کم تعداد میں امریکی مطالعے کے لیے وقت نکالتے ہیں' سو عوامی رائے — اور حکومتی پالیسی — پر کتابوں کا اثر کبھی کبھار ہی فوراً پڑتا ہے۔ جب میں نے غور کیا کہ کون سے اقدامات کیے جانے چاہئیں تو میرا خیال ٹیلیویژن کی طرف گیا' جو ایک ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس کو میں مختصر دورانیے میں لاکھوں لوگوں پر اثر انداز ہونے کا بہترین وسیلہ تصور کرتا ہوں۔ ٹیلی ویژن کے اشتہارات مختلف اشیائے فروخت' مقاصد اور تصورات کی ترویج میں مؤثر ثابت ہوئے ہیں اور میں نے نتیجہ نکالا کہ یوں اسلام کے حوالے سے پھیلے ہوئے یک رخے تصورات کی اصلاح تیزی سے ہوسکتی ہے۔

ہمارا بیٹا کریگ، جو ایک تعلقات عامہ کی فرم فنڈ لے ایسوسی ایٹس کا مالک ہے، ایک تجربہ کرنے پر متفق ہو گیا۔ 1997ء میں اس نے امریکی مسلمانوں کے بارے میں ایک تیس سیکنڈ کے ٹیلی ویژن پیغام کی تیاری کے لیے رقم فراہم کر دی۔ اس دوران میں تین متاثر کن اشخاص یعنی زوگبی برادران، جیمز، جان اور ولیم بیکر سے ازسرنو شناسا ہوا، جن سے میں برسوں پہلے مل چکا تھا۔ وہ تینوں مختلف پیشوں میں ہیں تاہم وہ اپنی زندگی بھر پر محیط انسانی حقوق کی جدوجہد میں متحد ہیں۔ وہ عیسائی ہیں لیکن مسلمانوں میں خاصے معروف ہیں، جو ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ میں ان تینوں سے اپنی کتاب They Dare To Speak Out تحریر اور فروخت کرنے کے دوران شناسا ہوا تھا۔

ڈاکٹر جیمز زوگبی عرب امریکن انسٹی ٹیوٹ کے بانی اور ڈائریکٹر ہیں اور وہ 1985ء میں میرے ملک گیر کتابی دورے (Book Tour) کا انتظام کرنے والی تنظیم ''امریکی عرب امتیاز مخالف کمیٹی'' (American-Arab Anti-Discrimination Committee) کے سابقہ ایگزیکٹو ڈائریکٹر ہیں۔ جب مشرق وسطیٰ کے مسائل پر مباحثہ ہو تو انہیں اکثر ٹیلی ویژن پر مدعو کیا جاتا ہے اور وہ ڈیموکریٹک پارٹی کی سیاست کے ایک جارحیت پسند نقاد ہیں۔

جان، جو کہ سروے کرنے والے فرم زوگبی انٹرنیشنل کے بانی اور مالک ہیں، کئی برس اپنے بھائی کے سائے میں رہے لیکن اب وہ اپنی صلاحیتوں کے بل پر ممتاز حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ سیاسی مبصران کے حوالے اکثر دیتے ہیں اور اپنے عوامی رائے کے سروے کے سلسلے میں ٹیلی ویژن پر ان کے انٹرویو نشر ہوتے رہتے ہیں۔ میں پہلی بار جان زوگبی سے 1985ء میں اس وقت ملا تھا جب وہ ''امریکی عرب امتیاز مخالف کمیٹی'' میں ملازمت کرتے تھے۔ ہم ایک دورے کے دوران، جس نے میری کتاب اور ان کے ادارے کو مشہور کیا، اکثر مسجدوں میں اکٹھے خطاب کیا کرتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی تقریریں اتنی کثرت سے سنتے تھے کہ میں مذاقاً انہیں تسلی دیا کرتا تھا کہ اگر کبھی وہ تقریر کے دوران اٹک گئے تو میں لقمہ دوں گا جبکہ میں جانتا تھا کہ میری تقریر کی باری ہو گی تو وہ بھی یہی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

جان زوگبی اور بیکر سے کبھی کبھار کی مراسلت کے ایک عشرے بعد وہ دوبارہ میری زندگی میں اسلام کی ٹیلی ویژن پر ترویج کے کریگ والے تجربے کے دوران آئے۔ ٹیلی ویژن کا پیغام تیار کرنے سے پہلے کریگ نے اسلام کے حوالے سے عوامی رجحانات کے اعداد و شمار ڈھونڈے۔ میری تجویز پر اس نے جوابات کے حصول کے لیے زوگبی انٹرنیشنل کی

خدمات حاصل کیں۔

غیر مسلموں میں اسلام کے حوالے سے غلط فہمیوں کو جانچنے کے لیے زوگبی کی ٹیم نے درج ذیل چار مختلف مارکیٹوں میں سے ہر ایک میں چار سو افراد کو ٹیلی فون کیے: ٹیکوما واشنگٹن' ولکس بیری پینسلوانیا' چارلسٹن ویسٹ ورجینیا اور وچیتا کنساس۔ ہر شخص سے سوالات کے دو سیٹ دریافت کیے گئے۔

پہلے سیٹ میں سروے کرنے والوں نے پہلے سے کسی کے بارے میں بھی پس منظر فراہم کیے بغیر 9 مختلف مذاہب کے بارے میں ردعمل اکٹھے کیے۔ نتائج نے منفی یک رخے تصورات کے غلبے کی توثیق کر دی۔ جن لوگوں کا سروے کیا گیا انہوں نے اسلام یا مسلمانوں' بدھ مت اور ہندومت کے حوالے سے زیادہ مخالفانہ ردعمل ظاہر کیے۔

	حامی (فیصد)	مخالف (فیصد)
پریسبائٹیرین	84	9
یہودیت یا یہودی	74	14
رومن کیتھولک	72	16
لوتھرن	70	10
بنیاد پرست عیسائی	51	20
مورمن	45	35
اسلام یا مسلمان	37	40
بدھ مت	37	40
ہندومت	34	39

اس کے بعد زوگبی کی ٹیم نے اسلام یا مسلمانوں کے حوالے سے بیانات پر ردعمل دریافت کیے۔ صرف 33 فیصد جواب دہندگان نے لفظ اسلام کا حامیانہ جواب دیا جبکہ نصف نے کہا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ''امتیازی رجحان'' محسوس کرتے ہیں۔ بیس فیصد محسوس کرتے تھے کہ ''امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے''۔ تینتیس فیصد لوگوں نے امریکہ نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کی تعداد کو محدود کرنے کی حمایت کی۔

چالیس فیصد نے کہا کہ سکولوں کے کیفے ٹیریا میں مسلمانوں کے غذائی تقاضوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ تینتیس فیصد نے مسلمانوں کو ہر جمعے کے دن نماز کے لیے رخصت دینے کی مخالفت کی۔ چھیالیس فیصد لوگوں نے مسلمانوں کی تعطیلات پر انہیں تنخواہ سمیت چھٹی دینے کی مخالفت کی۔ چھیالیس فیصد لوگوں نے کہا کہ مسلمان مذہبی جنون کی طرف مائل ہیں۔ تینتیس فیصد لوگ یقین رکھتے تھے کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے حوالے سے عدم رواداری ہیں۔ پچاس فیصد لوگوں کو یقین تھا کہ مسلمان صاف ستھری اور باوقار زندگی بسر کرتے ہیں جبکہ سولہ فیصد نے اس سے اختلاف کیا۔

جوابات کے مذکورہ رجحان سے حیرت انگیز اختلاف کے ساتھ 75 فیصد لوگوں نے کہا کہ ملازمت پیشہ مسلمان عورتوں کو سر ڈھانپنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

سوالات کے آخری سیٹ میں مبنی برحقیقت بیانات پر ردعمل اکٹھے کیے گئے۔ نتائج بڑے اہم تھے:

بیان	مثبت ردعمل کا اظہار کرنے والے
مسلمان انصاف' خاندانی ذمہ داری اور رواداری کا عہد کیے ہوئے ہیں۔	54
مسلمان حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی روایات کا احترام کرتے ہیں اور عیسائیوں اور یہودیوں جیسی اخلاقی اقدار کے حامل ہیں۔	51
مسلمان عورتیں جائیداد کی ملکیت' کاروبار' ملازمت اور عوامی زندگی کا حق رکھتی ہیں نیز وہ طلاق کا حق بھی رکھتی ہیں۔	46
مسلمان دہشت گردی اور جبرواستبداد سے سخت نفرت کرتے ہیں۔	43
مسلمان بھی اسی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جس کو یہودی اور عیسائی مانتے ہیں۔	83

جب مذکورہ سروے [5] کا موازنہ 1993ء میں امریکن مسلم کونسل کے لیے کیے گئے زوگبی انٹرنیشنل کے ایسے ہی سروے سے کیا گیا تو انکشاف ہوا کہ مذہبی رواداری میں قدرے بہتری رونما ہوئی ہے۔[6]

سروے کے نتائج اتنے حوصلہ افزا تھے کہ کریگ نے تیس سیکنڈ کے ایک ٹیلی ویژن پیغام کی تیاری کے لیے ایک پیشہ ور فرم کی خدمات مستعار لیں۔ الفاظ اور تصاویر کے ایک سلسلے (سیریز) میں یہ موقف واضح کیا گیا کہ امریکی مسلمان اپنے غیر مسلم ہمسایوں سے بہت سی خصوصیات میں اشتراک رکھتے ہیں۔ اس کا متن یہ ہے: ''امریکی مسلمان۔ ہم یہ یقین رکھتے ہیں...... کہ سب لوگوں کو امن کے لیے عبادت کرنے کی آزادی ہے...... اپنے اپنے طریقے سے خدا کی عبادت کرنے کی...... اپنے خاندانوں کو ترقی دینے کی...... حضرت عیسیٰ کا احترام کرنے کی...... ایسے مستقبل کی امید کرنے کی، جو سب لوگوں کا احترام کرتا ہو...... اپنی مختلف مذہبی رسوم ادا کرنے کی...... اور ہمیشہ صبر و تحمل کی۔ امریکی مسلمان۔ آپ کی سوچ سے بھی زیادہ باتیں مشترک ہیں۔''

اس پیغام کو 1998ء کے موسم گرما کے دوران واشنگٹن ڈی۔سی کے علاقے میں اس وقت ایک محدود آزمائشی مہم میں نشر کیا جب کانگرس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ آزمائش سے پہلے ٹیلی فون انٹرویو کرتے ہوئے زوگبی فرم نے تین سو افراد سے چھبیس سوالات پوچھے۔ ممکنہ ناظرین پچیس سے چون سال کی عمر کے درمیان کے بالغ افراد پر مشتمل تھے۔ اس گروپ کے بارے میں توقع تھی کہ اسلام کے بارے میں ان کا علم اوسط سے زیادہ ہے۔ ان نشریوں کو نیوز پروگراموں مثلاً ''میٹ دی پریس'' اور ''فیس دی نیشن'' کے دوران موسم گرما کے اوائل میں آٹھ ہفتوں میں پیش کیا جانا طے پایا۔ جولائی کے اواخر میں تین سو آٹھ ایسے افراد سے جنہوں نے ٹیلی ویژن اشتہار دیکھا تھا، وہی سوالات پوچھے گئے۔

بیان	مہم سے پہلے متفق (فیصد)	مہم کے بعد متفق (فیصد)
مسلمانوں کی اکثریت دہشت گردی کرتی ہے۔	51	61
مسلمان مذہبی جنونیت کی طرف مائل نہیں ہیں۔	45	55
مسلمان دوسروں کے لیے روادار ہیں۔	37	42

مسلمان صاف ستھری اور باوقار زندگی بسر کرنے کی طرف مائل ہیں۔	62	69
اگر مسلمان عورتیں چاہیں تو انہیں کام کے دوران اپنی روایت کے مطابق سر ڈھانپنے کی اجازت ہونی چاہیے۔	76	79
مسلمان حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا احترام کرتے ہیں۔	34	34
مسلمانوں کو جمعہ کی نماز کے لیے چھٹی دی جانی چاہیے۔	53	62
مسلمانوں کو اسلامی تعطیلات پر تنخواہ سمیت چھٹی دی جانی چاہیے۔	45	52
میں مجموعی طور پر مسلمانوں کے لیے حامی تاثرات رکھتا ہوں۔	49	55
سی این این کے باقاعدہ ناظرین کا مسلمانوں کے بارے میں مجموعی تاثر۔	42	65

اس سروے سے نکتہ ہائے نظر میں مثبت تبدیلی کا انکشاف ہوا ہے جبکہ لوگوں کی تعداد کا انحصار عمر، تعلیم، صنف اور ٹیلی ویژن دیکھنے کی عادت پر ہے۔

نوجوان 65 برس کی عمر والے افراد کی نسبت مسلمانوں کے لیے زیادہ روادار تھے جبکہ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ روادار نکلیں۔ مسلمانوں کے بارے میں منفی احساسات ان لوگوں میں کم پائے گئے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

سب سے زیادہ ڈرامائی بہتری ان لوگوں میں رونما ہوئی جو سی این این باقاعدگی سے دیکھتے ہیں۔ ٹیلی ویژن مہم سے پہلے 42 فیصد لوگوں نے مسلمانوں کے بارے میں حامیانہ تاثرات کا اظہار کیا تھا' اب یہ تعداد 65 فیصد تک پہنچ گئی یعنی 23 فیصد کا اضافہ ہوا۔ جن لوگوں سے رائے لی گئی ان کا مجموعی حامیانہ تاثر 48 فیصد سے بڑھ کر 55 فیصد ہو گیا یعنی 7 فیصد بہتری آئی۔

اس تجزیے سے ظاہر ہوا کہ چھ ہفتوں پر محیط اس مہم کی وجہ سے مسلمانوں کے بارے میں بہت سے موضوعات پر بہتر افہام و تفہیم پیدا ہوئی۔ جان زوگبی نے اس بہتری کو ''حقیقتاً غیر معمولی'' قرار دیا۔ انہوں نے مزید کہا: ''ممکن ہے اس کو معمولی بہتری کہا جائے تاہم مہم کے اختصار کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بہت زیادہ ہے۔ اگر زیادہ وسیع مہم چلائی جائے تو زیادہ مثبت نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔'' 7

اس سروے کے نتائج ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور اسلام کے لیے بہت سے امریکی کشادہ ذہن رکھتے ہیں اور اگر انہیں حقائق کے بارے میں تھوڑی سی بھی آگہی فراہم کی جائے تو وہ مثبت ردعمل کا اظہار کریں گے۔ اگر رقوم دستیاب ہوتیں تو تیس سیکنڈ والا اشتہار اور دیگر ایسے ہی ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والے پیغام لاکھوں امریکیوں میں اسلام کے حوالے سے جھوٹے تصورات تیزی سے ختم ہونے کا پیش خیمہ بن سکتے تھے۔

جس دن زوگبی کے ٹیلی ویژن تجربے کا جائزہ میری ڈیسک پر پہنچا اسی دن ایک اہم اتفاق وقوع پذیر ہوا۔ مجھے ڈاک کے ذریعے ولیم بیکر کی نئی کتاب ''آپ کی سوچ سے زیادہ اشتراک: اسلام اور عیسائیت کے درمیان پل'' ملی۔ اس کتاب کے عنوان سے ہی پتا چلتا تھا کہ اس کتاب میں اسی خیال کو پیش کیا گیا ہے جو کریگ کے ٹیلی ویژن پیغام میں نشر کیا گیا تھا۔ بیکر مشرق وسطیٰ میں کام کرنے والے سابق ماہر آثار قدیمہ اور تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

بیکر نے اس جامع' قابل مطالعہ' معلومات افزا اور ولولہ انگیز کتاب میں ایسے مشترک اصول اور عقائد پیش کیے ہیں جو مسلمانوں اور عیسائیوں کو مل کر عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خیال کی تائید میں قرآن مجید اور بائبل سے ایسے حوالے دیئے ہیں جو ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔ کسی بھی ایسے فرد کے لیے' جو اسلام اور عیسائیت کو جوڑنے والے پل کو عبور کرنے کا خواہاں ہو' اس کتاب کا مطالعہ ایک شاندار تجربہ ہوگا۔

وہ انصاف سے کام لینے کی اپیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اگر مسلمانوں اور مذہب اسلام کے بارے میں فیصلہ ان چند لوگوں کے نظریات و اعمال کی روشنی میں کرنا ہے جو تشدد' نفرت اور موت کا پرچار کرتے ہیں تو پھر عیسائیوں اور عیسائیت' یہودیوں اور یہودیت' بدھوں اور بدھ مت سبھی کے بارے میں ٹھیک انہیں معیارات پر فیصلہ کیا جانا چاہیے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں: ''گناہ کا اسلامی تصور گناہ کے انجیلی تصور سے مشابہہ بھی ہے اور ممتاز بھی۔ اس کے مطابق انسان ایک آزاد اخلاقی کارندہ ہے جو خیر یا شر کے کام کرنے اور

اللہ کے احکامات کی اطاعت یا نافرمانی میں انتخاب کی اہلیت رکھتا ہے' تاہم کسی پیدائشی گناہ کے بغیر اس جہاں میں آنکھ کھولتا ہے۔ اسلام اس بات کا درس دیتا ہے کہ انسان پیدائشی گناہگار نہیں بلکہ پیدائشی ولی ہوسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ سب انسان معصوم' خالص' سچے آزاد اور خدا کی عبادت اور نیکی کرنے کی سرشت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔'' 9

یہ کتاب ایک وسیع اور متنوع گروپ یعنی عیسائیوں میں بہت زیادہ پسند کی جائے گی کیونکہ امریکہ کی معروف ترین عیسائی مذہبی شخصیت ریورنڈ رابرٹ ایچ۔ شلر نے اس پر حامیانہ تبصرہ لکھا ہے۔ وہ لاس اینجلس کے کرسٹل کیتھڈرل کے بانی اور ہر ہفتے دنیا بھر میں نشر کیے جانے والے پروگرام ''آور آف پاور'' (Hour of Power) کے میزبان ہیں۔ بیکر اسلامی معاملات پر ان کے مشیر کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

شلر مسلمانوں اور عیسائیوں میں افہام و تفہیم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ولیم بیکر کی یہ کتاب عیسائیوں اور مسلمانوں کے امن اور باہمی احترام کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔'' 10 شلر نے ایسوسی ایٹس کو بتا دیا کہ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے منصب کو عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین افہام و تفہیم پیدا کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔ 11

یقیناً مسلمان اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے صدر اور انتہائی قابل احترام مسلمان رہنما ڈاکٹر مزمل صدیقی کے تجزیے سے متاثر ہوں گے۔ ولیم بیکر کی کتاب کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر صدیقی تحریر کرتے ہیں ''آج ہم مسلمان اور عیسائی تعداد کے اعتبار سے دنیا کی کل آبادی کا نصف ہیں۔ ہمارے درمیان بہتر افہام و تفہیم' ابلاغ اور پرامن تعلقات نہ صرف اچھے بلکہ نہایت لازمی ہیں۔ ہمارے درمیان ہماری سوچ سے بھی زیادہ امور مشترک ہیں'' 12

''آپ کی سوچ سے زیادہ مشترک'' میں اسلام' عیسائیت اور یہودیت کی مشترکہ جڑوں اور شاخوں کی شہادتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ولیم بیکر باب نمبر 4 میں لکھتے ہیں: ''چند ہی عیسائی اس امر سے آگاہ ہیں کہ رسول اللہ حضرت محمد ﷺ' حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کو اللہ کے جلیل القدر پیغمبر مانتے تھے جو توریت اور انجیل کی شکل میں انسانوں کے لیے اللہ کا پیغام لائے تھے۔ اسلام دونوں کتابوں...... توریت اور انجیل...... کا احترام کرتا ہے اور انہیں انسانیت کو وحی کے ذریعے بھیجا ہوا اللہ کا پیغام مانتا ہے...... مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن

اللہ کی آخری کتاب اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔''[13]

ولیم بیکر لکھتے ہیں کہ ''گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین بہت سی جنگیں لڑی گئی ہیں'' اور ''خدا کے نام پر بہت سی غلطیاں اور ظالمانہ کام کیے گئے ہیں کیونکہ' مسلمان اور عیسائی دونوں اپنے اپنے مذہب کی روح پر عمل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔''[14]

وہ بتاتے ہیں کہ اسلام کی تیز رفتار توسیع کے دوران شریعت کے مطابق مفتوح لوگوں کے ساتھ مذہبی رواداری برتی جاتی تھی: ''شاید رواداری اور پرامن بقائے باہم کی بہترین صورت گری حضرت محمد ﷺ نے میثاق مدینہ کے ذریعہ کی ہے۔ مسلمانوں' یہودیوں اور مدینہ کے دیگر رہائشیوں کے مابین ہونے والے اس معاہدے میں سب مذاہب کے ماننے والوں کی مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے اور ان کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا ہے۔'' اس زمانے میں اس علاقے میں بہت کم عیسائی رہتے تھے۔

شام کے مفتی اعظم شیخ احمد قفطرو نے 1987ء میں ولیم بیکر کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کہا: ''میرے عزیز بھائی! آپ اس وقت تک ایک سچے مسلمان نہیں ہو سکتے جب تک آپ حضرت عیسیٰؑ سے محبت و عقیدت نہیں رکھتے۔'' قفطرو نے مزید کہا کہ اسلام اور عیسائیت دونوں میں اللہ سب اشیائے کائنات کا مالک ہے بشمول نوع انسان کی انفرادی و اجتماعی حوالے سے تقدیر کے' اور بات اس نتیجے پر ختم کی کہ ''قرآن اور بائبل میں خدا کو مساوی طور پر قادر مطلق کہا گیا ہے۔''[16]

بین المذاہب افہام و تفہیم اور امن کی جستجو میں ولیم بیکر اور جان ویلیش' جو ایک ادیب اور ہارپر پبلیکشنز کے سابق بیورو چیف برائے واشنگٹن ہیں' لوگوں میں بین الثقافتی اور بین المذہبی ہم آہنگی کے الگ الگ منصوبوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ بیکر ایک تنظیم ''عیسائی اور مسلمان برائے امن'' (Christian and Muslims for Peace—CAMP) کے بانی صدر ہیں۔ اس تنظیم کی شاخیں دنیا کے بہت سے ملکوں میں قائم ہیں۔ ہر شاخ عیسائی اور مسلمان نوجوانوں میں بین المذہبی اتفاق کے لیے ایک سمر کیمپ کا انتظام کرتی ہے۔

ویلیش نے' جو کہ نازی جرمنوں کے ظلم و ستم سے بچ نکلنے والے والدین کے بیٹے ہیں' صحافت کے کامیاب پیشے کو چھوڑ دیا تاکہ مائن میں' جہاں اسرائیل سے آئے ہوئے یہودی اور عرب سے آئے ہوئے مسلمان نوجوان زیادہ تر آباد ہیں' ایک سمر کیمپ کا انتظام کریں جس میں انہیں ایک دوسرے کی ثقافت اور مذہب کے بارے میں بتایا جائے۔ اس

پروجیکٹ کو "سیڈز آف پیس انٹرنیشنل" (Seeds of Peace International) کہا جاتا ہے۔ ہر موسم گرما میں تین تین ہفتوں کے تین کیمپوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ولیلیش ہر کیمپ کو اس چیلنج کے ساتھ کھولتے ہیں: "یہ دنیا کی واحد جگہ ہے جہاں اسرائیلی اور عرب غیر جانبدارانہ بنیادوں پر اور دوست بننے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اپنی باری پر آپ یہاں کیا کرتے ہیں' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں' میں تو آپ میں سے ہر ایک سے یہی چاہتا ہوں کہ وہ دوسری طرف ایک نہ ایک دوست ضرور بنائے۔"[17]

قومی سطح پر بہت سے عیسائی اسلام کو سیاسی سایوں سے نکالنے کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

پروفیسر جان ایل۔ ایسپوزیٹو (John L.Esposito) واشنگٹن ڈی۔سی میں واقع جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے سکول آف فارن سروس میں مرکز برائے مسلمان عیسائی افہام وتفہیم کے ڈائریکٹر ہیں۔ یہ مرکز بین الاقوامی سطح پر بین المذہبی مکالمے کو فروغ دیتا ہے۔ پروفیسر ایسپوزیٹو نے چار جلدوں میں "آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا آف دی ماڈرن اسلامک ورلڈ" مرتب کیا ہے۔ اسلام کے بارے میں معلومات کا یہ جامع ترین مجموعہ 1995ء میں شائع ہوا۔ وہ جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں مذہب اور بین الاقوامی معاملات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہیں' کتابیں اور مقالے قلمبند کرتے نیز بین الاقوامی سیمینار منعقد کرواتے ہیں۔ وہ بیس کتابوں کے مصنف ہیں' جن میں "اسلامی خطرہ: فسانہ یا حقیقت؟" (The Islamic Threat: Myth or Reality?) اور الٰہیات کے طلبا کے لیے ایک مستند دستاویز بن جانے والی کتاب "اسلام: الصراط المستقیم" (Islam:The Straight Path) شامل ہیں۔

دو اور عیسائی ریٹائرڈ سفارت کار رچرڈ ٹی۔ کرٹس اور اینڈریو آئی۔ کل گور ایک رسالہ شائع کرتے ہیں جو دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ امریکیوں کو اندرون ملک اور بیرون ملک مسلم سیاست سے روشناس کرواتا ہے۔ اگر ایک معاہدۂ امن وجود میں آتا ہے تو ان کی مساعی اعلیٰ اعزاز کی مستحق ہوں گی۔

کرٹس اور کل گور امریکی فارن سروس میں طویل عرصہ خدمات انجام دینے کے بعد جریدی صحافت کی طرف آئے اور دو ماہا رسالے "واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز" کے بالترتیب مدیر اور پبلشر کی حیثیت سے 2000ء میں ان کا دوسرا عشرہ شروع ہوا۔ وہ

ریٹائرمنٹ کا زمانہ دھوپ تاپنے اور گولف کھیلنے کی بجائے بغیر کسی معاوضے کے رسالے کے دفتر میں گھنٹوں کام کر کے گزار رہے ہیں۔ مزید برآں وہ رسالے کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جیب سے خطیر سرمایہ لگا رہے ہیں۔ کرٹس وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہمارا میگزین ہمیں صبح سویرے بیدار ہونے کا معقول جواز فراہم کرتا ہے۔ اینڈی اور میں محسوس کرتے ہیں کہ ہم امریکیوں کو عرب اسرائیل تنازعے اور اس خطے کی سیاسی قوتوں کی تفہیم میں مدد دے رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ''واشنگٹن رپورٹ'' ہماری صرف کی ہوئی توانائی اور سرمائے سے زیادہ قیمتی ہے۔'' 18

''واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز'' کو مسلمان ملکوں اور عمومی طور پر مشرق وسطیٰ کی سیاست کی متوازن کوریج کی وجہ سے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے خریداروں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے' یوں یہ مشرق وسطیٰ کے حوالے سے شائع ہونے والے رسالوں میں فروخت کے اعتبار سے سب سے بڑا رسالہ ہے۔

ڈارٹ ماؤتھ کالج نے بین المذاہبی اتحاد کی طرف ایک بہت جاندار قدم اٹھایا ہے۔ وہ جلد ہی مسلمان طالب علموں کو حلال اور یہودی طالب علموں کو کوشر گوشت پیش کیا کرے گا۔ منتظمین کو امید ہے کہ اس اقدام سے ''متنازعہ ماضی رکھنے والوں'' میں ہم آہنگی کے فروغ میں مدد ملے گی۔

2000ء کے اواخر میں ملک کے سب سے بڑے کیتھولک گریجویٹ سکول برائے الٰہیات و پادریت ''کیتھولک تھیولوجیکل یونین'' نے آنے والی ہزاری کے استقبال کے لیے کیتھولک مسلم مطالعات کا پروگرام شروع کیا۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر مسلمان مقررین میں شامل تھے' شکاگو کے ماہر تعمیرات اور مقامی کونسل آف اسلامک آرگنائزیشنز کے چیئرمین طلعت عثمان اور ڈاکٹر ایم شریف باسیونی' جنھوں نے کہا کہ ''امریکہ شاید دنیا میں ایسی سب سے زیادہ بہترین جگہ ہے جہاں اسلام کا احیا ہو جائے تو وہ عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ مل کر تینوں توحیدی مذاہب میں مشترک رشتے قائم کر سکتا ہے۔''

شکاگو کے کیتھولک انسانیت نواز شخص جیمز ڈینی اپنی بیوی کیتھرین سمیت فلسطین کے سکولوں کا ایک دورہ کرنے کے بعد اس پروگرام کے سرپرست اعلیٰ بن گئے۔ انہوں نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''میں نے پہلے کبھی اسلام' عیسائیت اور یہودیت کے مشترکہ ورثے کو نہیں سمجھا تھا۔ جب آپ ایک مرتبہ اس ساری تاریخ سے واقف ہو جاتے ہیں تو

اپنے آپ سے پوچھنے لگتے ہیں: کیا افہام و تفہیم اور تعاون کے راستے پر گامزن ہونے کے لیے یہی کچھ کافی نہیں ہے؟ عوامی مکالمے پر انتہاؤں کا غلبہ ہے۔

''دونوں مذہبی برادریوں کے درمیان والے لوگوں کی' جو ایک دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے' ایسے لوگ قیادت کر رہے ہیں اور ان پر اثر انداز ہو رہے ہیں' جو کناروں پر ہیں۔''[19]

❁ ❁ ❁ ❁

حواشی

1. جنرل کوریئر' 18-2-1990' صفحہ 6
2. یو ایس اے ٹوڈے' 28-4-2000' صفحہ 12E
3. واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز' 10-92
4. آپ کے مسلمان ہمسایوں کی طرف سے ایک دوستانہ بیان۔''
5. زوگبی انٹرنیشنل کا سروے' 15-7-1977
6. زوگبی انٹرنیشنل کا سروے' 29-3-1993
7. ''ہم ان پر یقین رکھتے ہیں'' فنڈلے ایسوسی ایٹس' زوگبی سروے 18-5-1998 تا 19-7-1998' جان زوگبی انٹرویو' 3-9-1998
8. ''آپ کی سوچ سے زیادہ مشترک'' از: ولیم بیکر' صفحہ 611
9. ایضاً' صفحہ 56
10. ایضاً' پس ورق
11. ایضاً' پس ورق
12. ایضاً' پس ورق کا تبصرہ
13. ایضاً' صفحہ 16
14. ایضاً
15. ایضاً' صفحہ 17
16. ایضاً' صفحہ 43
17. ہوپ' نومبر' دسمبر 1997ء' صفحات 51-52
18. انٹرویوز' 23-8-1999
19. لوگوس' خزاں 2000ء' (کیتھولک تھیولوجیکل یونین)

نواں باب

طلباء: خضرِ راہ

مسلمانوں کے لیے 1963ء کا سال بہت اہم ہے۔ امریکی سرزمین پر مسلمان طلباء نے امریکہ میں اپنے مذہب کے حوالے سے پھیلے ہوئے یک رخے تصورات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اولین اقدامات کیے۔ ایسٹ کوسٹ میں ڈارٹ ماؤتھ کالج کے ایک طالب علم نے میلکم ایکس کو سفید فام نسل پرستی اور سیاہ فام علیحدگی پسندی کو رد کرنے کی تحریک دی، پھر صدر جان ایف۔ کینیڈی کے قتل کے بعد پیدا ہونے والے قومی ہسٹریا کا نشانہ بن جانے والے متنازعہ سیاہ فام رہنما کی مدد کی۔

یہ وہ سال تھا جب ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مسلمان آبادی کے لیے پیش رفتوں کی ابتدا ہوئی۔ اگلے دو عشروں میں چھوٹے مگر اہم اقدامات عمل میں آئے اور پھر بیسویں صدی کے آخری برسوں میں بہت زیادہ تیزی آ گئی۔

پیش رفت طویل مدت سے التوا میں تھی۔

امریکی مسلمان برسوں سے مذہبی امتیاز کو جھیل رہے تھے، جو بسا اوقات متشدد بھی ہو جاتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ غیر طبعی بدسلوکی بھی تکلیف دہ رہی یعنی طنز و استہزا، نامعلوم فون کالیں، ملازمتی امتیاز، نسلی تعصب، ائیرپورٹوں پر تفتیشی تاخیر اور حتیٰ کہ کسٹم افسروں کے ہاتھوں جامہ تلاشی کے ذریعے بے عزتی۔

ابھی حالیہ زمانے تک مسلمانوں نے اس بدسلوکی کا منظم انداز میں جواب نہیں دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی مقصد کے لیے ان میں کم ہی تنظیم ہے۔ آج بھی بالغوں کی مختصر سی تعداد ـــ شاید 5 فیصد سے بھی کم ـــ کسی قسم کی اسلامی تنظیم سے وابستہ ہے۔

دو عشروں تک مسلمانوں کی نمایاں تنظیموں نے اپنی سرگرمیوں اور خدمات کو اپنے اراکین تک ہی محدود رکھا۔ انہوں نے غیر مسلموں کو معلومات فراہم کرنے یا مسلمانوں کے خدشات اور توقعات کی طرف عوامی توجہ مبذول کروانے کے لیے بہت ہی کم کام کیا ہے۔ "ناکافی حد تک منظم اور تحرک پیدا کرنے" میں ہچکچاہٹ کا شکار بیشتر مسلمان خاموشی سے مصیبتیں سہتے رہے ہیں۔

خود عائد کردہ پابندیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ تمام بڑی قومی مسلمان تنظیمیں اب ٹھوس اور دور رس پروگراموں کی سرپرستی کر رہی ہیں' جبکہ کئی تنظیمیں تو صرف اسی مقصد کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ اپنے اسلام سے آگہی کے سفر کے دوران میں ان ابواب میں بیان کی گئیں بیشتر تنظیموں کے منعقد کردہ اجلاسوں سے خطاب کر چکا ہوں اور جن افراد کا ذکر کیا ہے تقریباً ان سب کا شناسا بن چکا ہوں۔

اس تدریجی لیکن مستقل تبدیلی میں طلباء نے خضر راہ کا کردار ادا کیا ہے۔

تیس برس پہلے صرف مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن دور رس سرگرمیوں کا انعقاد کرتی تھی۔ اس کی بنیاد 1963ء کے اوائل میں الی نائے یونیورسٹی کے کیمپین کیمپس (Champaign Campus) میں رکھی گئی۔ کالج کے طلباء پر مشتمل یہ تنظیم باہمی اتحاد نیز طلباء اور شہریوں میں اسلام کی بہتر آگہی کے لیے کام کرتی تھی۔ جلد ہی دوسرے بڑے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئیں جو اکثر و بیشتر پوری کمیونٹیوں کے لیے لیکچروں' نمائشوں اور سیمیناروں کا اہتمام کرتی تھیں' جن میں عوام کو بھی شرکت کی اجازت ہوتی تھی۔

جس سال ایم ایس اے وجود میں آئی' اسی سال بعد ازاں ایک سوڈانی طالب علم احمد عثمان نے ڈارٹ ماؤتھ کالج میں ایم ایس اے کی ایک شاخ قائم کی اور چند ماہ بعد غیر ارادی طور پر ایک ایسے عمل کا آغاز کیا جو آخر کار امریکہ میں مسلمانوں کے باہمی اتحاد میں ہمہ گیر بہتری لایا اور بین المذاہبی افہام و تفہیم کی راہ ہموار کرنے میں پیش رفتوں کا باعث بنا۔

احمد عثمان درست مقام پر' درست پیغام کے ساتھ موزوں وقت پر موجود تھے۔ انہوں نے اس وقت نیشن آف اسلام کے بانی اور قائد علی جاہ محمد کے نائب کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے متنازعہ سیاہ فام رہنما میلکم ایکس کے ساتھ ایک غیر طے شدہ مختصر عوامی مباحثے میں شرکت کی۔ ایک اتوار کی سہ پہر کو ہارلم میں واقعات کا ایک اہم سلسلہ رونما ہوا' جہاں ڈارٹ ماؤتھ کالج میں پڑھائی کے وقفے کے دوران عثمان اور ان کا ایک ہم جماعت گھوم پھر رہے تھے۔

اس وقت میں نے کانگرس میں اپنی دوسری ٹرم کا آغاز ہی کیا تھا لیکن کیپٹل ہل پر شہری حقوق کی زبردست حمایت کرنے کے باوجود میلکم ایکس میری دلچسپیوں کی فہرست میں شامل نہیں تھے۔ میں چاہتا تھا کہ افریقی امریکیوں کو ووٹ دینے' اپنی استطاعت کے مطابق مکان خریدنے' اپنی پسند کے کسی بھی ریستوراں میں کھانا کھانے اور ہوٹل یا موٹل (Motel)

میں ٹھہرنے کا حق دلوا دوں۔ میں بچپن میں جانے ہوئے جھوٹے یک رخے تصورات کے علاوہ اسلام یا تنظیم ''نیشن آف اسلام'' کے بارے میں تقریباً کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میرے خیال میں میلکم ایکس ایک فتنہ پرور شخص تھے جو سفید فام لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے بارے میں میرا یہ تاثر سی بی ایس پر نشر ہونے والے پروگرام ''نفرت جو نفرت پیدا کرتی ہے'' کو دیکھ کر قائم ہوا تھا۔ اس پروگرام کو مائنک ویلیس تیار (پروڈیوس) کرتے تھے۔ یہ پروگرام ان سخت اور غیر اسلامی نظریات پر مرکوز ہوتا تھا جن کا اظہار اس زمانے میں میلکم ایکس کیا کرتے تھے۔

میلکم ایکس کے ساتھ عثمان کا اچانک قائم ہونے والا شخصی رابطہ ایک ایسی دوستی کی شروعات ثابت ہوا جو تاریخی نتائج کا باعث بنی۔ ان کی ملاقات اور اس کے بعد ہونے والا تبادلۂ خیالات آتش بیاں رہنما کے اس فیصلے کا ایک بنیادی عامل تھا جس کے تحت انہوں نے ''نیشن آف اسلام'' کی نسل پرستانہ سیاست اور تنظیم کو چھوڑنے کا قدم اٹھایا۔

اڑتیس سال بعد عثمان نے مجھے میلکم ایکس کی کتاب زندگی کے اس اہم باب کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میلکم ایکس کے بارے میں بہت زیادہ سوانحی مواد شائع ہونے کے باوجود یہ حقائق عوام کے سامنے نہیں لائے گئے ہیں۔ عثمان نجی طور پر تو اپنے تجربات کے بارے میں گفتگو کرتے تھے لیکن ان کو اشاعت کے لیے فراہم کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ 2000ء میں یوم مزدور کے موقع پر شکاگو میں سہ پہر کے وقت ہونے والی طویل گفتگو میں انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''مسلمانوں کو شائستگی کا درس دیا جاتا ہے' ہمیں اپنا ہی راگ نہیں الاپنا چاہیے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہ سوچے کہ میں ان واقعات کے حوالے سے اپنی تعریف خود کر رہا ہوں۔ میں کوئی ہیرو نہیں ہوں۔ بس مجھے تو امریکہ میں انسانی حقوق کی ترویج کے لیے کام کرنے والی ایک عظیم ترین شخصیت کے ساتھ چند تجربات حاصل ہونے کا موقع ملا ہے۔'' وہ اس وقت قدرے نرم پڑ گئے جب میں نے انہیں قائل کیا کہ ان کے تجربات کو شائع ہونا چاہیے تاکہ ان لوگوں کو استفادے کا موقع دستیاب ہو سکے جو ان عوامل کی درست آگاہی چاہتے ہیں' جنہوں نے اس انسان کو امریکی مسلمانوں کی ترقی اور اتحاد میں تاریخی کردار ادا کرنے کی تحریک دی۔

میلکم ایکس سے عثمان کی ملاقات خالصتاً اتفاقی تھی۔ وہ ہارلم کی ایک گلی میں سے گذر رہے تھے کہ انہوں نے ''محمد کا معبد نمبر سات'' نامی عمارت کی دیوار پر ایک اعلان

چسپاں کیا ہوا دیکھا۔ اس پوسٹر میں عوام کو مدعو کیا گیا تھا کہ وہ اس سہ پہر میلکم ایکس کی تقریر سننے کے لیے آئیں' اور عثمان اور ان کے ساتھی نے شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ عثمان اس سہ پہر کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''دروازے کے نزدیک صاف ستھرا لباس زیب تن کیے محافظوں نے شائستگی کے ساتھ ہماری جیبیں دیکھیں کہ کہیں کوئی ہتھیار موجود نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ہمیں ایک بڑے کمرۂ اجلاس میں لے گئے جہاں تقریباً پانچ سو افراد پہلے ہی سے موجود تھے۔ میلکم ایکس نے ہمہ تن گوش بنے سامعین سے تقریباً تین گھنٹے خطاب کیا۔

''جب انہوں نے خطاب مکمل کیا تو میں بھی خوش قسمتی سے ان لوگوں میں شامل تھا جنہیں سوال پوچھنے کی دعوت دی گئی۔ سوڈان سے آئے ہوئے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنا تعارف کروانے کے بعد میں نے ان کی بلاغت اور افریقہ کے حوالے سے کہی گئیں ان کی مثبت باتوں کی تعریف کی۔ پھر میں نے کہا کہ ان کے چند تبصروں نے مجھے کافی پریشان کیا ہے۔ میں نے کہا: ''جہاں تک میں جانتا ہوں اسلام کسی ایک نسل' قومیت یا رنگ کو فوقیت نہیں دیتا لیکن آپ نے اپنی تقریر میں سفید فاموں کی مذمت کی ہے۔

''اس مرحلے پر اجتماع میں بے چینی پھیلی اور میں نے سنا کہ لوگ مجھے بیٹھ جانے کا کہہ رہے تھے۔ میلکم ایکس نے یہ کہتے ہوئے انہیں خاموش کرا دیا: 'انہیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے دیجیے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے غور سے سنیے۔' تب میں نے کہا: 'مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے سفید فام لوگوں پر آپ کی نکتہ چینی اسلام کی خلاف ورزی ہے۔' میلکم ایکس نے ان الفاظ میں بھرپور جواب دے کر داد وتحسین حاصل کی: 'سوڈان سے آئے ہوئے ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے آپ نہیں جانتے کہ امریکہ میں سیاہ فاموں کو کن کن مسائل کا سامنا ہے۔'

''مجھے حیرت ہوئی جب خطاب کے بعد میلکم ایکس نے مجھے اور میرے دوست کو نزدیک واقع ریستوراں میں اپنے ساتھ رات کا کھانا کھانے کی دعوت دی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم رک نہیں سکتے تھے تاہم رخصت ہونے سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کو اپنے پتے دیئے۔ چند روز بعد میں نے انہیں اسلام کے بارے میں بہت سی کتابیں ڈاک کے ذریعے بھیجیں۔ انہوں نے خط لکھ کر شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ وہ معبد (ٹیمپل) کے دوسرے لوگوں کے لیے مزید جلدیں خریدنا چاہتے ہیں۔ آئندہ مہینوں میں انہوں نے مجھے کئی خطوط لکھے جو سب

کے سب خیال افروز تھے۔ میں نے بھی ہر خط کا جواب دیا۔"

عثمان یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ خط کتابت کے دوران صدر جان ایف۔ کینیڈی کو قتل کر دیا گیا۔ سوگ کے دوران میلکم ایکس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے انہیں ایک قومی تنازعے کا مرکز بنا دیا' جو پندرہ ماہ بعد خود ان کے قتل تک جاری رہا۔

ایک اخبار کے رپورٹر کے ساتھ ان کی مختصر سی گفتگو نے تنازعے کو جنم دیا۔ میلکم ایکس نے نیویارک سٹی میں ایک جلسے سے خطاب کیا' جس کے دوران انہوں نے مقتول صدر کے زمانہ صدارت کے حوالے تو دیے تاہم اپنے رہنما علی جاہ محمد کی ہدایات کے مطابق قتل کی واردات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جلسے کے بعد مذکورہ رپورٹر نے کینیڈی کی ہلاکت پر ان کی رائے دریافت کی۔ میلکم ایکس نے کھردرے لہجے میں جواب دیا: "چوزے ڈربے میں آ چکے ہیں۔" انہوں نے واضح نہیں کیا کہ انہوں نے یہ بات کیوں کہی جبکہ رپورٹر نے یہ فرض کر لیا کہ میلکم ایکس یہ کہنا چاہتے تھے کہ کینیڈی موت کے سزاوار تھے اور اس نے یہ تبصرہ اسی تناظر میں شائع کروا دیا۔ ان کا "چوزے" والا تبصرہ قومی سطح پر شائع اور نشر کیا گیا اور اسے اس مقتول صدر کی توہین تصور کی گئی جس کا سوگ اجتماعی سطح پر منایا جا رہا تھا۔

بعد ازاں میلکم ایکس نے دوستوں سے باصرار کہا کہ ان کا مفہوم تو بالکل مختلف تھا۔ ان کی نیت تو یہ خیال بیان کرنے کی تھی کہ امریکی معاشرے میں نسلی انتہا پسندی کی وجہ سے نفرت اور تشدد نے ایسی فضا پیدا کی ہے جو کہ ہولناک تشدد کو تحریک دیتی ہے۔

عثمان کہتے ہیں: "میلکم ایکس کا مقصد کینیڈی کی موت پر خوشی کا اظہار نہیں تھا۔ اس سے کہیں بعید ان کا مقصد تو صرف اتنا کہنا تھا کہ آپ جو بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں' کینیڈی اس نسلی انتہا پسندی کا نشانہ بنے جو قوم پر غلبہ پائے ہوئے تھی۔" انہیں یقین ہے کہ اس بیان نے واقعات کے ایک ایسے سلسلے کو تحریک دی جو درحقیقت خود میلکم ایکس کے قتل کا پیش خیمہ بنا۔ عثمان دلیل دیتے ہیں کہ عوامی اشتعال نے میلکم ایکس کے کچھ نکتہ چینوں کو ان کے اور علی جاہ محمد کے مابین فاصلے پیدا کرنے میں مدد دی: "انہوں نے اس اشتعال کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مقاصد پورے کیے اور استاد اور شاگرد کے درمیان پہلے سے پیدا کیے ہوئے فاصلے کو مزید بڑھا دیا۔"

شدید عوامی احتجاج کی وجہ سے علی جاہ محمد نے میلکم ایکس کو نوے دن تک تنہائی میں خاموش رہنے کا حکم دیا۔ انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ عوام میں گفتگو نہ کریں' نیشن آف اسلام

کے کسی رکن سے بات نہیں کریں، نیشن آف اسلام کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیں اور نیشن آف اسلام کے دفاتر میں بھی نہیں جائیں۔

عثمان یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میلکم ایکس نے ان ہدایات پر فرماں برداری کے ساتھ عمل کیا تاہم اس تنہائی اور خاموشی کے دوران انہوں نے روایتی اسلام کی طرف ایک اور بڑا قدم بڑھایا۔ نیشن آف اسلام کے معبد (ٹیمپل) میں داخلے پر پابندی کی وجہ سے انہوں نے جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے نیویارک کی اسلامک فاؤنڈیشن جانا شروع کر دیا، جہاں عثمان بھی کبھی کبھی نماز ادا کیا کرتے تھے۔

اس مرکز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمود الشاوربی تھے جو قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے اور رخصت پر یہاں آئے ہوئے تھے۔

عثمان نے ان کے خطوں کے لب ولہجے میں ایک تبدیلی محسوس کی:

''انہوں نے نیشن آف اسلام کے بعض اصولوں پر سوال اٹھانا شروع کر دیئے اور جلد ہی مجھے اس حقیقت کا علم ہو گیا کہ اس وقت تک وہ نجی سوچوں کی حد تک روایتی اسلام سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اس ادراک نے مجھے تحریک دی کہ میں الشاوربی کے ساتھ مل کر میلکم ایکس سے حج ادا کرنے کے لیے اصرار کروں۔ جب اس ملاقات میں میلکم ایکس نے کہا کہ ان کے پاس اس سفر کے لیے رقم نہیں ہے تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ مطلوبہ رقم اپنی بہن ایلا سے ادھار لے لیں، جو بوسٹن میں رہتی تھیں۔ وہ سمفنی ہال کے نزدیک میساچوسٹس ایوینو میں رہتی تھیں۔ وہ جائیداد کی خرید وفروخت کا کامیاب کاروبار کر رہی تھیں اور بہت سے مکانات کی مالکہ تھیں۔ وہ بھی پہلے تو نیشن آف اسلام سے وابستہ تھیں تاہم بعد میں روایتی اسلام کی طرف لوٹ گئیں۔

میلکم ایکس نے ان سے رقم کے لیے درخواست کی جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی۔ حج پر روانگی سے پہلے انہوں نے نیشن آف اسلام سے تمام روابط ختم کر دیئے اور الشاوربی کی موجودگی میں نیشن آف اسلام کی ان تمام تعلیمات کو ٹھکرا دیا جو مرکزی دھارے کے اسلام سے متضاد تھیں۔ اس کے نتیجے میں وہ حج کے لیے مکہ میں داخل ہونے اور سعودی عرب کا ویزا حاصل کرنے کے اہل ہو گئے۔''

میلکم ایکس اکیلے قاہرہ گئے جہاں سے انہوں نے ہوائی جہاز کے ذریعے جدہ جانے والے حاجیوں کی ایک پارٹی میں شمولیت کی۔ پرواز کے دوران انہوں نے اپنی ڈائری میں اس

گروپ کے تنوع کا حال لکھا: ''جہاز میں سفید' سیاہ' سرخ اور پیلی رنگتوں والے لوگ موجود تھے' نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والے مجھ سرخ گھنگھریالے بالوں والے سمیت۔ سب یکجا' بھائی! سب ایک ہی خدا کی تعظیم کرتے تھے' سب ایک دوسرے کو برابر کا احترام دیتے تھے۔''

عثمان تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''وہ جو کچھ دیکھ اور محسوس کر رہے تھے وہ ان کی سابقہ تعلیمات اور تجربوں سے مختلف تھا۔''

جدہ ایئرپورٹ پر انہیں کہا گیا کہ وہ اس وقت تک حاجیوں کے احاطے میں ہی رہیں جب تک ان کے اسلام قبول کر لینے کی تصدیق نہیں ہو جاتی۔ دو دن تک انتظار کرنے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر عمر عزام سے ملاقات کی' جیسا کہ نیویارک سے روانگی سے ذرا ہی پہلے ایک دوست نے انہیں مشورہ دیا تھا۔ اس ملاقات سے پہلے انہیں اس حقیقت کا علم نہیں تھا کہ ڈاکٹر عزام مرحوم شاہ فیصل کے بیٹے شہزادہ محمد الفیصل کے بہنوئی تھے۔ میلکم ایکس فوری طور پر سرکاری مہمان بن گئے اور مکہ روانگی سے پہلے انہیں کندرا پیلیس ہوٹل میں رہائشی سوئٹ مہیا کر دیا گیا۔

عثمان بتاتے ہیں کہ کوہ عرفات پر قیام حج کا نقطۂ عروج ہوتا ہے: ''یہ قیام روح پرور ہوتا ہے۔ ہر حاجی وہاں کامل عاجزی کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے اور دنیاوی خطابات اور ملکیتوں سے عاری اپنے ساتھی حاجیوں کے مساوی ہوتا ہے۔ سادہ سی حقیقت یہ ہے کہ حج ایک فرد کی دوبارہ پیدائش ہوتی ہے۔ جب میلکم ایکس سے ان کی رفقاء نے دریافت کیا کہ حج کے کس پہلو نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا تو انہوں نے جواب دیا: ''اخوت نے! ساری دنیا سے ہر نسل اور رنگ کے لوگ وہاں ایک ہو جاتے ہیں۔ اس چیز نے مجھ پر خدائے واحد کی قوت ثابت کر دی۔''

مکہ سے انہوں نے اپنے خاندان کے افراد اور دوستوں کو خط لکھے' جن میں علی جاہ محمد کے بیٹے ڈبلیو دین محمد بھی شامل تھے: ''میں نے اس سے پہلے کبھی تمام نسلوں اور رنگوں کے لوگوں کو اس طرح سے مخلصانہ مہمان نوازی اور حقیقی اخوت کی روح پر عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا...... پچھلے سارے ہفتے میں اپنے اردگرد موجود ہر رنگ کے لوگوں کی ظاہر کردہ عظمت کے نظارے سے مبہوت اور دم بخود ہوں...... ساری دنیا سے ہزاروں لاکھوں حاجی آئے ہوئے ہیں...... لیکن وہ ایک جیسی رسومات ادا کرتے ہوئے اتحاد اور اخوت کی ایک ایسی روح کا مظاہرہ کر رہے ہیں جن کا میں اپنے امریکہ کے تجربات کی روشنی میں سفید فاموں اور غیر سفید فاموں کے مابین موجود ہونے کا یقین ہی نہیں کر سکتا۔

''امریکہ کو اسلام کے سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ واحد مذہب ہے جو معاشرے سے نسلی مسئلے کو ختم کر دیتا ہے...... میں نے پہلے کبھی تمام رنگوں کے لوگوں کو اپنے اپنے رنگوں سے بے نیاز ہو کر مخلصانہ اور سچی اخوت پر عمل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرے ان الفاظ پر دھچکا لگے لیکن حج کے دوران میں نے جو کچھ دیکھا اور تجربہ کیا ہے اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنے گزشتہ خیالات پر نظر ثانی کروں اور بعض گزشتہ ایقان ترک کر دوں۔

''میں نے سفید فام مسلمانوں میں بھی ویسا ہی خلوص محسوس کیا جیسا کہ نائجیریا' سوڈان اور گھانا کے سیاہ فام مسلمانوں میں...... اس کے ذریعے میں دیکھ سکتا تھا کہ اگر امریکی اللہ کے ایک ہونے پر ایمان رکھتے تو شاید وہ انسان کے ایک ہونے کو حقیقت میں قبول کر لیتے۔۔۔ اور رنگوں کے فرق کی بنا پر دوسروں کو نقصان پہنچانا ترک کر دیتے۔ [1]

عثمان اس حقیقت پر ماتم کرتے ہیں کہ اہم ذرائع ابلاغ نے میلکم ایکس کی مذہب اور نسلی نقطۂ نظر کی تبدیلی' نیشن آف اسلام سے ان کی مکمل طور پر علیحدگی اور مرکزی دھارے کے اسلام کی غیر مشروط قبولیت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔

ان کی وفات کے بعد ''دی سٹر ڈے ایوننگ پوسٹ'' نے یوں تبصرہ کیا: ''اگر میلکم ایکس ایک حبشی (نیگرو) نہ ہوتے تو ان کی آپ بیتی ایک ابنارمل نفسیات کی دستاویز' ایک چور' منشیات خور اور سزا یافتہ شخص کی کہانی کے علاوہ کچھ نہ ہوتی' جس کا خاندان پاگل تھا' جو مسیحا ہونے کے واہموں کا شکار تھا اور جس نے بھائیوں میں نفرت کے مذہب کا پرچار کیا۔'' [2]

عثمان واضح کرتے ہیں کہ: ''ہر موقع پر میلکم ایکس نے بیان دیا کہ ماضی میں انہوں نے تمام سفید فام لوگوں پر الزام تراشی کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ دوبارہ اس غلطی کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کچھ سفید فام لوگ حقیقتاً مخلص ہیں' کچھ سفید فام لوگ سیاہ فاموں کے ساتھ حقیقتاً برادرانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن ذرائع ابلاغ نے ان تبصروں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان کے حوالے سے ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد اپنی رائے میں تبدیلی نہیں کی۔''

اس کے برعکس میلکم ایکس کالج کے سفید فام طالب علموں کے ساتھ اچھے مراسم رکھتے تھے۔ انہیں یونیورسٹیوں میں خطاب کے لیے اکثر و بیشتر بلایا جاتا اور زبردست داد اور تحسین دی جاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: ''مجھے پختہ یقین ہے...... نوجوان نسل کے سفید فام جو

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طالب علم ہیں' نوشتۂ دیوار ضرور پڑھیں گے اور ان میں سے بہت سے طلباء سچ کے راستے پر گامزن ہو جائیں گے ـــ اس واحد راستے پر جو نسل پرستی کی وجہ سے امریکہ پر منڈلانے والی تباہی سے بچا سکتا ہے۔" 3

عثمان ڈارٹ ماؤتھ کالج میں میلکم ایکس کے تجربے کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہ اس زمانے میں کسی مہمان مقرر کا سب سے زیادہ یادرہ جانے والا دورہ تھا۔ انتظامیہ کو شامل کیے بغیر طلباء نے انہیں مدعو کیا اور مجھے ذمہ داری سونپی کہ ان کی شرکت کو یقینی بناؤں۔ طلباء کے ایک وفد نے ایئرپورٹ پر ان کو خوش آمدید کہا اور ڈنر اور تقریر کے بعد ان کے ساتھ فرداً فرداً تبادلۂ خیال کیا ـــ اگلے روز انہوں نے طلباء کے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔"

21 فروری 1965ء کو' کینیڈی کے قتل کے تقریباً پندرہ مہینے بعد' کسی نے میلکم ایکس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا' جبکہ وہ ہارلم میں آڈیوبون ہال میں ایک جلسے سے خطاب کی تیاری کر رہے تھے۔ تمام افریقی اخبارات ان کے انتقال کا سوگ منا رہے تھے لیکن "سفید" ذرائع ابلاغ ان کی زندگی کے بارے میں درشت اور منفی الفاظ میں خبریں دے رہے تھے۔ بیرون ملک' خصوصاً افریقہ اور ایشیا میں مقتول رہنما کی زندگی کو ہمدردانہ کوریج دی گئی۔ اس حقیقت نے امریکی اطلاعاتی ایجنسی کے اس وقت کے ڈائریکٹر کارل رووِن میں ردعمل ابھارا۔ انہوں نے امریکی رپورٹروں کو غیر ممالک میں دی گئی تعریفی کوریج کی مثالیں دکھائیں اور کہا: "یہ سب کچھ ایک سابق مجرم' سابق منشیات فروش کے لیے جو ایک نسل پرست جنونی بن گیا تھا!!"

جس لمحے عثمان نے قتل کی اطلاع سنی' وہ ایک گرے ہاؤنڈ بس کے ذریعے ڈارٹ ماؤتھ کالج سے نیویارک روانہ ہو گئے تاکہ اپنے غم کا اظہار کریں اور تجہیز و تکفین میں ہاتھ بٹائیں اور میلکم ایکس کے سوگوار خاندان کو پرسہ دیں۔ چونکہ چند ہفتے پہلے ان کے گھر کو آتشی بموں سے جلا دیا گیا تھا اس لیے ان کا خاندان پڑوسیوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ انہوں نے عثمان سے درخواست کی کہ وہ میلکم ایکس کی خواہش کے مطابق ان کا کفن دفن ان کے اپنے انتخاب کردہ نام الحاج ملک الشہباز کے نام کے تحت روایتی اسلامی طریقوں سے کرنے میں مدد دیں۔

جب قتل کی واردات ہوئی اس وقت ایک سوڈانی مسلمان عالم شیخ احمد حسن میلکم ایکس کے خاندان کے ساتھ پہلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اسلامی طریقے کے مطابق غسل دینے اور کفن پہنانے والوں میں شامل تھے۔ حسن مکہ سے نیویارک آئے تھے تاکہ ورلڈ مسلم لیگ کی ہدایت کے مطابق میلکم ایکس کو ہارلم میں مسجد تعمیر کرنے میں مدد دیں۔

ایک ہفتے کے عوامی سوگ کے بعد لاش کو دفنا دیا گیا۔عثمان اس مرحلے کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اس ہفتے کے دوران تیس ہزار لوگوں نے ان کا دیدار کیا جبکہ سینکڑوں پولیس کے اضافی سپاہی حفاظت پر متعین تھے۔ پولیس چھتوں پر مورچہ زن تھی' اسلحہ کے لیے گلیوں میں لوگوں کی تلاشی لے رہی تھی اور گلیوں کے کونوں پر ناکے لگائے کھڑی تھی۔ شاید برادری کی تاریخ کا یہ سب سے زیادہ تناؤ والا ہفتہ تھا۔ دھمکیوں اور توہین کے باوجود امریکہ اور کینیڈا کی مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے جنازے میں شرکت کا فیصلہ کیا۔''

دوسرے مسلمان رہنماؤں نے شرکت نہیں کی۔ ڈرامہ نگار اوسی ڈیوس' ان کی اداکارہ بیوی روبی ڈی اور عثمان نے تدفین کی خدمات انجام دیں۔ روبی ڈی نے دنیا بھر کے رہنماؤں کے تعزیتی پیغامات پڑھ کر سنائے۔ اپنے خطاب میں عثمان نے کہا کہ وہ ایک ایسے افریقی کی حیثیت سے بات کر رہے ہیں جو میلکم ایکس کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ انہوں نے ان کی قبولیت اسلام کا ذکر کیا اور ان الفاظ پر اپنے خطاب کا اختتام کیا۔

''انہوں نے کسی مسلمان کی سب سے بڑی آرزو کی تکمیل پالی یعنی انصاف اور انسانی مساوات کے لیے لڑتے ہوئے شہید ہو جانا۔''

عثمان نے میلکم ایکس کے الفاظ یاد دلائے: ''اگر میں کوئی روشنی لاتے ہوئے' کسی ایسی بامعنی صداقت کو عیاں کرتے ہوئے مر سکوں جو امریکہ کو مسموم کرنے والے نسل پرستی کے سرطان کو مٹا دے تو یہ اللہ کی طرف سے ہوگا...... صرف غلطیاں میری ہیں۔''

تدفین کے بعد عثمان نے میلکم ایکس کی بیوہ اور بچوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔ اس رقم میں سے ان کی بیوہ کو حج پر روانہ کیا گیا۔

حواشی

1. میلکم ایکس کا مکہ سے خط' 1964ء
2. ''میلکم ایکس کی آپ بیتی'' از الیکس ہیلے (نیویارک: رینڈم ہاؤس' 1965ء) صفحات' 418-419
3. ایضاً' صفحہ 341

دسواں باب

ممتاز امریکی مسلمان اور اسلامی تنظیمیں

احمد عثمان کی میلکم ایکس کے ساتھ ملاقات کے چند برس بعد تک مسلمانوں کی دو قومی تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ پہلی تنظیم ''اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ'' (آئی سی این اے) نے 1971ء میں اپنے کام کا آغاز کیا۔ اس کے بعد 1982ء میں ''اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ'' (آئی ایس این اے) وجود میں آئی۔ دونوں تنظیمیں دور رس سرگرمیاں شروع کرنے سے پہلے مسلمانوں کو مختلف نوعیت کی خدمات ہی فراہم کرتی تھیں۔

آئی سی این اے کا مرکز نیویارک میں ہے اور اس نے 1968ء میں اردو بولنے والے مسلمانوں کی خدمات انجام دینے کے لیے قائم کیے گئے گروپ کی جگہ لی۔ آئی ایس این اے کو' جس کا صدر دفتر (ہیڈ کوارٹر) پلین فیلڈ' انڈیانا میں ہے' مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے ایک گروپ کے رہنماؤں نے منظم کیا تھا۔

دونوں تنظیموں کے مقاصد ایک ہیں۔ ابتدائی برسوں میں تو دونوں مالی بقا کی جدوجہد کرتی رہیں تاہم وہ 2000ء تک مستحکم ہو چکی تھیں۔ دونوں تنظیمیں قومی کنونشوں کا انعقاد کرتی ہیں جن میں بڑی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں' بہت سے غیر ممالک میں قدرتی آفات کے موقعوں پر امداد مہیا کرتی ہیں اور امریکہ اور کینیڈا کے مسلمانوں کو خیراتی اور تعلیمی خدمات مہیا کرتی ہیں۔

آئی سی این اے قومی اداروں کے ساتھ ساتھ مقامی شاخوں کے ذریعے قومی سطح پر کام کرتی ہے۔ یہ ایک ماہنامہ رسالہ ''پیغام'' شائع کرتی ہے' جس کے مدیر ظہیر الدین ہیں' جو دس ہزار اراکین والی اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل اور سنٹر فار امریکن مسلم ریسرچ اینڈ انفارمیشن (CAMRI) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔ یہ سنٹر تعلیمی اور تحقیقی

پروگراموں کے ساتھ ساتھ کانفرنسوں' لیکچرز اور کتابوں کی طباعت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ 1983ء کے شروع میں آئی سی این اے نے ایک منفرد خدمت کا آغاز کیا' جسے ایم ایس آئی فنانشل سروسز کارپوریشن کہا جاتا ہے' جو ضرورت مند مسلمانوں کو سود سے پاک قرض فراہم کرتی ہے۔

آئی سی این اے ہر عمر کے افراد کے لیے ملٹی میڈیا کمیونیکیشن میں پہل کرنے والی تنظیم ہے۔ یہ کمپیکٹ ڈسکوں' وی سی آر کی دستاویزی فلموں اور انٹرنیٹ کو استعمال کر رہی ہے۔ یہ جلد ہی ''مسلم کمیونٹی 2000ء'' کے عنوان سے امریکی مسلمانوں کے بارے میں ایک حوالہ جاتی کتاب شائع کر رہی ہے۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ ایک ماہنامہ رسالہ ''اسلامی آفاق'' (Islamic Horizons) شائع کرتی ہے' ایک تربیتی مرکز کا انتظام چلاتی ہے اور کالج کی سطح کا ایک کورس پیش کرنے میں انڈیانا یونیورسٹی سے تعاون کرتی ہے۔ 2000ء میں ہندوستان نژاد امریکی شہری اور عالم ڈاکٹر مزمل صدیقی نے صدر کی حیثیت سے اپنے چوتھے سال کا آغاز کیا۔ سید ایم۔سعید جنرل سیکرٹری ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر صدیقی مسلم سٹوڈنٹ ایسوسی ایشن آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس اینڈ کینیڈا (MSA) کے چیئرمین تھے۔ بعد میں انہوں نے واشنگٹن ڈی۔سی کے اسلامک سنٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

تنظیم کے باقاعدہ اراکین کی تعداد گیارہ ہزار ہے اور سعید کے تخمینے کے مطابق فروری 2000ء تک دس لاکھ سے زیادہ امریکی مسلمانوں کی ذاتی خدمت انجام دے چکی تھی۔ آئی ایس این اے مسلم سٹوڈنٹ آرگنائزیشن سمیت مقامی اور مسلمانوں کے تخصیصی گروپوں کے لیے سرپرست تنظیم کا کردار ادا کرتی ہے۔ سعید بتاتے ہیں: ''سوسائٹی جن تنظیموں کو خدمات مہیا کرتی ہے ان کی تعداد صرف تین سال میں تین سو پچیس سے چار سو تک پہنچ گئی ہے۔'' [1] اکتوبر 2000ء میں آئی سی این اے نے ملک میں ہونے والے تشدد کے حوالے سے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے پچاس مسلمان رہنماؤں نے شرکت کی۔ [2]

تنظیم کی مقبولیت 1997ء میں عیاں ہوئی جب شکاگو میں منعقد ہونے والے قومی کونشن میں بیس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ میں بھی پروگرام میں شریک ہوا اور دیکھا کہ حاضری اتنی زیادہ تھی کہ کونشن کے بیشتر پروگراموں کے مرکز کونراڈ ہلٹن کے کاریڈوروں میں

آمدورفت جاری رکھنے کے لیے پولیس کی ضرورت پڑ گئی۔ 2000ء میں اس سے بھی زیادہ حاضرین کی توقع میں شکاگو کے اوہئیر ائیر پورٹ کے نزدیک حیات کنونشن سنٹر میں کنونشن کا اہتمام کیا گیا' جس میں حاضری تیس ہزار سے بھی بڑھ گئی۔ 3؎

ڈاکٹر صدیقی امریکی ماحول کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''امریکی مسلمان شاید دنیا کے سب سے زیادہ جمہوری ملک میں رہتے ہیں' ایک ایسا ملک جو ترقی کے لامحدود مواقع مہیا کرتا ہے۔'' 4؎

مسلمان تعلیمی خدمات میں مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔ پورے ملک کے اہم شہروں میں ہر سطح کے سکول مسلمانوں کے لیے موجود ہیں۔

جنوبی کیلیفورنیا میں ڈیڑھ سو سے زیادہ ایلیمنٹری سکولوں میں ''نیو ہورائزن سکول'' شاید سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کے دو کیمپس ہیں' ایک پیسا ڈینا میں اور دوسرا اورنج کاؤنٹی میں' جبکہ اس کی سربراہ ترکی النسل ماہر تعلیم نیکو اوزگر ہیں۔ ان کا مقصد طالب علم کو ''اعلیٰ ترین درسی تعلیم اور اسلامی تعلیمات پر مبنی اخلاقی اقدار پر عمل کی تربیت دینا ہے۔'' وہ مزید کہتی ہیں ''ہم اپنے طلباء کو زندگی کے ہنر — مثلاً مسائل حل کرنا' جھگڑوں کو ختم کروانا — سکھاتے ہیں' اور ان میں شخصی ذمہ داری' ایمان داری اور انصاف کی اقدار اور عادات راسخ کرتے ہیں۔ یہ ہمارے سکول کے تحفے ہیں۔'' طلباء مختلف قومیتوں اور نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے بہت سے سکول ایلیمنٹری تعلیم کے ساتھ ساتھ ہائی سکول کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔

شکاگو میں اعلیٰ تعلیم کا مسلمانوں سے فیضان یافتہ ادارہ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی طلباء کو پیشوں اور پبلک سروس کے لیے تربیت دے رہی ہے۔ شکاگو میں مشی گن ایونیو میں لوپ کے مرکز میں واقع یہ امریکہ کا ایسا واحد اعلیٰ تعلیم کا ادارہ ہے جس کا سربراہ ایک مسلمان عالم ہے۔ مسلمان اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز اور سٹوڈنٹ باڈی کے اراکین ہیں۔ 1980ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور قیام کے وقت سے ڈاکٹر وصی اللہ خان اس کے سربراہ چلے آ رہے ہیں۔ یہ تنظیم اگلے چند برسوں میں گریجویٹ پروگراموں کا منصوبہ بنا رہی ہے جبکہ فی الوقت یہ اعلیٰ ثانوی درجے تک کا نصاب پڑھا رہی ہے۔

2000ء-1999ء کے تعلیمی سال کے دوران سات سو طالب علموں کے لیے تیس

اساتذہ نے خدمات انجام دیں، جن میں سے پندرہ کل وقتی تھے۔ ستمبر 2000ء میں جب یونیورسٹی نے اپنی بیسویں سالگرہ منائی تو طالب علموں کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر وصی اللہ خان کو توقع ہے کہ اگلے تین برسوں میں یہ تعداد بڑھ کر دو ہزار تک پہنچ جائے گی۔ سالگرہ کی اس تقریب میں امریکی ایوان نمائندگان میں ڈیموکریٹس کے ڈپٹی لیڈر ڈیوڈ بونیئر (David Bonior) کو ان کی بین المذہبی اتحاد کی کوششوں پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی۔

1982ء میں شکاگو میں قائم کیا جانے والا امریکن اسلامک کالج عربی زبان کی تدریس کے ساتھ ساتھ اسلامی کورسز بھی کرواتا ہے۔ اس کے بانی اور صدر ڈاکٹر اسد حسین ہیں۔

بہت سی تنظیمیں مسلمانوں کی علمی کمیونٹی کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ 1981ء میں ہرنڈن، ورجینیا میں قائم ہونے والی تنظیم ''دی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ'' ایک سہ ماہی رسالہ ''دی امریکن جرنل آف اسلامک سوشل سائنسز'' شائع کرتی ہے۔ 1999ء میں ایلن ڈیل، ورجینیا میں قائم ہونے والی تنظیم ''دی یونائیٹڈ ایسوسی ایشن فار سٹڈیز اینڈ ریسرچ'' ایک سہ ماہی رسالہ ''دی مڈل ایسٹ افیئرز جرنل'' شائع کرتی ہے۔ یہ رسالہ 1998ء میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ امام ڈبلیو دین محمد کی تنظیم ''مسلم امریکن سوسائٹی'' جنوری 2000ء سے ایک ماہنامہ ''دی امریکن مسلم'' شائع کر رہی ہے۔

برنٹسوائل، میری لینڈ میں قائم ''دی سنٹر فار سٹڈی آف اسلام اینڈ ڈیموکریسی'' جس کے ڈائریکٹر رضوان اے۔ مسمودی ہیں اور این آربر، مشی گن میں قائم ''دی سرکل آف ٹریڈیشن اینڈ پروگریس'' جس کے ڈائریکٹر پروفیسر انتونی ٹی۔ سلیوان ہیں، بین المذہبی اور بین الثقافتی تعلقات کے حوالے سے کام کر رہے ہیں۔

1989ء میں دو قومی پبلک پالیسی تنظیموں — دی امریکن مسلم کونسل (AMC) دی مسلم پبلک افیئرز کونسل (MPAC) — کے قیام سے مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں اہمیت کی حامل اور تنظیمی روپ اختیار کر گئیں۔ اے ایم سی کا صدر دفتر واشنگٹن ڈی۔ سی میں ہے جبکہ ایم پی اے سی کا صدر دفتر لاس اینجلس میں ہے۔ دونوں تنظیموں کا عملہ پیشہ ور افراد پر مشتمل ہے جو ہمیشہ فروغ پذیر متنوع پروگراموں پر کام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ اے ایم سی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر علی ابوزاکوک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''اے ایم سی مقامی اور قومی سطح پر مسلمانوں کے پالیسی اہداف کو بڑھانا اور

امریکی سیاست میں مسلمانوں کو شامل کرنا ہے: ''جتنا زیادہ ہم حصہ لیں گے اتنا زیادہ لوگ ہمیں سنیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری برادری والدین اور اساتذہ کی ایسوسی ایشنوں سے سیاست کا آغاز کرتے ہوئے ملک کے دارالحکومت میں پینسلوانیا ایونیو تک پہنچے۔ ہم انہیں بتاتے ہیں کہ 'اگر آپ ووٹ نہیں دیتے تو اس معاشرے میں غیر اہم ہیں۔'' 5

اے ایم سی نے پہلی مرتبہ ایسے کئی اقدامات کیے جنھوں نے مسلمانوں کی فکر مندیوں کو قومی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ 1991ء میں اس نے فوجیوں پر مشتمل ایک تنظیم قائم کی جو ''مسلم ملٹری ممبرز'' کہلاتی ہے اور تب سے اے ایم سی کی سرگرمیوں میں معاونت کرتی آئی ہے۔ بعد میں اسی برس جب اے ایم سی کے ارکان حج کے اپنے پہلے سفر سے لوٹے تو صدر جارج بش نے انہیں تہنیتی پیغام بھیجا اور اے ایم سی کے ایک رہنما امام سراج وہاج نے پہلی بار امریکی ایوان نمائندگان میں دوران اجلاس نماز ادا کی۔

اے ایم سی نے اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی ایجنٹ کے طور پر امریکی مسلح افواج (آرمڈ فورسز) میں مسلمان اماموں کے تقرر کی حوصلہ افزائی اور 3 دسمبر 1993ء کو کیپٹن عبدالرشید محمد کو امریکی تاریخ میں پہلی بار فوج میں امام مقرر کیا گیا۔ اب تک مختلف فوجی اداروں میں آٹھ امام مقرر کیے جا چکے ہیں۔ ہر امام امتیازی نشان کے طور پر ستارہ و ہلال لباس پر لگاتا ہے۔

اے ایم سی نے 1993ء میں ''قید کے دوران اسلام قبول کرنے والے ایسے افراد کے لیے جو قید خانوں میں سزائیں بھگت رہے ہیں یا رہا ہونے کے بعد دوبارہ معاشرے میں شامل ہو رہے ہیں'' نیشنل اسلامک پرزن فاؤنڈیشن قائم کی ہے۔

یہ تنظیم قانون سازی اور فارن پالیسی کے اقدامات پر بھی کام کرتی ہے' حال ہی میں اس نے امریکی امیگریشن اور نیچرلائزیشن سروس کی قانونی سماعتوں کے دوران خفیہ شہادت کو غیر قانونی قرار دلوایا ہے۔ 1992ء میں اس نے بہت وسیع پیمانے پر پڑھا جانے والا کتابچہ ''امریکہ کی مسلمان آبادی'' شائع کیا۔ اس نے بہت سی عوامی اہمیت کی کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے ایک اسلام مخالف جرائم کے حوالے سے ہے اور مسلم لیگل ڈائریکٹری اور قانونی حقوق کی گائیڈ کے تو کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کونسل نے بعد ازاں دہشت گردی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک مسلم کیتھولک پراجیکٹ شروع کیا۔

1992ء میں کونسل نے جماعتی جدوجہد میں ایک نیا قدم اٹھاتے ہوئے ببانگ

مسائل پر مسلمانوں کی رائے شماری کی اور صدارتی نامزدگی کے قومی کنونشنوں میں بڑھ چڑھ کر عملی حصہ لیا۔ 1996ء میں اس نے ووٹروں کے لیے ایک دور رس پروگرام کا آغاز کیا جس کے تحت مسلمانوں سے متعلقہ معاملات کی نشاندہی کی گئی' مسلمانوں کی سیاسی ترجیحات کا سروے کیا گیا اور ووٹنگ کے عمل پر ایک رہنما کتاب شائع کی گئی۔

پانچ ہزار مسلمان کونسل کو مالی مدد دیتے اور اس کی قیادت کو منتخب کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن العمودی اس کے بانیوں میں شامل ہیں' انہوں نے نو برس تک اس کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں اور اب اس سے منسلک تنظیم امریکن مسلم کونسل فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ 6

اگرچہ ''دی مسلم پبلک افیئرز کونسل'' امریکن مسلم کونسل سے منسلک نہیں ہے تاہم قابل تعریف خدمات انجام دے رہی ہے۔ یہ ''امریکی مسلمانوں اور ان کے منتخب نمائندوں کے مابین مثبت اور تعمیری تعلق قائم کرنے اور امریکی سیاست میں اسلامی اخلاقی اقدار کی شمولیت کے لیے'' کام کر رہی ہے۔

1996ء میں اس نے امریکی سینیٹ میں اسلامی جمہوریت کے تصور پر ایک مقالہ پیش کیا اور تین سال بعد محکمہ خارجہ کو امریکہ کی دہشت گردی روکنے کی پالیسی کے حوالے سے مقالہ پیش کیا۔ اپریل 2000ء میں اس نے وارنر برادرز سٹوڈیو کو عراق پر امریکی افواج کی طرف سے عائد کردہ معاشی پابندیوں کی وجہ سے عراقی عوام کو درپیش مشکلات کے حوالے سے بنائی گئی فلم ''تین بادشاہ'' (Three Kings) پر انٹرٹینمنٹ میڈیا ایوارڈ دیا۔

اس کے بانی اور قومی ڈائریکٹر سلام المریعتی لاس اینجلس میں شہری سرگرمیوں میں نمایاں ہیں۔ میں ان سے پہلی بار 1986ء میں اپنے کتابی دورے (Book Tour) کے دوران لاس اینجلس کے اسلامک سنٹر آف سدرن کیلیفورنیا میں ملا تھا۔ وہ سکولوں اور مذہبی گروپوں سے خطاب کرتے ہیں' امریکہ کے اہم اخبارات کے ادارتی صفحات کے لیے مضامین لکھتے ہیں' ٹیلی ویژن پروگراموں میں اکثر مدعو کیے جاتے ہیں اور واشنگٹن ڈی۔سی میں قانون سازوں اور دوسرے پالیسی سازوں کے لیے کئی فورموں (Forums) کا اہتمام کر چکے ہیں۔

المریعتی یہ جان چکے ہیں کہ اسرائیل پر نکتہ چینی کرنے والے خود کو ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔ 1998ء میں وہ اس وقت قومی سطح پر توجہ کا مرکز بن گئے جب امریکی ایوان

نمائندگان کے ڈیموکریٹک رہنما رچرڈ گیفرڈ نے ایم پی اے سی کے رہنما کی حیثیت میں ان کی علمی خدمات کی تعریف کی اور انہیں تحفظ دہشت گردی کے وفاقی کمیشن کے لیے نامزد کیا۔ یہ نامزدگی منطقی طور پر درست تھی کیونکہ الربیعتی دہشت گردی کی مخالفت میں متواتر تقریریں کرتے رہے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والے افراد کی گرفتاری اور انہیں سزا دینے سے ہی دہشت گردی کو مٹانے کا پروگرام نہیں ہوسکتا۔ وہ کہتے ہیں اس مقصد کے حصول کے لیے ان مسائل کو ختم کرنا ہوگا جو ہوش سے عاری تشدد کو ابھارتے ہیں۔

ان صفات کے باوجود اسرائیل کے حامی لابی کرنے والے گروپوں کا احتجاج اتنا زوردار تھا کہ گیفرڈ کو ان کا نام واپس لینا پڑا۔ ان کی بنیادی شکایت یہ تھی کہ الربیعتی فلسطینیوں سے بدسلوکی کے حوالے سے اسرائیل پر باقاعدگی سے تنقید کرتے ہیں۔ احتجاج کرنے والوں کو یہ فتح بہت مہنگی پڑی کیونکہ گیفرڈ کی سپراندازی کی مشہوری سے کانگرس کے لیڈر کو ڈیموکریٹک پارٹی کی کہکشاں کے ایک ستارے تھے شرمندگی اٹھانی پڑی اور ساتھ ہی فلسطینیوں کے خدشات کو دور کرنے کے لیے الربیعتی کے موقف کو عوامی توجہ حاصل ہوئی۔

ایک سال بعد جب الربیعتی کو لاس اینجلس میں ایک مشہور مسلم یہودی مکالمے کی قیادت سونپی گئی تو ان پر نکتہ چینی کرنے والوں بشمول امریکہ کی صہیونی تنظیم (Zionist Organisation of America) نے انہیں اس اعزاز سے محروم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ایک احتجاجی گروپ نے یہودی رہنماؤں پر زور دیا کہ وہ انہیں اور مکالمے کے اس سلسلے کو شروع کرنے میں مدد دینے والے دوسرے مسلمان رہنماؤں سے "گریز" کریں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ وہ اور اسلامک سنٹر آف سدرن کیلیفورنیا کے ماہنامہ رسالے "المینار" (The Minaret) کے مدیران "ہالوکاسٹ کو نہ ماننے والے" ہیں یعنی ایسے لوگ جو اس حقیقت پر سوال اٹھاتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے دوران نازی جرمنی نے یہودیوں کو منظم انداز میں قتل کیا تھا۔ احتجاج کرنے والوں نے مذکورہ رسالے کے ایک اداریے پر تنقید کی اور الربیعتی کو اس رسالے کے عملے میں شامل ہونے کی بنا پر "ہالوکاسٹ کو نہ ماننے والا" قرار دے دیا۔

ایم پی اے سی کے چیئرمین رمزے حاکم کے مطابق یہ الزامات بے بنیاد اور گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کے مترادف ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے ملاقات میں انہوں نے کہا: "عملے میں شامل ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے..... مسئلہ ان آوازوں کو خاموش کروانا ہے جو ان مخصوص مفادات والے گروپوں کو ناخوش گوار لگتی ہیں جو

دھمکیاں دینے کے عادی ہیں...... مرکزی دھارے کی تمام اسلامی تنظیموں کی طرح مسلم پبلک افیئرز کونسل' المینار' اسلامک سنٹر آف سدرن کیلیفورنیا نے ہمیشہ ہالوکاسٹ کو جدید تاریخ میں کیا جانے والا سب سے زیادہ گھناؤنا جرم تصور کیا ہے۔ چونکہ مسلمان بلقان' چیچنیا اور دوسرے بہت سے مقامات پر نسل کشی کے المیئے سے دوچار ہیں اس لیے وہ اس نفرت اور عدم رواداری کے خلاف بات کرنے کی ضرورت کا شعور رکھتے ہیں جو کسی بھی مذہبی یا نسلی گروپ کے قتل عام کا باعث بنتی ہے۔'' 7

المرعیتی نے اپنا عہدہ نہیں چھوڑا اور تنازعے کے باوجود بین المذہبی مکالمہ کامیابی سے جاری رہا اور المرعیتی اس کے رہنماؤں میں شامل رہے۔ اس مکالمے کو تعمیری گفتگو کے نمونے کے طور پر قومی سطح پر سراہا گیا۔

جون 2000ء میں لابی کرنے والی تنظیمیں ایک مرتبہ پھر المرعیتی کے درپے ہو گئیں۔ اس دفعہ انہوں نے جیمز روگن کی کانگرس کا دوبارہ رکن بننے کے لیے چلائی گی ملک کی ایک انتہائی گرما گرمی والی انتخابی مہم کے دوران تنازعہ کھڑا کر دیا۔ جیمز روگن کیلیفورنیا کے ری پبلکن ہیں' جنہوں نے 1999ء میں صدر کلنٹن کے سینیٹ میں مواخذے کے دوران ایوان میں اہم کردار ادا کرنے پر قومی سطح پر شہرت حاصل کی تھی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی نیشنل کانگریشنل کیمپین کمیٹی نے نومبر 2000ء میں روگن کو شکست دینے کو اپنا مقصد قرار دیا اور ان کے مخالف ڈیموکریٹک امیدوار ریاستی سینیٹر ایڈم شیف کو زبردست امداد مہیا کی۔

المرعیتی اور دیگر مسلمان اس وقت تنازعے کا نشانہ بن گئے جب لاس اینجلس ٹائمز نے روگن کے کیمپین مینیجر جیسن کیبل رائے سے ان کی بابت تحقیری کلمات منسوب کیے۔ ٹائمز کے رپورٹر مائیکل فنگین نے رائے کا یہ بیان نقل کیا کہ ایک ایسے کمیونٹی پروگرام میں شیف کی شرکت نے' جس کے شریک میزبان المرعیتی تھے۔ ''سوال پیدا کر دیا ہے کہ اگر وہ منتخب ہو گئے تو ان کے مراسم کن لوگوں سے ہوں گے؟'' مسلمانوں کے وکیل کی حیثیت سے المرعیتی کی شہرت کے حوالے سے رائے کا یہ بیان درج کیا گیا: ''مجھے تو سنیئر شیف کا' بالخصوص ایک یہودی کی حیثیت سے' اس تقریب میں شریک ہونا بہت عجیب سا لگتا ہے۔''

اس خبر نے مسلمان رہنماؤں میں احتجاج کو تحریک دی۔ کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز فار سدرن کیلیفورنیا کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر حسام عائلوشی نے رائے کے اس تبصرے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ امریکی مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک

کرنے کی ایک کوشش ہے۔"

اس تنازعے کی وجہ سے رائے نے کیمپین منیجر کی حیثیت سے استعفیٰ دینے کی پیشکش کی۔ روگن نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا' تاہم رائے کے بیان پر معافی نامہ دینے کے لیے ذاتی طور پر المرعیتی سے ملاقات کی۔ جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو روگن نے مسلمان رہنما کو بتایا کہ ٹائمز کے رپورٹر نے رائے سے جو بیانات منسوب کیے وہ "خصوصی مفاداتی گروپوں" نے شائع کروائے تھے۔ بعد ازاں المرعیتی نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "ہمارے لیے جو بات تشویش کا باعث ہے' وہ یہ ہے کہ بیرونی خصوصی مفاداتی گروپوں نے روگن کو ہماری برادری کے لیے روایتی طور پر کشادہ ظرف اور احترام کرنے والے شخص سے تبدیل کر کے مکالمے اور مہذبانہ گفتگو کے دروازے بند کرنے والا فرد بنا دیا۔"

مسلم پبلک افیئرز کونسل کے سینیئر مشیر مہر حتوط ایم۔ ڈی نے رپورٹروں سے کہا: "جب تک رائے رسمی معافی نہیں مانگتا' مسٹر روگن سے ملاقات کو درست سمت میں صرف ایک قدم ہی سمجھا جا سکتا ہے۔" دو دن بعد المرعیتی کو ایک معافی نامہ موصول ہوا جس میں رائے نے "مسلمان برادری کے لیے اپنے احترام" کا اظہار کیا۔ ایک ہفتے بعد فلیکن نے ایک ٹیلی فون انٹرویو کے دوران اپنے متنازعہ مضمون کو درست ہی قرار دیا۔[8]

7 نومبر کو روگن 43 فیصد ووٹ حاصل کرتے ہوئے دوبارہ انتخاب کی اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے۔

جولائی 2000ء میں گیفرڈ نے مسلمان برادری کے ساتھ تعلقات بہتر بناتے ہوئے المرعیتی کو "امریکی مسلمانوں کے تجربوں" کے حوالے سے قائم کیے گئے کیپٹل ہل کے ایک فورم میں شامل کیا۔ اس فورم کی سرپرستی مونرو' لوئیسیانا کے ایک بپٹسٹ پادری ریورنڈ ویلٹن گیڈی کی سربراہی میں کام کرنے والی ایک تنظیم "اتحاد بین المذاہب" (Interfaith Alliance) تھی۔ گیفرڈ نے فورم کو بتایا: "مسلمان' جو امریکہ میں نسلی حوالے سے انتہائی متنوع گروپوں میں سے ہیں' عوامی زندگی میں ان کی غلط تصویر کشی کی گئی ہے اور انہیں امتیاز اور بدگمانیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔"

شرکاء میں ڈاکٹر حتوط اور "مرکز برائے اصلاح یہودیت" کے ربی ڈیوڈ سیپر سٹین بھی شامل تھے۔ یہ دونوں حضرات "اتحاد بین المذاہب" کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے رکن ہیں۔ ان کے علاوہ امریکی رکن کانگرس ایمو ہاؤٹن' آر این وائی' اور کیپٹل ہل پر سٹاف ممبر کی

حیثیت سے خدماتِ انجام دینے والے تین مسلمان شامل تھے: امریکی نمائندہ گریگوری میکس ڈی۔این وائی کے دفتر میں کام کرنے والے جمیل عالم جانسن' امریکی رکن کانگرس ڈینس کیوسینک ڈی۔ او ایچ کے دفتر میں کام کرنے والی سہیلہ الجدہ اور امریکی رکن کانگرس سیرواڈ ریکیوز ڈی۔ ٹی ایکس کے دفتر میں کام کرنے والے عاصم غفور۔ 9

المریعتی دیگر خوش گوار ساعتوں سے بھی لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ 1998ء میں مسز کلنٹن کی درخواست پر انہوں نے اپنی بیوی لیلیٰ المریعتی ایم۔ڈی کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں ماہ رمضان کے اختتام پر تقریب کا اہتمام کیا۔ ایک سال بعد اس اینجلس کی یونائیٹڈ نیشنز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ہونے والے ڈنر میں ان دونوں کو ''عالمی شہری کا ایوارڈ'' دیا گیا۔

اپنے خاوند کی طرح لیلیٰ المریعتی بھی ایک مسلمان رہنما اور ترجمان کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ وہ مسلم ویمنز لیگ کی بانی اور سابقہ چیئرپرسن ہیں۔ 1995ء میں وہ چین میں منعقد کی گئی اقوام متحدہ کی خواتین کی عالمی کانفرنس میں شرکت کرنے والے اس امریکی وفد میں شامل تھیں جس کی چیئرپرسن خاتون اول ہلیری روڈھم کلنٹن تھیں۔ 1999ء کے اوائل میں صدر کلنٹن نے انہیں ''بین الاقوامی مذہبی آزادی کے کمیشن'' کا رکن بنا دیا۔

شکاگو کے اسلامک سنٹر کے طلعت عثمان اور حنوط نے 2000ء کے موسم گرما میں اس وقت ایک تاریخ ساز کام کیا' جب انہوں نے دو بڑی سیاسی جماعتوں کے صدارتی نامزدگی کے قومی کنونشنوں میں پہلی بار نماز ادا کی۔ عثمان نے فلاڈیلفیا میں ہونے والے ری پبلکن پارٹی کے کنونشن کے پہلے دن کے اختتام پر اور حنوط نے لاس اینجلس میں ڈیموکریٹک پارٹی کا کنونشن شروع ہونے کے وقت نماز ادا کی۔ اس کنونشن سے صدر بل کلنٹن اور خاتون اول ہلیری روڈھم کلنٹن نے خطاب کیا تھا۔ 1992ء میں اس وقت ایک پانچواں بڑا مسلمان گروپ منظر پر نمودار ہوا جب حال ہی میں بلاغت میں ڈاکٹریٹ کرنے والے کیلیفورنیا کے ایک پروفیسر آغا سعید نے ''امریکن مسلم الائنس'' (اے ایم اے) کی بنیاد رکھی۔ یہ تنظیم خاص طور پر سیاسی جماعتوں اور سیاسی عمل میں حصہ لینے کے لیے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے واسطے وقف ہے۔

اے ایم اے سے پہلے ٹیکساس میں ''ٹیکساس امریکن مسلم کاکس'' دو برس سے مسلمانوں کی جماعتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اس کے چیئرمین سید احسنی نے بتایا کہ کاکس کے اراکین نے صرف 1996ء میں پچیس مسلمانوں کو حکومتی عہدے کے لیے منتخب

ہونے میں مدد دی۔ جیسا کہ ڈاکٹر نظام اے۔ پیروانی نے واضح کیا کہ تنظیم کا مقصد ہے ''اسلام اور مسلمانوں کا مثبت تاثر قائم کرنا اور سیاسی عمل میں شرکت کے ذریعے ان کے مفادات کو فروغ دینا۔'' [10] اب یہ ٹیکساس میں اے ایم اے کی شاخ بن گئی ہے۔

اس کے ایک رکن ڈاکٹر امان اللہ خان اس اندرونی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ٹیکساس کے گورنر جارج ڈبلیو بش کو 2000ء میں صدر بننے میں مدد دی تھی۔ تنظیم کے ایک اور رکن برکت علی بھی ری پبلکن پارٹی سے اعلیٰ سطحی روابط رکھتے ہیں جبکہ دیگر اراکین ڈیموکریٹک پارٹی کے رہنماؤں سے ذاتی تعلقات رکھتے ہیں۔

1999ء میں کاکس نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ مستعدی کا مظاہرہ کریں۔ اس نے اعلان کیا کہ امریکی مسلمان ''دنیا کی سب سے زیادہ امیر اسلامی کمیونٹی'' ہیں اور ان پر زور دیا کہ ''وہ مغرب پر الزام تراشی ترک کر دیں اور اپنی کوتاہیوں کے حوالے سے دوسروں پر انگلیاں اٹھانا چھوڑ دیں۔'' پارٹی کنونشنوں میں مندوب کے طور پر شرکت کرنے والے ٹیکساس کے پچیس مسلمانوں نے انتخاب میں امیدوار بننے پر آمادگی ظاہر کی۔

اس تنظیم کے اراکین مقامی اور ملکی سطح پر دونوں جماعتوں کے چنیدہ نمائندوں کی مالی امداد کرتے ہیں۔ 1996ء میں انہوں نے ٹیکساس کے ری پبلکن امریکی سینیٹر فل گریم کے دوبارہ انتخاب کے لیے ساٹھ ہزار ڈالر اکٹھے کیے۔ انہوں نے دو ڈیموکریٹس لووا کے ٹام ہارکن اور ساؤتھ ڈکوٹا کے ٹم جانسن کو امریکی سینیٹ میں دوبارہ منتخب ہونے کے لیے ٹھوس امداد فراہم کی۔

اے ایم اے کے ذریعے آغا سعید نے مسلمانوں کے سیاسی عمل کو قومی سطح تک وسعت دے دی ہے۔ یونیورسٹی کے کل وقتی استاد کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے باوجود وہ قومی سیاسی تنظیم کی مزید پیشرفت کے لیے دور دراز کا سفر کرتے رہتے ہیں۔ 2000ء تک الائنس کا ایک ساٹھ رکنی قومی سیکرٹریٹ اور چار سو سے زیادہ رہنماؤں کا نیٹ ورک وجود میں آچکا تھا' یہ سب رہنما تقریباً مکمل طور پر رضا کار ہیں۔ اس وقت تک اکتیس ریاستوں میں ترانوے شاخیں قائم ہو چکی ہیں' جبکہ صرف کینیڈا میں چودہ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ اے ایم اے کے کل اراکین کی تعداد تقریباً سات ہزار تھی۔

آغا سعید نے بڑی تیزی سے شہرت حاصل کی ہے۔ جب ہم 1985ء میں پہلی مرتبہ ملے تو وہ ایک گریجویٹ طالب علم تھے اور تارکین وطن کی سیاسی بیداری کے لیے پہلے ہی

وقف تھے۔ چھ سال بعد انہوں نے مسلمانوں کو قومی جماعتی مرکزی دھارے میں لانے کے منصوبے کا خاکہ ٹیلی فون پر سنایا۔ فروری 2000ء میں لاس اینجلس کے ایک ہوٹل کے کمرے میں انہوں نے اے ایم اے کی حکمت عملی کو واضح کرتے ہوئے کہا: "ہمارا بنیادی مقصد ہے تمام پچاس ریاستوں میں مسلمانوں کو مرکزی دھارے کے عوامی معاملات' شہری مکالمے اور سیاسی جماعتی سرگرمی میں منظم کرنا۔ ہمارا ایقان ہے کہ سیاسی قوت صرف اعداد کا کھیل نہیں بلکہ پہل' ایجاد و اختراع اور عزم کی ایک مشترکہ پیداوار ہے۔ ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے دبائے ہوئے غصے' فرسٹریشن اور درد کو ایسے تخلیقی اور بامعنی اقدامات میں ڈھال دیں' جو ہماری اپنی تقویت کا باعث بنیں گے۔" [11]

انہوں نے تحقیق کرنے کے بعد انکشاف کیا کہ امریکہ میں پانچ لاکھ اکیس ہزار انتخابی عہدے ہیں۔ "مسلمان اس وقت تک ان میں سے' بہت کم عہدوں کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ امریکی سیاسی نظام میں اپنے لیے امکانات کو مکمل طور پر استعمال کریں۔" انہوں نے پیش گوئی کی کہ کیلیفورنیا' ٹیکساس' نیوجرسی' مشی گن' فلوریڈا' الی نائے اور نیویارک میں اتنی زیادہ تعداد میں مسلمان آباد ہیں کہ وہ صدارتی انتخابات میں فیصلہ کن حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں اور ان ریاستوں کے کانٹے دار مقابلوں میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ایسے قدرے چھوٹے گروپ بڑی تعداد میں موجود ہیں جو پالیسی مقاصد کو آگے بڑھانے اور عوامی میدان میں رہنمائی کے لیے مسلمانوں کو تربیت دے رہے ہیں۔

پیٹرسن' این۔ جے کے ایک صنعت کار محمد یونس کی سربراہی میں امریکن مسلم یونین نے دو برسوں میں دو ہزار افراد کو رکن بنایا اور 2000ء اور 2001ء کے دوران فلسطینیوں کے حقوق کے لیے مین ہٹن میں جلسے کرنے والی میگڈی محمود کی تنظیم میٹروپولیٹن مسلم فیڈریشن کی معاونت کی۔

ٹیلروائل' الی نائے میں کرسچن کاؤنٹی میڈیکل کلینک کے مالک زیاد اصالی ایم۔ ڈی "عرب امریکن یونیورسٹی گریجوئٹس" نامی تنظیم کے سربراہ ہیں اور مشرق وسطیٰ میں انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی بہت سی غیر نفع اندوز (Nonprofit) تنظیموں کے بورڈ میں شامل ہیں۔ وہ "امریکن عرب انٹی ڈسکریمینیشن کمیٹی" کے مشیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہیں' جس کے بورڈ آف ڈائریکٹر کی چیئرپرسن ان کی بیوی نائلہ ہیں۔

مرغوب اور رینا قریشی واشنگٹن ڈی۔سی میں مسلم سٹوڈنٹ نیٹ ورک کے سرپرست ہیں۔ ہر سال موسم گرما میں وہ یونیورسٹیوں کے دس سے بیس تک چوٹی کے مسلمان طالب علموں کو مختلف حکومتی دفتروں میں تربیتی اہل کاروں کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ چھٹی کے اوقات میں وکلاء اور بین الاقوامی' امریکی اور اسلامی قانون کے علماء ان طالب علموں کو پڑھاتے ہیں۔ ہر طالب علم کو رہائش اور معقول وظیفہ دیا جاتا ہے۔

ان کی بیٹی آصفہ قریشی لکھتی ہیں: ''توقع کی جاتی ہے کہ یہ طلباء اس پیشگی تربیت اور عملی تجربے کی وجہ سے مستقبل میں امریکی مسلمانوں کی سیاست میں بہت بااثر ہوں گے۔''

13 ہارورڈ یونیورسٹی میں قانون کی گریجویٹ طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک منفرد مسلم سروس کی بھی سرپرستی کی۔ وہ مسلمان وکلاء اور قانون کے طالب علموں کے ای میل مباحثہ گروپ کی ڈائریکٹر تھیں۔ 1999ء میں اس پینل کے ایک سو اراکین تھے۔ وہ قانون کے پیشے میں مسلمان برادری کی دلچسپی کو بڑھتا ہوا پاتی ہیں: ''یہ بات واضح ہے کہ مجموعی طور پر قانونی نظام میں مسلمان زیادہ شامل ہو رہے ہیں اس لیے ان میں ایک متحد سیاسی آواز بلند کرنے کے لیے آگاہی اور دلچسپی بڑھ رہی ہے' نہ صرف مقامی بلکہ بیرونی مسائل میں بھی۔''

نیشوائل' ٹینی سی بین المذہبی افہام وتفہیم کے لیے مسلمانوں کے اولین اقدامات کا ایک اہم مرکز ہے۔ خلیجی جنگ (گلف وار) کے دوران مقامی گرجاؤں نے مسلمانوں کی مدد سے شہر بھر میں عوامی لیکچروں کا اہتمام کیا۔ زینب البری' جنہیں ایک مرتبہ نیشوائل' ٹینی سی کے ''ایک فرد پر مشتمل سفارت خانہ'' قرار دیا تھا' اور ان کے معاشیات داں شوہر ڈاکٹر نور نصیری اسلام کے حوالے سے آگہی کو فروغ دینے کے لیے اپنی خدمات کے حوالے سے بہت زیادہ مشہور ہیں۔ زینب البری نے اپنے کام کا آغاز 1985ء میں تب کیا جب وہ اقوام متحدہ کی ''امن روابط'' تقریب کی چیئرپرسن بنیں۔ وہ باقاعدگی سے مضامین اور ایڈیٹر کے نام خطوط لکھتی ہیں' جن میں سے ایک یو ایس اے ٹوڈے میں شائع ہوا تھا۔ خلیجی جنگ کے دوران انہوں نے ''مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مکالمے'' کا اہتمام کیا' جس میں چھ عرب امریکی اور اتنی ہی تعداد میں یہودی امریکی خواتین باقاعدگی سے اکٹھی ہوا کرتی تھیں۔

محمد یوسف اور سیدہ یوسف نیشوائل میں ایک ریڈیو پروگرام ''اسلام ان فوکس'' کے سرپرست ہیں اور سامعین کو اسلام کے حوالے سے سوال دریافت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک عراقی تارک وطن علی الموسوی مسلمان ملکوں سے آنے والے پناہ گزینوں کی

آبادکاری میں نیشوائل حکومت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ابوبکر ہاہ ہیومن رائٹس کمیشن ٹینی سی کے ایک رکن ہیں۔ ڈاکٹر عرشی ناصح پچیس برس سے بین المذہبی رہنما چلی آرہی ہیں۔ 1980ء میں انہیں نیشوائل کی ''ویمن آف دی ایئر'' (Woman of the year) قرار دیا گیا اور اپنے خیراتی کاموں کی وجہ سے پورے شہر میں ''ماں عرشی'' (Mother Arshi) کے نام سے مشہور ہیں۔

صادق محی الدین ایم۔ ڈی سینٹ لوئیس کے علاقے میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے قائد ہیں۔ وہ صومالیہ میں خانہ جنگی کے بعد شروع کیے گئے امریکہ کے انسانی بحالی کے پروگرام کے جزو کے طور پر دس ہزار سے زیادہ تارکین وطن کی آبادکاری میں معاونت کر چکے ہیں۔ انہوں نے سینٹ لوئیس اور لاہور میں خیراتی کلینک قائم کیے ہیں۔ محی الدین شہری پروگراموں میں فعال کردار ادا کرتے ہیں اور عالمی امور پر سینٹ لوئیس کونسل کے کئی برس تک چیئرمین رہے ہیں۔ وہ دنیا بھر کی مساجد میں خطاب کر چکے ہیں اور سینٹ لوئیس میں 1998ء میں منعقد ہونے والے آئی ایس این اے کے کنونشن کے میڈیا چیئرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ایجنڈے کے تحت انہوں نے یہ واضح کرنے کے لیے ایک بین المذہبی اجلاس کا اہتمام کیا کہ ''مسلمان انسانی حقوق کا تسلیم کیا جانا پسند کرتے ہیں اور ساری دنیا میں واحد معیار کی ترویج چاہتے ہیں۔'' [14]

شکاگو میں طلال سنبلی ایم۔ ڈی اور ماہر تعمیرات طلعت عثمان فیڈریشن آف مسلم امریکن آرگنائزیشنز میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ گروپ شکاگو اور اس کے مضافات میں مختلف مسلمان برادریوں کے مابین تعاون کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے افریقی امریکی مسلمانوں اور دیگر مسلمانوں کے مابین تعاون کو بہتر بنانا۔ عثمان اعتراف کرتے ہیں کہ اختلاف موجود ہیں مگر انہیں یقین ہے کہ ''وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ اختلافات مٹ جائیں گے۔''

چار مسلمان شکاگو کے اڑوس پڑوس میں بین المذہبی افہام وتفہیم کو فروغ دے رہے ہیں۔ مریم زید پبلک سکول میں استانی ہیں اور انہیں الی نائے کے گورنر جارج ریان نے ہیومینیٹیز کونسل کا رکن بنایا ہے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی فعال رکن کی حیثیت میں انہوں نے غیر جماعتی مقامی سکول بورڈ کے انتخاب کے لیے اپنی ناکامی سے دوچار ہونے والی مہم کے دوران سکولوں میں عرب دشمن تعصب کے خلاف احتجاج کیا۔ مصنف رے حنانیہ نے ان کی مہم کو

''مقامی سیاست میں عرب امریکیوں اور مسلمانوں کو عروج دینے والی مہم'' قرار دیا۔

سامر غولے ایک ادیبہ اور فنکارہ ہیں۔ ان کی تازہ کتاب ان کی جوان بیٹی شاہدہ کو لگنے والی بیماری سپائنا بیفیڈا کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اس سے پہلے شاعری کی دو کتابوں میں انہوں نے مسلمانوں اور عربوں کو درپیش چیلنجوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ فلسطین کے لیے کام کرنے والی ایسوسی ایشنوں میں رہنما کردار ادا کرتی اور بچوں کو عربی پڑھاتی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی رنگدار کتابیں اور تہنیتی کارڈز شائع کیے ہیں' جو سب کے سب اسلامی اور عرب تصورات پر مبنی ہیں۔ ''میں مسلمان ہوں تاہم میں محسوس کرتی ہوں کہ زیادہ بڑے معاشرے میں شامل ہونا اور خدا کے پیغام کے تحت متحد ہونا زیادہ اہم ہے۔''

دو دیگر مسلمان اپنا وقت سیاسی اور شہری مقاصد میں بانٹتے ہیں۔ فلسطین میں پیدا ہونے والے خلیل شلبی ایک بزنس مین ہیں' جو عرب امریکی تنظیموں میں فعال ہیں اور ڈیموکریٹک پارٹی کے ایک رہنما ہیں۔ صفیہ شیلو ڈپٹی رجسٹرار کی حیثیت سے ووٹروں کی رجسٹریشن کے لیے کام کرتی ہیں اور ایک ایسے پینل میں خدمات انجام دیتی ہیں جو پہلی مرتبہ قانون شکنی کرنے والے نوجوانوں کی مدد کرتا ہے۔ ''بجائے اس کے کہ وہ عدالت جا کر سخت سزاؤں کا سامنا کریں ہم انہیں خدمت خلق (کمیونٹی سروس) کے لیے ہدایت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔'' 16

سان فرانسسکو کے دستاویزی فلمیں تیار کرنے والے فری لانسر مائیکل وولف واشنگٹن ڈی۔ سی کے الیکس کرونیمر کے ساتھ مل کر بین المذہبی افہام و تفہیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے حج پر دستاویزی فلم تیار کی ہے۔ جسے وسیع پیمانے پر سراہا گیا ہے۔ اس فلم کو پبلک براڈ کاسٹنگ سسٹم نے پورے ملک میں نشر کیا۔

مسلمانوں کو سیاسی طور پر فعال کرنے والی ایک نمایاں' توانا اور کامیاب تنظیم 1994ء میں وجود میں آئی۔ تین مسلمانوں 37 سالہ نہاد عوض' 38 سالہ عمر احمد اور 43 سالہ ابراہیم ہوپر نے کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز قائم کی جسے اس کے مخفف سی اے آئی آر سے زیادہ جانا جاتا ہے۔

عوض اور احمد اردن کے ایک فلسطینی مہاجر کیمپ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ منی پولس میں طالب علمی کے زمانے میں ایک دوسرے سے ملے' یہاں ان کی شناسائی نومسلم ابراہیم ہوپر سے ہوئی جو کینیڈا کے رہنے والے تھے' مواصلات میں ماسٹر ڈگری رکھتے تھے اور مقامی

نشریاتی سٹیشن میں کام کر رہے تھے۔

احمد نے' جو اب سانتا کلارا' کیلیفورنیا میں ایک ہائی ٹیک فرم میں افسر ہیں' سی اے آئی آر کے لیے ابتدائی رقوم فراہم کیں اور وہ اس کے قومی بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین ہیں۔عود اور ہو پر سی اے آئی آر کے کل وقتی رہنما ہیں۔قومی ڈائریکٹر کی حیثیت میں عود تنظیم پر توجہ دیتے ہیں جبکہ ہو پر مواصلات کا انتظام سنبھالتے ہیں۔ واشنگٹن میں قائم ان کی تنظیم مسلمانوں کے شہری حقوق کے تحفظ' یک رخے تصورات کے خلاف اسلام کے دفاع اور ذرائع ابلاغ سے تعلقات کے حوالے سے مسلمانوں کی تربیت جیسے امور پر توجہ دیتی ہے۔

اس نئی تنظیم نے جلد ہی امریکن مسلم کونسل سے تعریف اور تعاون پالیا' جس کے بانی ایگزیکٹو سیکرٹری عبدالرحمٰن العمودی یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہم سی اے آئی آر کے پروگرام سے بہت خوش ہوئے اور ہم نے شہری حقوق اور قانونی تحفظ کی اپنی سرگرمیوں کو بند کرنے کے لیے بلاتاخیر ووٹ دیا۔ ذمہ داری کے تقسیم ہونے کے نتیجے میں ہماری تنظیم اس قابل ہوگئی کہ دوسرے اہم پروگراموں کے لیے توجہ اور وسائل مختص کر سکے۔ یہ ایک خوشگوار تعلق ہے۔''

سی اے آئی آر اپنے افتتاح کے برس سے ہی لگاتار متاثر کن کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔ 1999ء تک وہ شکوہ کناں مسلمانوں کو تعصب کے دو سو سے زیادہ مختلف واقعات کے خلاف کامیاب احتجاج کرنے میں مدد دے چکی تھی۔عود کے مطابق سی اے آئی آر نے چار معاملات کے علاوہ باقی سب میں معافی منگوانے یا پالیسی میں تبدیلی کروانے میں کامیابی حاصل کی۔ میں نے سی اے آئی آر کے وجود میں آنے کے برس کے اواخر میں واشنگٹن کی کے (K) سٹریٹ میں ایک باوقار عمارت میں اس کے چھوٹے سے دفتر کا دورہ کیا تھا۔انہوں نے ایک ریسپشنسٹ کو ملازم رکھا تھا' اس فیصلے سے سی اے آئی آر کے عملے میں 50 فیصد کا اضافہ ہوگیا تھا۔ان کی ڈیسکوں پر چیلنجوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جبکہ ان کے وسائل محدود تھے۔پہلے برس سی اے آئی آر کا خرچ ایک لاکھ ڈالر سے کم تھا جبکہ اکتوبر 2000ء میں سالانہ ڈنر کے موقع پر صرف ایک شام میں تین لاکھ ڈالر اکٹھے ہوگئے۔

جب پانچ سال پہلے میں نے عود کا انٹرویو لیا تو اس وقت سی اے آئی آر کا بجٹ تقریباً بیس لاکھ ڈالر تک پہنچ گیا تھا اور اس کا کل وقتی عملہ تین سے سولہ افراد تک ہوگیا تھا پھر بھی کام کا بہت زیادہ بوجھ رہتا تھا۔ ای میل اور فیکس کے ذریعے مدد اور معلومات کی

درخواستوں کا سیلاب سا آیا رہتا تھا۔ ان درخواستوں کو نمٹانے پر مامور دو افراد کا اندازہ تھا کہ روزانہ تقریباً ایک ہزار درخواستیں موصول ہوتی تھیں۔ اس وقت سی اے آئی آر سانتا کلارا، لاس اینجلس، کولمبس اور ڈلاس میں علاقائی دفاتر اور پینتیس شہروں میں شاخیں قائم کر چکی تھی۔

انٹرویو کے چند روز بعد میں نے کوئنز' نیویارک میں ایک نئے علاقائی دفتر کے افتتاح کی تقریب میں شرکت کی۔ سی اے آئی آر کا ہر دفتر مالی طور پر خود انحصار ہوتا ہے اور اس کا اپنا بورڈ آف ڈائریکٹرز ہوتا ہے۔ عود فخر سے بتاتے ہیں کہ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی قومی بورڈ آف ڈائریکٹرز اور علاقائی بورڈز کی رکن ہیں۔

مئی 2000ء میں سی اے آئی آر نے 453 نیوجرسی ایونیو' ایس۔ ای' امریکی کیپٹل (Capitol) کے تقریباً سائے میں' ایک بڑی عمارت خریدی اور اپنا قومی ہیڈکوارٹر وہاں منتقل کرلیا۔ اضافی جگہ نے تنظیم کو اپنی تربیتی اور دوررس سرگرمیوں میں توسیع کے قابل بنا دیا۔

یہ تبدیلی نئی تنظیم اور اس کے قائدین کے لیے ایک اہم سنگ میل تھی۔ عود نے تنظیم کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''سی اے آئی آر ہزاروں لوگوں کو پہلے ہی ابلاغی تعلقات میں تربیت دے چکی ہے۔ اس نے حج اور رمضان کے حوالے سے تشہیری مہمات متعارف کروائیں۔ 1995ء میں رمضان مہم کے تحت تین سو چودہ خبری مضامین تیار کیے گئے اور 1998ء میں یہ تعداد چودہ سو سے تجاوز کر گئی۔''

سی اے آئی آر نے اپنے ابتدائی ایام ہی سے مسلمانوں کو عمل کی تلقین کرنے کے لیے الیکٹرانک ذرائع مواصلات کو استعمال کیا ہے۔ مجھے اپنی فیکس مشین کی صدا تقریباً ہر روز سی اے آئی آر کے تحرک کی یاد دلاتی ہے۔ تنظیم خبریں جاری کرتی ہے اور چالیس ہزار فیکس مشینوں اور انٹرنیٹ کے پتوں پر درخواستیں روانہ کرتی ہے۔ سی اے آئی آر کی امدادی مہم 1992ء میں بوسنیا کو سربیا سے آزادی دلانے والا ایک اہم عامل تھی۔

یہ پیغامات دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ پندرہ سو مساجد اور اسلامی مراکز کے لیڈروں تک پہنچتے ہیں۔ عود ان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''وہ نماز جمعہ کے اجتماعات اور مسلمانوں کے دیگر ہفتہ وار پروگراموں سے خطاب کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سی اے آئی آر کے بلیٹن اکثر و بیشتر جمعے کے خطبوں کا مرکزی خیال فراہم کرتے ہیں۔ ہم یقین سے تو نہیں کہہ سکتے کہ کتنے مسلمان نماز جمعہ ادا کرتے ہیں تاہم یہ تعداد دس لاکھ ہو سکتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سی اے آئی آر کے زیادہ تر کارکن دوسری نسل کے امریکی ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ وہ باآسانی انگریزی زبان سمجھ سکتے ہیں اور مغربی تہذیب سے شناسا ہیں۔ہمیں امید ہے کہ جلد ہی ہم پانچ لاکھ کارکنوں کے کمپیوٹر ڈیٹا بیس کے حامل ہوں گے۔'' وہ پبلک پالیسی سے متعلقہ پیشوں میں مسلمانوں کے اثر ورسوخ کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں۔'' میں جب بھی طالب علموں سے خطاب کرتا ہوں تو ان کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ صحافت' قانون یا علم سیاسیات میں نمایاں ہوں۔صحافت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور ہم بالغ مسلمانوں کو باصرار کہتے ہیں کہ وہ اس شعبے میں وظیفے جاری کریں۔مسلمانوں کو لازماً ایسے دفتروں میں فعال ہونا پڑے گا جہاں خبریں لکھی اور شہ سرخیاں بنائی جاتی ہیں۔'' [17]

سی اے آئی آر ماہرین تعلیم اور آجروں کو نیز ان مسلمانوں کو رہنمائی مہیا کرتی ہے جنہیں امتیاز کا سامنا ہو یا جو ذرائع ابلاغ کا تعاون حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ تنظیم ایک سہ ماہی خبرنامہ بھی شائع کرتی ہے جو ملک بھر میں موجود ارکان کو بھیجا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی دفاتر بھی خبرنامے شائع کرتے ہیں' جن میں مقامی مسائل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔قومی دفتر مسلمانوں کے شہری حقوق کے حوالے سے ایک سالانہ رپورٹ شائع کرتا ہے۔ 2000ء کی رپورٹ میں امتیاز' مذہبی رواداری کے فقدان' ہراساں کرنے اور غیر قانونی امتیاز کے ساڑھے تین سو مختلف واقعات درج کیے گئے ہیں' یہ تعداد 1999ء سے پچیس فیصد زیادہ ہے۔سی اے آئی آر کے کوآرڈینیٹر الیس ایرک شاکر اس حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:''اسلام کے حوالے سے درست اطلاعات کی نشرواشاعت اور امریکی مسلمانوں کی زیادہ معاشرتی اور سیاسی فعالیت اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔ [18]

مسلمانوں کی طرف سے لگاتار ایسی درخواستیں موصول ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے کام کے مقامات پر ڈاڑھی رکھنے اور خواتین کے سروں کو ڈھانپنے کے حوالے سے آجروں کے مخالفانہ ضابطوں کا سامنا ہے۔ بہت سے مسلمان ڈاڑھی رکھنے اور سر ڈھانپنے کو مذہبی تقاضا تصور کرتے ہیں اور سی اے آئی آر نے اس وقت لگاتار فتوحات حاصل کیں جب ان کی وجہ سے ملازمتوں کو خدشہ لاحق ہوا۔ تاہم سی اے آئی آر کو سب سے زیادہ مشہور فتوحات فلم بنانے والے' رسائل شائع کرنے والے اور مصنوعات تیار کرنے والے بڑے اداروں کے خلاف حاصل ہوئیں۔

1998ء میں سی اے آئی آر کی طرف سے احتجاج کے بعد کھیلوں کا سامان تیار کرنے والی مشہور فرم نائیکی (Nike) کو ایک جوتے کی ایڑھی پر نمایاں طور پر چھاپا گیا لفظ

اللہ مٹوانا پڑا۔ نائکی نے معذرت کی' ایسے تمام جوتوں کو دکانوں سے واپس اٹھوالیا' لفظ اللہ کو مٹوایا اور خیر سگالی کے اظہار کے لیے مسلمانوں کے بہت سے سکولوں میں کھیلوں کے میدان بنوا کر دیئے اور بے شمار اسلامی خیراتی اداروں کو عطیات دیئے۔

سی اے آئی آر نے ڈریم ورکس ایس کے جی سے فلم ''مصر کا شہزادہ'' (Prince of Egypt) کے سکرپٹ میں' فلم کے دسمبر 1998ء میں پریمیئر سے پہلے' تبدیلی کروا کر فلمی صنعت میں عزت کمائی۔ سی اے آئی آر نے اپنے بہار 1999ء کے خبرنامے میں بتایا کہ ''اپنے چار سالہ پروڈکشن شیڈول کے دوران سٹوڈیو نے یک رخے تصورات کے سرچشموں کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں' یہودیوں اور عیسائیوں کے گروپوں کے قریبی اشتراک سے کام کیا۔ مسلم پبلک افیئرز کونسل کے ایک رہنما ڈاکٹر مہر حتوط نے سٹوڈیو کے لیے مشیر اعلیٰ کے طور پر خدمات انجام دیں۔

جب ٹوینٹیتھ سنچری فاکس نے اپنی فلم ''محاصرہ'' (The Siege) میں سے یک رخے تصورات پر مبنی مناظر اور مکالمے نکالنے سے انکار کر دیا تو سی اے آئی آر نے ہالی وڈ سے نکل کر ملکی سطح پر احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے فلم کے نامنصفانہ مناظر کے حوالے سے اخبارات میں اشتہارات سمیت تشہیر کے دوسرے ذرائع استعمال کیے۔ بہت سے بڑے اخباروں اور ٹیلی ویژن سٹیشنوں نے اس تنازعے کی خبریں شائع کیں۔ نیویارک ٹائمز نے سی اے آئی آر اور فلم پروڈیوسر کا نقطۂ نظر ادارتی صفحے پر ایک ساتھ شائع کیا۔

سی اے آئی آر نے پورے ملک میں درجن بھر شہروں میں سینما گھروں کے باہر تماشائیوں کے لیے ایک منفرد پروگرام کا اہتمام کیا۔ عود نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا: ''جب تماشائی فلم دیکھ کر باہر آتے تو انہیں مسکراتے ہوئے مسلمانوں کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی جو انہیں قریبی مساجد کا دورہ کرنے کی دعوت دیتے' اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کرتے اور لذت کام و دہن کی دعوت دیتے۔ مجموعی طور پر سات سو تماشائیوں نے' جو مختلف برادریوں سے تعلق رکھتے تھے' دعوت قبول کی۔'' شمالی کیلیفورنیا اور واشنگٹن ڈی۔سی میں لوگوں نے زیادہ شرکت کی۔ این آربر' مشی گن میں چار سو افراد نے مسجد میں منعقدہ ایک تقریب میں شرکت کی۔ نیش وائل میں ڈیڑھ سو لوگ شریک ہوئے' اس تقریب کی کوریج ''دی نیش وائل ٹینی سی'' اور تین بڑے ٹیلی ویژن سٹیشنوں نے کی۔

عود کو یقین ہے کہ فلموں کے شائقین میں اس مہم کے ذریعے مسلمانوں کے لیے

خیر۔ بانی کے جذبات پیدا ہوئے اور فلم کو دو کروڑ ڈالر کا گھاٹا ظاہر کرنا پڑا۔'' شاید فلمی صنعت نے دو کروڑ ڈالر کا سبق سیکھ لیا ہو۔''

سی اے آئی آر نے دوسری کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ اس نے اسلام کے حوالے سے متعصبانہ تبصروں کو چیلنج کرتے ہوئے ممتاز افراد اور اداروں سے معافیاں منگوائیں ہیں۔ ان میں شامل ہیں این بی سی کے ایک پروگرام کے میزبان لینو' ریڈیو مبصر پال بارو نے امریکی رکن کانگرس جم سیکسٹن' آر این جے' شکاگو کی قانونی فرم میئر' براؤن اور پلیٹ اور نیشنل پبلک ریڈیو۔ سی اے آئی آر نے جمعہ 15 ستمبر 2000ء کو امریکی مسلمانوں کو ووٹ درج کروانے کا دن منانے میں مدد دی۔

تنظیم کو سب سے بڑی فتح اس وقت حاصل ہوئی جب اس نے ''یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ'' کے مالک اور پبلشر مورٹن زکرمین سے اس اداریئے کے حوالے سے تحریری معافی منگوائی جس میں جھوٹا الزام لگایا گیا تھا کہ صدیوں پہلے رسول اللہ حضرت محمد ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ کیے گئے ایک معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ (نعوذ باللہ) عوداس کا ذکر کرتے ہوئے بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے کہا:'' وہ سفید جھوٹ تھا اور رسول اللہ ﷺ پر ایک حملہ جنہوں نے کبھی کسی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ جب میں نے زکرمین کو بتایا کہ اگر اس نے واضح اور تحریری طور پر بلاتاخیر معافی نہیں مانگی تو اسے مسلمانوں کے احتجاج کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس نے یہ کہتے ہوئے اس تنبیہ کو نظرانداز کر دیا'' میرے مہمان بنو۔''

''سی اے آئی آر نے انٹرنیٹ اور فیکس کے ذریعے عمل کے لیے تیار رہنے کی ہدایت جاری کر دی۔ تین دن بعد ہی زکرمین کا فون آ گیا' وہ سی اے آئی آر سے اصرار کر رہا تھا کہ احتجاج رکوا دیا جائے۔ زکرمین کی سیکرٹری نے سی اے آئی آر کو بتایا'' ہمارے دفتر بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم کوئی کام نہیں کر سکتے ہیں۔'' زکرمین نے دہائی دی:'' پلیز! اسے رکواؤ۔'' میں نے اسے کہا:'' ہم نہیں بلکہ تم احتجاج رکوا سکتے ہو۔'' اس نے جواب دیا:'' میں فون پر اسی وقت تم سے معافی مانگتا ہوں۔'' میں نے کہا:'' اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ تم کو اسی صفحے پر واضح طور پر معافی چھاپنی پڑے گی جس صفحے پر تم نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جھوٹ چھاپا تھا۔'' زکرمین نے کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گا لیکن رسالے کے اگلے شمارے میں اس نے یونہی سا ایک تبصرہ لگا دیا' معافی نہیں مانگی۔''

سی اے آئی آر نے فوری طور پر رسالے کے واشنگٹن والے دفتر کے باہر ایک

نیوز کانفرنس بلوالی جہاں دیگر مسلمان لیڈروں نے بھی سی اے آئی آر سے مل کر مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ زکرمین کے رسالے پر دباؤ میں اضافہ کردیں۔ اس تاکید کا جواب پہلے سے بھی زیادہ بھرپور تھا اور زکرمین نے فوراً مسلمانوں کے مطالبات کو پورا کردیا۔ اس نے اس جگہ پر ذاتی طور پر معافی مانگی جو معمول کے مطابق اس کے اداریوں کے لیے مختص ہوتی تھی۔

عوداسے ایک اہم فتح قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''مسلمان اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ وہ ٹوٹے نہیں۔ انہوں نے پہلی بار ایک طاقتور پبلشر کو مسلمانوں سے غیر مشروط معافی مانگنے پر مجبور کردیا۔

''ہم ایک نفسیاتی رکاوٹ کو ہٹانے میں کامیاب رہے ہیں۔ اب تحقیر و تذلیل کی صورت میں مسلمان بے بسی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ انہیں اپنے اوپر نیا اعتماد حاصل ہوگیا ہے' ایک احساس کہ وہ انسانوں کی حیثیت سے اپنے وقار کا خود تحفظ کرسکتے ہیں۔ اب وہ جان گئے ہیں کہ ایک مشترک مقصد کے لیے متحد ہوکر جدوجہد کرنے سے وہ کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔'' [19]

جو مسلمان تنظیمی اور پبلک پالیسی سرگرمیوں میں مصروف ہیں انہوں نے بین المذہبی افہام وتفہیم کے لیے متاثر کن اقدامات کیے ہیں' تاہم وہ امریکہ کی مسلمان برادری کا بہت چھوٹا سا حصہ ہیں۔ دو سب سے بڑی تنظیموں کے اراکین اور ان کے سالانہ کنونشنوں میں حاضرین کی تعداد ان مسلمانوں کی تعداد کا ایک غیر رسمی تخمینہ ظاہر کرتی ہے' جو تنظیمی سرگرمیوں مین حصہ لیتے ہیں۔ اندازہ ہے یہ تعداد زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ہوسکتی ہے۔

جبکہ باقی ساٹھ لاکھ مسلمان کونے کھدروں میں خاموش پڑے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ چندہ تک نہیں دیتے۔

حواشی

1۔ انٹرویو' 1-3-2000

2۔ شکاگو ٹریبیون' 13-10-2000 'صفحہ 8' سیکشن 2

3۔ صدیقی' انٹرویو 29-10-2000

4۔ پاکستان لنک' 1-9-2000' صفحہ 1

5۔ واشنگٹن ٹائمز 7' 17-2-2000 ''ویکلی''' صفحہ 23

6۔ اے ایم سی: ہمارے پہلے پانچ سال' (11-96)

7۔ ایم پی اے سی' ای میل ریلیز' 19-4-2000

8۔ سی اے آئی آر' 22-6-2000' ایم پی اے سی بیانات' 24-6-2000 اور 27-6-2000' نیز فنیگن سے فون انٹرویو' 28-6-2000

9۔ ایم پی اے سی یو ایس اے نوٹس' 17-7-2000

10۔ امریکن مسلم کاکس ایئر بک' 1997ء۔ 1996ء۔

11۔ سعید کا انٹرویو' 22-2-2000

12۔ سعید کا انٹرویو' 3-10-1998

13۔ خط' 5-4-1999

14۔ ایلٹن ٹیلی گراف' 4-8-1998' ایلٹن' الی نائے' صفحہ 2

15۔ انٹرویو طلعت عثمان' 27-12-2000

16۔ رے حنانیہ کا انٹرویو' 18-6-1999

17۔ نہاد عود کا انٹرویو' 3-2-2000

18۔ سی اے آئی آر ای میل ریلیز' 18-4-2000

19۔ انٹرویو' 22-5-1999

گیارھواں باب

امریکی سیاست میں مسلمانوں کا کردار

برسوں تک خاموشی سے الگ تھلگ رہنے کے بعد امریکی مسلمان بتدریج سیاسی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت میں نمایاں حیثیت حاصل کر رہے ہیں۔ وہ حکومتی عہدوں کے لیے منتخب ہو رہے ہیں' دوسرے امیدواروں کے جیتنے میں مدد دے رہے ہیں' سیاسی جماعتوں اور حکومت کی پالیسی سرگرمیوں میں قیادت فراہم کر رہے ہیں نیز عدلیہ میں بھی قدم جما رہے ہیں۔

حاصل ہونے والی انتخابی کامیابیوں میں سے بعض کو چھوٹی اور بعض کو بڑی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم مسلمانوں کے لیے کوئی فتح چھوٹی نہیں ہے۔ کامیابی خواہ کسی جماعت میں کمیٹی کا بغیر تنخواہ والا رکن بننے کی ہو یا ریاستی مقننہ میں باوقار رکنیت حاصل کرنے کی ہو سب فتوحات عظیم ہیں۔

چار سال قبل پندرہ فوجی تنصیبات میں کیفے ٹیریا کے مینیجر کی حیثیت سے کامیابی حاصل کرنے والے ایک افریقی امریکی ڈیموکریٹ لیری شا ایسے پہلے مسلمان بن گئے جنہوں نے ریاستی مقننہ کا انتخاب جیتا ہو۔ وہ پہلی مرتبہ 1994ء میں شمالی کیلیفورنیا کے ایوان نمائندگان کے لیے منتخب ہوئے اور دو سال بعد انہوں نے ریاستی سینیٹ میں نشست جیت لی۔ ان کی سیاسی زندگی میں مذہب کبھی تنازعے کا باعث نہیں بنا اور ان کے ساتھی اراکین نے کبھی کبھار ہی اس کا حوالہ دیا۔ شا کہتے ہیں: ''وہ مجھے میرے مذہب کی بجائے کاروبار کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے لڑکپن میں نیشن آف اسلام کے رہنما میلکم ایکس کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلام میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ میلکم ایکس بعدازاں مرکزی دھارے کے اسلام کی طرف لوٹ گئے تھے۔

نومبر 2000ء میں شانے دوسری مرتبہ بلامقابلہ کامیابی حاصل کر لی۔ [1] اسی روز دو مزید مسلمان ریاستی مقننہ کے لیے منتخب ہوئے: عائشہ ڈبلیو۔ عبداللہ اودلیس ربوڈز آئی لینڈ کے ایوان نمائندگان کے لیے دوسری مرتبہ منتخب ہوئیں اور امریکن مسلم الائنس کی نیو ہمپشائر شاخ کے چیئرمین صغیر طاہر نے نیو ہمپشائر کے ایوان نمائندگان میں نشست جیتی۔

پاکستانی نژاد طاہر کہتے ہیں کہ وہ اپنے ضلع میں کسی قسم کا مذہبی تعصب نہیں پاتے:

''صرف میرا خاندان اور میں بارہ ہزار اہل ووٹروں والے اپنے حلقے میں مسلمان ہیں اور ہمیں کبھی تعصب کا احساس نہیں ہوا۔ اگر دوسرے مسلمان تعصب محسوس کرتے ہیں تو پھر انہیں اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے لیے کیا کر رہے ہیں۔'' طاہر ایک گریجویٹ انجینئر ہیں جنہیں چھت سازی اور بڑی کارپوریشنوں کے لیے انسولیشن مسائل حل کرنے میں تخصص حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''میرے خاندان کو امریکہ میں جو خوبصورت زندگی ملی ہے میں اس کا صلہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

1998ء میں وسکانسن سرکٹ کے جج حمدی عزالعرب امریکہ میں عدلیہ کے لیے منتخب ہونے والے پہلے مسلمان بن گئے۔ وہ امریکن مسلم الائنس کی فج برگ' وسکانسن شاخ کے بانی ہیں۔ 2000ء میں عزالعرب دوبارہ منتخب ہوئے' جبکہ ان کے ساتھ دو مزید مسلمان جج بھی منتخب ہوئے: انڈیانا کے ڈیوڈ شاہد اور فلوریڈا کے عبدالمجید۔ وہ دونوں 7 نومبر 2000ء کو منتخب ہوئے۔ لاس اینجلس کے وکیل ایرک علی خان ایک اور خوش نصیب ہیں' انہیں امریکہ کا پہلا مسلمان اسسٹنٹ اٹارنی بننے کا اعزاز حاصل ہوا' وفاقی عدلیہ کا یہ ایک اہم عہدہ ہے۔

انتخابی راستے پر چلتے ہوئے مسلمان سیاسی عمل کو زہریلا بنا دینے والے غلیظ مذہبی اور نسلی تعصب سے دوچار ہوتے ہیں' تاہم جب اچھے شہری اس زہر کو نکال دیتے ہیں تو وہ خوشی مناتے ہیں۔

ایک موقع پر نومبر 1997ء میں مشی گن کے چھوٹے سے شہر ہیمٹرامک میں میونسپل انتخاب کے ختم ہونے سے ذرا پہلے مسلمانوں نے ایک اہم مگر غیر متوقع کردار ادا کیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ مٹھی بھر ووٹ عظیم کامیابی کا باعث بن سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی تقریباً بیس ہزار ہے۔ پولش رومن کیتھولک چالیس فیصد اور مسلمان بیس فیصد۔ باقی آبادی مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں پر مشتمل ہے۔

آخر میں ووٹ ڈالنے والے مسلمانوں نے میئر رابرٹ کوزازن کو دو سالہ مدت

کے لیے گیارہویں مرتبہ انتخاب میں نو ووٹوں سے ہرا دیا۔ ان کے مقابل گیری ایل۔ زانچ تھے۔ رومن کیتھولک زانچ نے مسلمان ووٹوں کے حصول کے لیے شاندار مہم چلائی تھی۔ انتخاب کے دن ان کے حامیوں کے ایک گروپ نے مسلمان علاقوں میں ووٹ ڈالنے کی شرح کم دیکھی تو وہ قریبی مسجد کی طرف دوڑے جہاں مسلمان مغرب کی نماز ادا کر رہے تھے۔ مسجد میں انہوں نے مسلمانوں سے ووٹ دینے کی درخواست کی۔ ان کی درخواست پر ووٹ ڈالنے کا وقت ختم ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ایک سو ستر مسلمانوں نے ووٹ ڈالے۔

جب ووٹ گنے گئے تو غیر سرکاری نتائج کے مطابق انہیں تین ووٹوں سے فاتح قرار دیا گیا۔ سرکاری گنتی میں ان کا اپنے فریق پر غلبہ اس سے تین گنا یعنی نو ووٹ ہو گیا۔ زانچ نے طمانیت سے مسکراتے ہوئے کہا ''بھرپور فتح۔'' اگر مسلمان ووٹ ڈالنے کے آخری وقت معاونت نہ کرتے تو زانچ ایک سو اکسٹھ ووٹوں سے ہار گئے ہوتے۔

میئر کی حیثیت سے انہوں نے سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ شاہد احمد کو ملٹی کلچرل ڈائریکٹر اور نورس نزر کو انکم ٹیکس ڈائریکٹر نامزد کیا۔ وہ دونوں ہیمٹرامک کی میونسپل حکومت کی تاریخ میں انتظامی عہدوں کے لیے مقرر کیے جانے والے اولین مسلمان تھے۔ سیاسی طور پر فعال مسلمانوں کی فہرست میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ملک کی دوسری سب سے بڑی ریاست نیویارک میں دو مسلمان سیاسی افق کے درخشندہ ستارے ہیں۔ ایک کا تعلق ڈیموکریٹک پارٹی سے ہے اور دوسرے کا ری پبلکن پارٹی سے۔

1996ء میں بنگلہ دیش نژاد اکتالیس سالہ کیمیادان ڈیموکریٹ مرشد عالم نیویارک سٹی میں حکومتی عہدے کے لیے منتخب ہونے والے پہلے جنوبی ایشیائی تارک وطن بن گئے۔ انہوں نے نیویارک سٹی ڈسٹرکٹ 29 کے سکول بورڈ کے غیر جماعتی انتخابات میں ایک نشست جیتی۔

رفتہ رفتہ وہ سیاست میں مزید مستحکم حیثیت حاصل کرتے گئے۔ انہوں نے امریکہ میں اتنا ممتاز مقام پا لیا کہ جب صدر کلنٹن ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے دورے پر گئے تو وہ ائیر فورس ون پر ان کے ہمراہ سفر کرنے والے واحد جنوبی ایشیا نژاد فرد تھے۔

عالم کو یقین ہے کہ غیر ممالک میں پیدا ہونے والے افراد کا تناسب نیویارک سٹی کی آبادی میں تقریباً ساٹھ فیصد ہے اور انہیں تاکید کرتے ہیں کہ وہ اپنے ووٹ درج کروائیں اور انتخابات میں ووٹ بھی ڈالا کریں۔

1996ء میں ایک افریقی امریکی مسلمان تحسیلیل ہیم نے کوئنز کے سکول بورڈ میں نشست جیت لی۔ جب ان سے پوچھا گیا: کیا وہ کانگرس میں خدمات انجام دینا پسند کریں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا "یہ بہت بعید از قیاس لگتا ہے' تاہم میں وہاں خدمات انجام دینا بہت پسند کروں گا۔ وہ ایک خوبصورت موقع ہوگا۔"

اگرچہ سان ڈیاگو کے جم بیلسس نے' جواب ایڈاہو میں رہتے ہیں' اسلام قبول کرنے سے پہلے دو برس امریکی ایوان نمائندگان میں خدمات انجام دیں تاہم کانگرس کے لیے کوئی مسلمان منتخب نہیں ہوا ہے۔ بہت سے مسلمانوں نے انتخاب تو لڑا لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

انتخابی مہم چلانے کی تکنیکیں سیکھنے اور مقامی اور ریاستی عہدوں کے لیے انتخابات لڑنے والے مسلمانوں کی فہرست میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسلمان قومی اور ریاستی سیاسی کنونشنوں کے لیے مندوب کے طور پر بڑی تعداد میں منتخب ہو رہے ہیں۔ اگست 2000ء کے ڈیموکریٹک قومی صدارتی نامزدگی کنونشن میں تیس مسلمان مندوبین شریک تھے۔

نومبر 1999ء میں سہیل اے۔ خان نے کیمبل' کیلیفورنیا کے تھامس کیمبل کے پریس سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دینا شروع کیا۔ وہ کیپٹل ہل پر اہم عہدہ حاصل کرنے والے پہلے مسلمان نہیں تھے۔ یہ اعزاز خلیل منیر کو حاصل ہے جو کئی سال بروکلین کے ڈیموکریٹ ایڈولفس ٹاؤنز کے پریس سیکرٹری رہے۔

مسلمان عورتوں کے لیے کیلیفورنیا کی رہائشی ریمانشا شیبی ایک مثال ہیں۔ وہ یروشلم میں پیدا ہونے والی فلسطینی ہیں۔ انہوں نے بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اب وہ اورنج کاؤنٹی میں رہتی ہیں اور کیلیفورنیا کی ڈیموکریٹک پارٹی میں طویل مدت سے امتیازی مقام کی حامل ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے کہتی ہیں: "میں دو کل وقتی کام کرتی ہوں' ایک تو میں اپنی روزی کمانے کے لیے ایک انشورنس کمپنی میں کام کرتی ہوں اور دوسرے ڈیموکریٹک سیاست کے لیے رضاکارانہ طور پر۔"

ان کے خلوص اور جوش و ولولے نے انہیں پارٹی میں بلند رتبہ دلوا دیا ہے تاہم وہ غیر جماعتی کاموں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ انہوں نے ایسے افراد کو اعزازات دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے جو عرب امریکیوں کے ووٹ درج کرواتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ فلسطینی فنون

اور فیشن کو محفوظ رکھنے کے منصوبوں پر بھی عمل کرتی ہیں۔

انہوں نے 45 سال کی عمر میں ایک نمایاں ریکارڈ قائم کیا۔ وہ پہلی ایسی مسلمان ہیں جسے ڈیموکریٹک کے 67ویں اسمبلی کا چیئرپرسن منتخب کیا گیا اور اورنج کاؤنٹی کی ڈیموکریٹک پارٹی کی وائس چیئرپرسن چنا گیا۔ 1998ء میں انہوں نے ریاستی اسمبلی کے لیے ڈیموکریٹک نامزدگی کا انتخاب لڑا اور ڈالے گئے ووٹوں کا اکتالیس فیصد حاصل کر کے دوسرے نمبر پر رہیں۔

2000ء میں جتنی تعداد میں امریکی مسلمانوں نے سیاسی میدان میں ذمہ داریاں قبول کیں وہ بہت حوصلہ افزا ہے کیونکہ چار سال پہلے تقریباً ایک بھی مسلمان سیاست میں موجود نہیں تھا۔ مسلمانوں کو بعض اوقات ''سویا ہوا جن'' کہا جاتا ہے کیونکہ تقریباً تمام مسلمانوں نے مالی اور دیگر اثاثوں کو بلا استعمال رکھا ہوا ہے۔ جنہیں سیاسی اثرورسوخ کے لیے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ جمود کا قانون نہ صرف طبعیات میں بلکہ سیاست میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔

بیشتر امریکی — صرف مسلمان ہی نہیں — سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ درحقیقت وہ تو ووٹ بھی کبھی کبھار ڈالتے ہیں۔ اہل ووٹروں کی تقریباً نصف تعداد صدارتی انتخابات میں بھی ووٹ ڈالنے کے لیے پولنگ سٹیشنوں میں نہیں آتی — بعض مقامی انتخابات میں ٹرن آؤٹ پانچ فیصد یا اس سے بھی کم ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر مٹھی بھر ووٹ ہی فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ ووٹ نہ ڈالنے والوں کو اپنے اوپر شرم آنی چاہیے۔ شہریت کی اس بنیادی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام ہو کر وہ ایک عظیم ورثے کی تحقیر اور ایک قیمتی حق کو ضائع کر دیتے ہیں۔

کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز کے قومی ڈائریکٹر نہاد عود مسلمانوں کی بے عملی کی وجوہات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مسلمان کہتے ہیں: ''کوشش کرنا فضول ہے۔'' نظام بدعنوان اور غیر اخلاقی ہے۔ ہمیں اس میں حصہ لے کر خود کو احمق نہیں بنانا چاہیے۔'' ہم ڈرتے ہیں کہ اگر سیاست میں حصہ لیا تو ایف بی آئی ہمیں تنگ کرنا شروع کر دے گی۔ اسی وجہ سے میں تو کسی پٹیشن تک پر دستخط نہیں کرتا۔''

واضح بات ہے کہ جو لوگ ایسے ملکوں سے آئے ہیں جہاں سیاسی سرگرمیاں ممنوع ہیں، وہ امریکہ میں انتخابی عمل میں حصہ لینے سے ہچکچاتے ہیں۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیے

جو لوگ اچھی حکمرانی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ تمام شہریوں کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کے لیے بھی خدمات انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

دیگر شہریوں کی طرح مسلمان بھی اکثر اپنی امکانی صلاحیتوں کے بارے میں کمتر اندازے لگاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ سیاست میں کامیابی کے لیے بڑا بینک اکاؤنٹ اور سیاسی اعتبار سے طاقتور دوست انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ تاریخی ریکارڈ اس کے برعکس شہادت دیتا ہے۔

دیگر انسانی مساعی کی طرح سیاست بھی پاکیزہ نہیں ہوتی۔ یہ تاریک، بدعنوان، پیسے کی لالچی، موقع پرست اور فضول ہوسکتی ہے اور بعض لوگ سیاسی عمل سے داغ دار ہو کر نکلتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ امریکی صدر کو بھی بعض اوقات بدنامی کا طوق پہننا پڑتا ہے۔

امریکی سیاست میں رشوت ستانی عام ہو چکی ہے۔ امیدوار اپنے پلے سے خرچ کرنے کی بجائے ڈھیروں رقومات عطیئے کے طور پر اکٹھی کرتے ہیں۔ واشنگٹن میں لابی گروپ بہت مؤثر ہو چکے ہیں۔ پیسہ کام دکھاتا ہے۔ قانون سازی میں شہریوں سے زیادہ یہ لابی کرنے والے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

تاہم سیاست کے ان تاریک گوشوں کی وجہ سے ان لوگوں کو اس میں حصہ لینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے جو ابھی تک سیاسی عمل سے الگ تھلگ ہیں۔ اس کے برعکس وہ سیاست میں اچھے لوگوں کو لانے کے لیے راہ ہموار کر سکتے ہیں۔ لابی کرنے والے اس لیے خصوصی مفادات کے حصول میں کامیاب رہتے ہیں کیونکہ شہری اپنی ذمہ واریوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ جو لوگ باعزت طریقے سے مصروف عمل ہیں اور اصولوں سے وابستہ ہیں انہیں اس بات کا ڈر نہیں ہونا چاہیے کہ سیاست میں شمولیت ان کی ساکھ کو نقصان پہنچائے گی یا ذاتی شرمندگی کا باعث بنے گی۔

نہاد عود مسلمانوں میں سیاسی عمل کے حوالے سے بہتری کے آثار پاتے ہیں: ''ہم ایک اہم تبدیلی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ بے شمار مسلمانوں کی رائے بدل رہی ہے۔ جو لوگ پہلے صرف مسجدوں کو چندے دیتے تھے اب وہ انتخابی امیدواروں کو بھی فیاضانہ عطیات دے رہے ہیں۔

''جو لوگ ماضی میں تشویش کا شکار تھے وہ اب از سر نو غور کر رہے ہیں۔ کل کے شک کرنے والے لوگ آج سیاست میں فعال ہیں اور اس تجربے سے لطف اٹھا رہے ہیں۔

وہ تسلیم کرتے ہیں کہ امریکی سیاسی نظام حقیقت میں کشادہ ہے اور انہیں اس حقیقت کا ادراک بھی کرنا ہوگا کہ اگر وہ خود بولنے اور بارسوخ ہونے کی کوشش نہیں کریں گے تو انہیں کسی دوسرے سے اپنے حق کے لیے بولنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔"

جون 2000ء میں ووٹ ڈالنے والے 755 مسلمانوں میں سے چھیانوے فیصد کا ایقان ہے کہ مسلمانوں کو مقامی اور قومی سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ 2ے

ریمانشا شیبی شہریوں کو ہدایت کرتی ہیں کہ جب وہ سیاسی عمل میں شامل ہوں تو اپنے مذہب کے بارے میں مدافعانہ انداز مت اپنائیں۔ اس کے برعکس وہ اسلام کے بارے میں حقیقت پسند ہوکر اور عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ اس کے مشترک رشتوں کا ادراک کر کے باہمی اعتماد اور دوستی پروان چڑھا سکتے ہیں۔

صدر کینیڈی نے مذہبی رواداری کو اہمیت دی اور یک رخے تصورات کا قلع قمع کرنے کے لیے امریکی آئین کے تحت ٹھوس اقدامات کیے۔

ایک اور ڈیموکریٹک صدر بل کلنٹن نے مسلمانوں کو سیاسی اقلیم میں عزت و وقار کے بلند درجوں تک پہنچا دیا ہے۔ اپنی دوسری ٹرم کے دوران انہوں نے واشنگٹن ڈی۔سی کے ایک بزنس مین ایم عثمان صدیقی کو فجی کا سفیر مقرر کیا۔ وہ امریکہ کا سفیر بننے والے پہلے مسلمان ہیں۔ اس کے علاوہ صدر بل کلنٹن نے ڈاکٹر اسلام اے۔ صدیقی کو محکمۂ زراعت کا ڈپٹی سیکرٹری (نائب وزیر) نامزد کیا۔ وہ وزیر کے بعد سب سے بڑا رتبہ حاصل کرنے والے پہلے مسلمان ہیں۔

حواشی

1ے انٹرویو 2000-12-17

2ے سی اے آئی آر کا سروے 2000-7-7

✿ ✿ ✿ ✿

بارہواں باب

مسلمانوں کے ووٹ اور
جارج بش کی انتخابی فتح

مسلمانوں نے 2000ء کے صدارتی انتخاب میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔
مسلمانوں کے ساتھ طویل عرصے سے دوستیوں اور اتفاق کی بدولت میں اہم اقدامات کا عینی
شاہد بنا۔
میں جن چھ رہنماؤں سے برسوں پہلے ملا تھا انہوں نے کامیابی کا نقشہ تیار کیا۔
جب میں 1985ء میں آغا سعید سے ملا تو وہ پہلے ہی مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم
''امریکن مسلم الائنس'' (AMA) بنانے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے اور بعدازاں انہوں نے
اس کی بنیاد رکھی۔
اس برس میں سلام المریعتی سے ملا۔ وہ بعد میں مسلم پبلک افیئرز کونسل (ایم پی
اے سی) کے ڈائریکٹر بنے۔
آج سے نو سال پہلے واشنگٹن ڈی۔سی میں نہاد عود اور ابراہیم ہوپر میری زندگی میں
شامل ہوئے' انہوں نے اس وقت چند ماہ پہلے ہی کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز (سی اے
آئی آر) قائم کی تھی۔ میں سی اے آئی آر کے قومی بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین عمر احمد
سے جولائی 1997ء میں پہلی بار تب ملا جب میں نے سینٹ لوئیس میں آغا سعید کی منعقد کردہ
ایک کانفرنس میں شریک ہوا تھا۔ 2000ء میں میری شناسائی امریکن مسلم کونسل (اے ایم سی)
کے صدر یحییٰ ایم۔ باشا سے ہوئی تاہم میں 1990ء سے اے ایم سی کی سیاسی سرگرمیوں سے
آگاہ تھا' جن کے محرک اس کے پہلے ایگزیکٹو ڈائریکٹر عبدالرحمٰن العمودی تھے۔

یہ افراد ایک قابل رشک ٹیم کو تشکیل دیتے ہیں۔ عوڈ المریعتی' ابوزاکوک' ہوپر اور العمودی تو مقصد کے لیے کل وقتی طور پر وقف ہیں۔ باقی افراد کئی گھنٹے صرف کرتے ہیں' تاہم وہ مختلف پیشوں میں اپنی روزی کماتے ہیں' آغا سعید تعلیم میں' باشا اور ایم پی اے سی کے مہر حسنوط طب میں اور عمر احمد ٹیکنالوجی میں۔

جب میں سعید' العمودی' عود اور ہوپر کے بارے میں سوچتا ہوں تو لفظ تحرک ذہن میں آتا ہے۔ وہ ہمیشہ حرکت میں دکھائی دیتے ہیں' کبھی آرام نہیں کرتے۔ سعید سے ان کے برکلے والے طالب علمانہ اپارٹمنٹ میں ہونے والی پہلی ملاقات سے لے کر اب تک میں نے انہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مقصد یعنی مسلمانوں کے سیاسی عمل سے جدا نہیں پایا۔ میں نے یہی شدت عود میں پائی۔ انہوں نے اپنے شاذ' پرسکون' یادآور لمحات میں مجھ سے کہا تھا: ''میں اپنی زندگی اس مقصد کے لیے وقف کرنے کا تہیہ کر چکا ہوں۔'' ہوپر ایک سنجیدہ اور ماہر لکھاری ہیں جو ہمہ وقت ابلاغ کے کام میں محو رہتے ہیں۔ اے ایم سی باشا کی سربراہی میں طویل مدت سے سیاسی میدان میں کام کر رہی ہے اور انتظامیہ اور کانگرس میں مسلمانوں کی موجودگی کا احساس دلا چکی ہے۔

2000ء کی مہم کے دوران انہوں نے اپنے جوہروں کا خوب مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اپنی تنظیموں کے کارکنان کی حمایت اور تعاون سے ایک یونین تشکیل دی اور ایک سیاسی پاور ہاؤس بن گئے۔ وہ ہماری حالیہ سیاسی تاریخ کے چند انتہائی اہم ابواب تحریر کرنے والوں میں شامل ہیں۔

جس وقت صدارتی انتخابی مہم کا آغاز ہوا تو امریکی مسلمان سیاسی قیادت کے لیے تیار تھے۔ ملک میں شہری حقوق کے حوالے سے درپیش چیلنجوں اور مشرق وسطیٰ میں مسلمانوں کے مفادات کو لاحق خطرات سے پریشان ہو کر مسلمان جماعتی میدان میں سنجیدگی سے آ گئے۔ ارض مقدس—— خصوصاً یروشلم—— کے مستقبل کے حوالے سے گہری تشویش نے زبردست کردار ادا کیا۔ پہلے تو ان کا جھکاؤ نائب صدر ال گور کی طرف تھا مگر پھر وہ بھرپور طریقے سے گورنر جارج ڈبلیو بش کی طرف مائل ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے گور کو اسرائیل سے گہرے روابط' خصوصاً اسرائیل کے خصوصی دارالحکومت کے طور پر غیر منقسم یروشلم کی قبولیت اور امریکی سفارت خانے کو تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کے لیے ان کی واضح تائید کی وجہ سے رد کر دیا۔

مسلمان گور کی بہت سے ملکی پالیسیوں کے معترف تو تھے مگر ان کی دوسری زیادہ اعلیٰ ترجیحات بھی تھیں انہوں نے بش سے مشرق وسطیٰ میں عربوں اور اسرائیلیوں کے ساتھ منصفانہ پالیسیوں کی امید وابستہ کر لی۔

وہ کلنٹن گور انتظامیہ اور ان کے ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پیش روؤں سے ناراض تھے کہ انہوں نے یروشلم پر اسرائیلی دعوے کی مخالفت کیوں نہیں کی۔ مسلمانوں کے لیے امریکی سفارت خانے کو منتقل کرنے کا اقدام مقدس شہر پر اسرائیلی دعوے کی واشنگٹن کی طرف سے سرکاری قبولیت کے مترادف تھا۔ اسرائیل کا مذکورہ دعویٰ اقدام متحدہ کی عائد کردہ پابندی کی خلاف ورزی تھا کہ علاقے پر بزور قبضہ نہ کیا جائے۔ اس سے دوسری بدمعاش ریاستوں کے لیے اپنے کمزور ہمسایوں کے علاقوں پر قبضہ جمانے کی نظیر قائم ہو جاتی۔ 1

گور نے اسرائیل سے اپنی وابستگی اس وقت عیاں کر دی جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر امن کے عمل سے باہر فلسطینیوں نے آزاد ریاست کا اعلان کر دیا تو صدر کی حیثیت سے وہ کیا کریں گے۔ گور نے جواب دیا تھا: ''میں اسرائیلی حکومت سے مشورہ کروں گا کہ اسرائیل کے نقطۂ نگاہ سے اس کا کیا بہتر جواب دیا جا سکتا ہے۔'' 2

1991ء میں کویت کو عراق کے قبضے سے چھڑانے کے لیے عرب ریاستوں نے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر ہوائی حملے شروع کیے۔

عراقی فوجوں کو کویت سے نکال دینے کے بعد بھی امریکہ اور برطانیہ نے ہوائی حملے جاری رکھے اور جواز یہ پیش کیا کہ ان کا مقصد عراقی فضائیہ کے آپریشنز کی پیش بندی اور پابندیوں کا نفاذ ہے۔ ان حملوں کو امریکی کانگرس یا اقوام متحدہ کی منظوری حاصل نہیں تھی اور میری رائے میں واضح طور پر جنگی طاقتوں کی قرارداد کی شقوں کی خلاف ورزی تھی۔ میں اس قرارداد کا شریک مصنف تھا۔ قانونی جواز تو ایک طرف رہا' وہ حملے الٹ نتائج پیدا کرنے والے تھے۔ انہوں نے معصوم عراقی شہریوں کو ہلاک و زخمی اور ان کی املاک کو تو تباہ و برباد کر دیا لیکن عراق کے آمر صدام حسین کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔ درحقیقت ان حملوں نے تو اسے اپنی سیاسی قوت کو استحکام دینے اور غیر استحقاقی ہمدردیاں سمیٹنے میں مدد دی۔

انسٹی ٹیوٹ فار پبلک اکیوریسی کے کمیونیکیشنز ڈائریکٹر سام حسینی واضح کرتے ہیں کہ فلسطینی کیوں مضطرب ہیں: ''جہاں اسرائیلی حکومت پچھلے چھ سال سے امن مذاکرات کر رہی ہے وہاں فلسطینی دیکھ چکے ہیں کہ غزہ اور مغربی کنارے میں پچاس ہزار مزید یہودی

غیر قانونی آبادکاروں کو داخل کر دیا گیا' اسرائیل نے ایک ہزار فلسطینیوں کے گھر تباہ کر دیئے' فلسطینیوں میں بے روزگاری تین گنا ہوگئی' اسرائیلیوں نے تیرہ ہزار فلسطینیوں کو قید کر لیا اور انہوں نے فلسطینیوں کی نقل و حرکت کی آزادی کو غربی کنارے تک محدود کر دیا۔" 3

فروری 2000ء میں اے ایم سی نے ایک ہزار امریکی مسلمانوں کا قومی سروے کرایا جس کا عنوان تھا "یروشلم کی حیثیت"۔ اسے دس انتہائی اہم مسائل پر دوسرا نمبر دیا گیا۔ 4 755 امریکی مسلمانوں کے ایک قومی سروے میں جولائی 2000ء میں جواب دہندگان نے کسی بھی سیاسی مسئلے سے زیادہ یروشلم کی حیثیت کے حوالے سے بات کی۔ 5

مسلمان مسجد الاقصیٰ اور گنبد صخریٰ کو اسرائیل کے قبضے سے آزاد دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

اکتوبر 2000ء میں ایک ممتاز اسرائیلی روزنامے حارتز (Haaretz) نے فلسطینیوں کی دگرگوں صورتحال پر اداریہ لکھا اور اسرائیلی حکومت کے اقدامات پر تنقید کی۔ اخبار نے فلسطینیوں کے حوالے سے حکومتی پالیسیوں کے اخلاص کے حوالے سے سوال کیا۔

صدارتی انتخاب سے ایک مہینے پہلے امریکی مسلمان اس وقت مضطرب ہو گئے جب متوقع اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون نے بیت المقدس کا دورہ کیا' جس کی خوب تشہیر کی گئی۔ ایریل شیرون وہ شخص ہے جس نے 1982ء میں صابرہ اور شتیلہ کے فلسطینی مہاجر کیمپوں پر حملہ کر کے ہزاروں فلسطینیوں کو قتل کر دیا تھا۔ شیرون کے مقدس اسلامی مقام کے دورے کو اشتعال انگیزی تصور کیا گیا۔ شیرون کے دورے کے بعد مظاہرے شروع ہو گئے۔

تشدد امریکہ میں عرب دشمن اور اسلام دشمن تبصروں کا محرک بنا۔ تمام اخبارات یک آواز ہو کر فلسطینیوں کو الزام دینے لگے۔

چارلی ریس نے' جو فلسطینیوں سے اسرائیل کی بدسلوکی پر امریکی اغماض کے حوالے سے صاف صاف لکھنے والے کالم نگار ہیں' واشنگٹن پر کڑی تنقید کی۔ 8

وائٹ ہاؤس کے سامنے لیفائٹ پارک میں یروشلم کے لیے ایک عوامی جلسہ کیا گیا جس میں ہزاروں مسلمانوں نے بہت سے مقررین کی شعلہ فشاں تقریروں کو غور سے سنا۔ سترہ قومی مسلم اور عرب امریکی گروپوں نے اس جلسے کا اہتمام کیا تھا۔

اس جلسے میں بروکلین کے ربیوں کا ایک وفد بھی شریک ہوا۔ وہ سبت کا دن (ہفتہ) ہونے کی وجہ سے سٹیج پر خاموش کھڑے رہے جبکہ سیف عبدالرحمٰن نے ان کا بیان پڑھ کر

سنایا۔ انہوں نے اسرائیل کی شدید مذمت اور فلسطینیوں سے بھائی چارے اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

اپنی باری پر میں نے چند بلاک دور وائٹ ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اجتماع سے کہا کہ کیا وہ اگلے چار برس کے لیے کسی ایسے شخص کو منتخب کر کے اس عمارت میں بھیجیں گے جو اسرائیل کا حامی ہو اور ملک کا صدر اور افواج کا کمانڈر انچیف بھی ہو۔

صدارتی مہم کے دوران مسلمانوں نے سیاسی پارٹیوں یا شخصیات کی بجائے زیادہ تر مسائل پر توجہ دی۔

گرین پارٹی کی طرف سے صدارتی امیدوار رالف نادر نے فلسطینیوں کی حمایت کرتے ہوئے اپنی پارٹی کی طرف سے اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کے لیے امریکی امداد بند کر دیں گے۔ انہیں بھرپور عوامی توجہ حاصل ہوئی' تاہم ان کے ہزاروں مداحوں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ نادر 2000ء میں صدارت کا انتخاب نہیں جیت سکیں گے اپنے ووٹ دوسرے امیدواروں کو دے دیئے۔

2000ء کے اوائل میں کیے جانے والے سروے کے نتائج نے ظاہر کیا کہ ری پبلکن کی نسبت پارٹی مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہے۔ 1999ء کے اواخر میں اے ایم سی کے کروائے ہوئے سروے سے پتا چلا کہ 844 جواب دہندگان میں سے دو تہائی کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہیں۔ باقی لوگ ری پبلکن امیدواروں کے حق میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ منقسم تھے۔ زوگبی انٹرنیشنل کے ایک اور سروے سے پتا چلا کہ مشی گن کے مسلمانوں میں سے 46 فیصد پارٹی کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں' 26 فیصد آزاد اور صرف 18 فیصد ری پبلکن پارٹی کے حامی ہیں۔ 9 جون 2000ء میں مسلمانوں کے ایک قومی سروے میں جواب دہندگان کے ایک قومی سروے میں جواب دہندگان میں سے 31 فیصد نے کہا کہ ڈیموکریٹک پارٹی ان کے مفادات کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ صرف 17 فیصد نے ری پبلکن پارٹی کی حمایت کی۔ 43 فیصد نے کہا کہ ابھی انہوں نے فیصلہ نہیں کیا یا یہ کہ انہیں یقین ہے کہ کوئی بڑی پارٹی ان کے بنیادی اسلامی مفادات پر توجہ نہیں دیتی ہے۔ اخلاقی معاملات مثلاً اسقاط حمل اور ہم جنس پرستانہ شادیوں پر 64 فیصد نے ری پبلکن موقف کی تائید کی۔ پارٹی کو معاشرتی معاملات پر 56 فیصد اور معاشی معاملات پر 41 فیصد حمایت حاصل ہوئی۔ سروے سینتیس ریاستوں کے مسلمانوں کا کیا گیا تھا۔ ان میں 56 فیصد گریجویٹ ڈگری کے حامل تھے

اور 25 فیصد نے ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ آمدنی ظاہر کی۔

سی اے آئی آر کے ریسرچ ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد نمر نے کہا: ''یہ سروے ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان آزاد ووٹر ہیں اور یہ کہ وہ ان امیدواروں کی حمایت کریں گے جو ان کے مسائل پر توجہ دیتے ہیں۔'' 10 واحد اختلاف رائے ڈیئر بورن' مشی گن میں سنا گیا۔ پچیس سالہ دانی عجمی نے یونیورسٹی آف مشی گن میں جب اپنے استاد امام حسن قزوینی کو ووٹ دینے کی تلقین کرتے سنا تو یہ اعلان کرتے ہوئے احتجاج کیا: ''خدا ہر مسلمان کو کسی غیر اسلامی ریاست کے انتخابات میں حصہ لینے سے منع کرتا ہے۔'' قزوینی نے جواب دیا: ''ہمیں چاہیے کہ ہم نے جس معاشرے میں زندگی بسر کرنے کا انتخاب کیا ہے اس معاشرے میں اپنے حقوق حاصل کریں۔ اگر میں خود کو الگ تھلگ رکھوں گا تو کسی دوسرے پر کوئی اثر نہیں ڈالوں گا۔'' کلاس کے بعد عجمی نے ایک بروشر تقسیم کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ووٹ دینا ''اسلام سے بغاوت'' ہے۔ 11 آغا سعید کو یقین ہے کہ جو مسلمان عجمی کے نظریات کو مانتے ہیں وہ بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ مسجدوں کے رہنماؤں کے ایک سروے نے ظاہر کیا کہ ان میں 89 فیصد عوامی سطح پر مسلمانوں کو ووٹ دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ 12

''دی واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز'' کے ایگزیکٹو ایڈیٹر رچرڈ ٹی۔ کرٹس نے بہت سے مختلف اخباروں میں دوبارہ شائع ہونے والے اپنے ادارے میں مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کسی ایک صدارتی امیدوار کو اکٹھا ووٹ دیں: ''اگر مسلمانوں نے اس سال کانٹے دار انتخاب میں نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا' اپنی کمیونٹیوں کو ووٹ دینے پر آمادہ کر لیا' پھر اجتماعی ووٹ دیا اور اپنے ووٹ کی تشہیر بھی کی تو پھر امریکہ دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ اس کی مشرق وسطیٰ کے لیے پالیسی اسرائیل کی تخلیق کے بعد پہلی بار منصفانہ ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے جنوبی ایشیا کے لیے امریکی پالیسی اسرائیل ہندوستان اتحاد کے موجودہ اثرات سے آزاد ہو جائے۔''

انہوں نے یاد دلایا کہ 1996ء میں مسلمان صدارتی امیدوار کے لیے اجتماعی ووٹ دینے میں ناکام رہے تھے۔ اسی سال سینیٹر لیری پریسلر نے ایک مسلمان ملک پاکستان کے لیے امریکی امداد بند کرنے کا قانون منظور کروایا تو مسلمان بہت بے چین ہوئے۔ اگرچہ مضطرب مسلمانوں نے ڈیموکریٹ ٹم جانسن کو ووٹ نہیں دیئے تاہم انہوں نے ان کی مہم کے لیے عطیات فراہم کیے جو پریسلر کو شکست دینے میں بے حد اہم ثابت ہوئے۔

کرٹس نے لکھا کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے کہ وہ امریکی آبادی میں صرف تین فیصد ہیں۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ اسرائیل حامی لابی امریکی آبادی میں صرف دو فیصد ہی ہے اور اسے عمومی طور پر امریکہ کی دوسری سب سے زیادہ طاقتور لابی قرار دیا جاتا ہے' اسلحہ' تمباکو' اساتذہ اور کسی بھی دوسری لابی سے زیادہ طاقتور۔ صرف امریکن ایسوسی ایشن آف ریٹائرڈ پرسنز' جو آبادی میں 25 فیصد ہونے کی دعویدار ہے' اسرائیل کی لابی سے زیادہ طاقتور قرار دی جاتی ہے۔ [13]

کرٹس یہ مضمون لکھنے کے بعد بیمار ہو گئے جس کی وجہ سے انہیں عارضی طور پر عملی زندگی سے الگ ہونا پڑا۔ 30 ستمبر کو لاس اینجلس میں اے ایم اے کے قومی کنونشن میں ان کی بیٹی ڈیلنڈ یونیلے نے زبردست داد و ستائش کے درمیان اجتماعی ووٹ کے لیے اپنے والد کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان کے پیغام پر گہری توجہ دی اور انتخاب کے دن سے پہلے باقی ماندہ ہفتوں میں جہاں جہاں بھی میں نے خطاب کیا ان کی باتوں کا حوالہ دیا' بشمول سی اے آئی آر کے واشنگٹن ڈی۔سی میں 7/ اکتوبر کو منعقد ہونے والے قومی کنونشن کے۔

بش کو مسلمانوں کا اجتماعی ووٹ پڑنے کی سب سے اہم وجہ مسلمانوں کی چار بڑی پبلک پالیسی تنظیموں کے رہنماؤں کا اتحاد اور ثابت قدمی تھی۔ وہ چار تنظیمیں یہ ہیں: دی امریکن مسلم الائنس اے ایم اے!' دی کونسل آن امریکن اسلامک ریلیشنز (سی اے آئی آر)' دی امریکن مسلم کونسل (اے ایم سی) اور دی مسلم پبلک افیئرز کونسل (ایم پی اے سی)۔

اے ایم سی کے بانی رہنما عبدالرحمٰن العمودی نے تو مسلمانوں کو جنوری 1998ء میں ہی اتحاد کا پیغام دیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا: ''وقت آ چکا ہے کہ امریکی اسلامی تنظیموں کی ایک رابطہ کونسل قائم کی جائے۔'' اپنے مضمون میں انہوں نے اپنے اس تصور کی وضاحت کی جسے وہ اے ایم اے کے 1997ء کے کنونشن میں پیش کر چکے تھے۔ [14]

مئی 1998ء میں' صدارتی مہم سے دو سال پہلے چار گروپوں کے نمائندوں نے ''امریکن مسلم پولیٹیکل کوآرڈینیشن کونسل'' (اے ایم پی سی سی) قائم کی۔ اے ایم اے کے بانی اور چیئرمین ڈاکٹر آغا سعید کو اس کا پہلا کوآرڈینیٹر مقرر کیا گیا۔

بعدازاں 1998ء ہی میں اے ایم سی کے ابوزرا کوک نے مسلمانوں کی قومی تنظیموں کو تاکید کی کہ وہ حکومتی عہدوں کے امیدواروں کو اپنے اجلاسوں میں مدعو کریں۔ اس

کے علاوہ انہوں نے ووٹر رجسٹریشن کٹ کو قومی سطح پر بانٹنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ اس مہم کو واشنگٹن پوسٹ' نیشنل پبلک ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ پر کوریج ملی۔

فروری 1999ء میں' ایک مشترکہ ایجنڈے پر کام کرنے کے لیے متفق ہو کر گروپ نے کونسل آف پریذیڈینٹس آف عرب امریکن آرگنائزیشنز کے ساتھ اجلاس کیا۔ اس اجلاس میں اے ایم پی سی سی کے چار مسلمان گروپوں کے نمائندوں کے علاوہ امریکی عرب امتیاز مخالف کمیٹی (اے ڈی سی)' عرب امریکن انسٹی ٹیوٹ (اے اے آئی)' دی نیشنل ایسوسی ایشن آف عرب امریکنز (این اے اے اے) اور دی ایسوسی ایشن آف عرب یونیورسٹی گریجویٹس (اے اے یو جی) کے رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں درج ذیل چار مسائل پر اتفاق رائے کیا گیا: یروشلم' خفیہ شہادت کا قانون' شناخت کے لیے چھان بین اور ستمبر 1999ء کو "ووٹر رجسٹریشن اور تعلیم کے مہینے" کے طور پر منانا۔ یہ رجسٹریشن' شہری تعلیم اور لیڈر شپ ٹریننگ جیسے طویل المیعاد تعاون کا بھی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ 15

مسلمانوں نے 1999ء کے اوائل ہی میں انتخابی مہم کے حوالے سے سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ پرائمری الیکشن سے ہفتوں پہلے اے ایم اے کے اکتیس ریاستوں اور ترانوے شاخوں پر مشتمل نیٹ ورک نے سکولوں اور مسجدوں میں مسلمانوں کے جلسے منعقد کروائے اور انہیں انتخابی عمل' سیاسی جماعتوں کے کردار اور ووٹ کی پرچی (Ballot) کے مشمولات سے آگاہ کروانا شروع کر دیا۔ اس نے تمام بڑی ریاستوں میں پرائمری ووٹنگ کے لیے تجاویز ارسال کیں۔ کیلیفورنیا میں انتخاب کے بعد کیے گئے ایک تجزیے نے ظاہر کیا کہ امیدواروں اور ووٹ کی ترجیحات کے حوالے سے اے ایم اے کی 82 فیصد تجاویز کامیاب رہی ہیں۔ اپریل میں اے ایم اے کے رہنماؤں نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ صدارتی نامزدگی کے کنونشنوں کے دوران رضا کارانہ امداد مہیا کریں۔

جولائی 1999ء میں اے ایم سی کے صدر باشا نے ڈیٹرائٹ میں ایک اجلاس کا اہتمام کیا' جس میں مسلمانوں کی سات قومی تنظیموں کے نمائندوں نے مشی گن کے گورنر جان اینگلر سے ملاقات کی' جو کہ جارج ڈبلیو بش کی صدارتی مہم کے ایک صف اول کے رہنما تھے۔ انہوں نے اینگلر کو مسلمانوں کے مسائل بارے آگاہ کیا۔ یہ امریکی مسلمانوں کی تنظیموں اور بش کی صدارتی مہم کے کسی اہم منتظم کے مابین پہلا رابطہ تھا۔ 16

2000ء میں موسم بہار کے اواخر اور موسم گرما کے دوران مسلمانوں کی چاروں

پالیسی تنظیموں نے بڑے شہروں میں امیدواروں، مہم کے رضا کاروں اور متوقع ووٹروں کے لیے ورکشاپوں کا اہتمام کیا۔

اے ایم سی نے 22 تا 25 جون کو واشنگٹن ڈی۔سی میں منعقد ہونے والے اپنے قومی کنونشن میں مندوبین کو مہم کے ایشوز، مہم کی کارروائیوں اور ووٹروں کی رجسٹریشن کے حوالے سے ہدایات دیں۔ تنظیم نے مہم کے رضا کاروں میں ہدایت نامے بانٹے اور بعدازاں مسلمان ووٹروں کے لیے ایک مرکز قائم کیا، انفرادی امیدواروں کی حاصل کردہ پوزیشنوں کو شائع کیا اور ان دستاویزات کو اے ایم سی کی ویب سائٹ میں جگہ دی۔

15 ستمبر کو ووٹروں کے اندراج کی سرگرمیاں عروج کو پہنچ گئیں۔ ایم پی اے سی کے چند ماہ قبل وفات پا جانے والے ڈائریکٹر ہشام رضا کی خدمات کے اعتراف میں اس دن کو "ووٹروں کے اندراج کا یوم ہشام رضا" قرار دیا گیا تھا۔ ہشام رضا کو اے ایم سی کی ملک میں پہلی شاخ کا چیئرمین ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ پورے ملک کی مسجدوں، اسلامی مراکز اور سکولوں میں اندراج کا انتظام کیا گیا۔[17]

مسلمانوں کے ملک گیر اتحاد کی طرف سب سے زیادہ ڈرامائی قدم شکاگو کے اوہیئر ایئر پورٹ کے نزدیک منعقد کیے گئے اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (آئی ایس این اے) کے سالانہ یوم مزدور کنونشن میں اٹھایا گیا۔ آغا سعید نے دس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کے اجتماع سے اپنے خطاب کے آخر میں اعلان کیا کہ اے ایم پی سی سی نے مہم کے دوسرے ایشوز کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور صدارتی انتخاب میں مسلمانوں کو اجتماعی ووٹ ڈالنے کی تجویز دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کونسل اہم امیدواروں سے انٹرویو کرنے کے بعد ووٹنگ سے دو ہفتے پہلے صدارت کے لیے اپنی تجویز کا اعلان کرے گی۔

اس کے بعد آغا سعید نے سی اے آئی آر کے عمر احمد اور نہاد عود اور اے ایم سی کے باشا اور علی آر۔ ابوزا کوک کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ سعید نے یہ یاد دلاتے ہوئے کہ ایم پی اے سی پہلے ہی ان کی مدد کا وعدہ کر چکی ہے، یہ کہہ کر حاضرین میں بے پناہ جوش و خروش پیدا کر دیا کہ "ہم لڑ نہیں رہے ہیں ہم ایک ہیں۔ اور انتخاب سے دو ہفتے پہلے ہم ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ جائیں گے اور صدارتی امیدوار کے لیے ایک تجویز کا اجراء کریں گے۔"

حاضرین کی طرف سے بھرپور تائیدی نعروں کے درمیان مسلمانوں لیڈروں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر اوپر اٹھاتے ہوئے اعلان کیا "ہم فرق قائم کریں گے!"[18]

اے ایم پی سی کے اہل کاروں نے 23 اکتوبر کو واشنگٹن ڈی۔سی میں منعقدہ ایک نیوز کانفرنس کے دوران صدارت کے لیے ری پبلکن جارج ڈبلیو۔بش کی حمایت کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ یہ اعلان گروپ نے ڈیٹرائٹ میں گورنر بش کا ثمر آور انٹرویو کرنے کے بعد کیا۔ اس نیوز کانفرنس میں آغا سعید نے واضح کیا: ''گورنر بش نے مسلمان برادری کے مقامی اور قومی نمائندوں سے ملاقات میں پہل کی ہے۔ انہوں نے داخلی اور خارجہ پالیسی کے ایشوز کے حوالے سے مسلمانوں کے تفکرات پر غور کرنے کا بھی وعدہ کیا ہے۔'' باشا نے بش کو خراج تحسین پیش کیا کہ انہوں نے ''خفیہ شہادت اور ائیر پورٹ پر شناخت کروانے'' جیسے قوانین کے خلاف بات کی ہے۔[19] سی اے آئی آر کے کمیونیکیشنز ڈائریکٹر ابراہیم ہوپر نے' جو اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ گور نے اے ایم پی سی کے رہنماؤں سے مقررہ ملاقات ملتوی کر دی تھی' کہا: ''اہم وجہ گورنر کے مسلمان رہنماؤں سے روابط ہیں۔''

اس نیوز کانفرنس کے دیگر مقررین میں سی اے آئی آر کے عمر احمد اور نہاد عوض' اے ایم سی کے ابوزا کوک' ایم پی اے سی کے سلام المریعتی اور اے ایم اے کے ایرک وکرز شامل تھے۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (آئی ایس این اے) اور اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کے نمائندوں نے بھی اس نیوز کانفرنس میں مشاہدین کے طور پر شرکت کی۔[20]

یہ حمایت بش کی پالیسیوں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کا بڑا سبب گور کے رویے کا ردعمل تھا کہ وہ مسلمانوں سے رابطہ نہیں کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے اس فیصلے کو قومی ذرائع ابلاغ نے وسیع کوریج دی اور اسے انتخاب سے پہلے ای میل' مسجدوں اور اسلامی مراکز میں نوٹسوں اور جمعہ کی نماز میں امام کے وعظوں کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچایا گیا۔ اس فیصلے کی حمایت کرتے ہوئے دو اہم رہنماؤں اے ایم اے کے آغا سعید اور ایم پی اے سی کے المریعتی نے ڈیموکریٹک پارٹی سے اپنی مشہور وابستگی کو ترک کر دیا۔

اس اعلان کے تین دن بعد بش نے باشا کو بھیجے ہوئے اپنے ویڈیو پیغام میں ایئرپورٹوں پر ہراساں کرنے کے اقدامات کی سخت مذمت کی۔[21]

ابھی مسلمانوں کی طرف سے بش کے لیے حمایت کا اعلان ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ صدر کلنٹن کی ڈیموکریٹک بیوی ہلیری روڈھم کلنٹن نے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔ انہوں نے تین ماہ پہلے اپنی مہم کے لیے جمع کروائے گئے ایک ہزار ڈالر اے ایم سی کے عبدالرحمٰن العمودی کو اور پچاس ہزار ڈالر امریکن مسلم الائنس (اے ایم اے) کے اراکین کو واپس

کر دیئے۔ ہلیری کلنٹن نے اے ایم پی سی کی طرف سے بش کی حمایت کے اعلان کے تین دن بعد 26 اکتوبر کو رقوم کی واپسی کا اعلان کیا۔

واضح طور پر نیویارک کی بڑی یہودی اور اسرائیل حامی آبادی کے ردعمل کے خوف سے ہلیری کلنٹن نے اعلان کیا: ''میں اس گروپ (اے ایم اے) کے مؤقف کی بھرپور مخالفت کرتی ہوں۔ پچاس ہزار ڈالر کی ایک ایک پینی واپس کی جارہی ہے۔'' انہوں نے عطیہ دینے والے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ ''جارحانہ اور اشتعال انگیز'' بیانات دے رہے ہیں اور کہا کہ اتحاد کے صدر آغا سعید فلسطینیوں کی اسرائیلیوں کے خلاف ''مسلح مزاحمت'' کی حمایت کرتے ہیں۔ یہودی تنظیموں نے رقم واپس کرنے کے ان کے اس فیصلے سے خوش ہو کر فوری طور پر بھرپور چندہ فراہم کیا تاہم آغا سعید نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''میں فلسطین کا حامی ضرور ہوں تاہم میں اسرائیلیوں کے ساتھ معقول معاہدے کا بھی حامی ہوں۔ میں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ میں امن کے عمل کی حمایت کرتا ہوں اور یہ کہ مشرق وسطیٰ کا تنازعہ مذہبی نہیں سیاسی ہے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے کسی بات کا ذکر نہیں کیا گیا۔''

اگرچہ اہم ذرائع ابلاغ نے اس کا اعتراف نہیں کیا تاہم جارج ڈبلیو بش کے لیے وائٹ ہاؤس کا راستہ ہموار کرنے میں فلوریڈا کے مسلمانوں کا اہم کردار ہے۔ سرکاری گنتی میں ان کا ریاست گیر ووٹوں کا فرق اتنا معمولی ہے کہ بہت سی طاقتوں اور عوامل کو فیصلہ کن نہیں تو اہم قرار دیا جا سکتا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق مسلمانوں کا اجتماعی ووٹ ان سب سے زیادہ اہم عامل تھا۔ العریان نے تبصرہ کیا: ''سیاسی پنڈت فلوریڈا میں مسلمانوں کے اہم بلکہ فیصلہ کن کردار کا اعتراف کرنے میں تامل برت رہے ہیں۔'' [22] صدارتی مہم کے دوران نائب صدر گور نے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جبکہ بش نے ہر موقع پر مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کا وعدہ کیا۔

تاریخ کے سب سے زیادہ کانٹے دار صدارتی مقابلے میں فلوریڈا کے پچیس الیکٹورل ووٹوں نے آخرکار نتیجے کا تعین کیا' اس ریاست میں مسلمان ایک نیا اہم سیاسی عنصر ثابت ہوئے ہیں۔ آخری گنتی میں ٹیکساس کے گورنر۔۔۔ جارج ڈبلیو بش ۔۔۔ نے فلوریڈا میں نیز صدارت کے حصول میں ایک ہزار سے بھی کم ووٹوں سے کامیابی حاصل کی۔ بش نے اتنے قلیل فرق پر مسلمانوں کو ووٹ دینے پر خصوصاً شکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں نے انہیں جیت کے فرق سے ساٹھ گنا زیادہ یعنی ساٹھ ہزار ووٹ دیئے۔

اگر فلوریڈا کے مسلمان بش کو ووٹ نہ دیتے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ اگر مسلمانوں کے معمول کے ڈیموکریٹ امیدواروں کی حمایت کے رجحان کو دیکھا جائے تو میری رائے میں گور کو تقریباً بش جتنے ووٹ ہی حاصل ہوتے۔ اس طرح وہ واضح طور پر جیت سکتے تھے۔

مسلمانوں کا اجتماعی ووٹ ڈالنا کوئی اتفاق نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے کئی تنظیموں اور افراد کی سال ہا سال کی محنت کارفرما ہے۔ جبکہ وہ افراد الگ ہیں جنھوں نے بغیر سامنے آئے شبانہ روز کام کر کے مسلمانوں کو کسی ایک موزوں امیدوار کو اکٹھا ووٹ ڈالنے کے لیے تیار کیا۔

7 نومبر 2000ء کو مسلمانوں کے اجتماعی ووٹ امریکہ کے سیاسی منظرنامے میں اہم تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ جب سیاسی رہنما انتخاب کے دن کے نتائج کا تجزیہ کریں گے تو انہیں امریکہ کی مسلمان برادری کے بارے میں نئی آگاہی حاصل ہوگی اور مستقبل میں وہ لوگ صرف صدارت نہیں بلکہ بیشتر عہدوں کے لیے اپنی مہمات کی تدابیر میں ٹھوس تبدیلیاں لائیں گے۔ مستقبل کی اہم سیاسی مہمات میں مسلمانوں اور ان کے پیسے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکے گا۔ حالیہ ماضی کے برعکس بیشتر پارٹی رہنما "مسلمانوں کے ووٹ" حاصل کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کریں گے۔ کسی بھی اہم عہدے کا ہر سنجیدہ امیدوار مسلمان رہنماؤں کو انٹرویو دینا رد کرنے کی بجائے اس کا متمنی ہوگا۔ جب البرٹ گور صدارتی مہم کے دوران اپنی کوتاہیوں کی فہرست بنائیں گے تو ہوسکتا ہے اے ایم پی سی سی کے رہنماؤں سے ملاقات ملتوی کر کے دوبارہ ملاقات کرنے میں ناکامی سرفہرست ہو۔

حواشی

1. آغا سعید سے انٹرویو 10-12-2000
2. ''واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز'' جون 2000ء صفحہ 22-24
3. ''یو ایس اے ٹوڈے'' 10-10-2000
4. اے ایم سی ریلیز' 29-2-2000
5. سی اے آئی آر ریلیز' 6-7-2000
6. ہارٹز' 18-10-2000
7. ایم پی اے سی بلیٹن' 7-11-2000 اور سی اے آئی آر بلیٹن 18-10-2000
8. ''اورلینڈو سینٹینل'' 19-10-2000
9. ''کرسچن سائنس مانیٹر'' 2-11-2000
10. سی اے آئی آر ریلیز' 6-7-2000
11. ''کرسچن سائنس مانیٹر'' 2-11-2000
12. آغا سعید کا انٹرویو 2-12-2000
13. ''واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز'' جون 2000' صفحات 22-24
14. واشنگٹن رپورٹ آن مڈل ایسٹ افیئرز' جنوری' فروری' صفحہ 50
15. اے ایم سی ریلیز' 16-8-1999
16. اے ایم سی ریلیز' 28-7-1999
17. آغا سعید کا انٹرویو 2-12-2000

18۔ اے ایم سی ریلیز' 2000-10-5

19۔ ''سینٹ پیٹرز برگ ٹائمز'' 2000-10-24 ''لاس اینجلس ٹائمز'' 2000-10-23' اے ایم اے نیوز ریلیز 2000-10-23

20۔ اے ایم سی ریلیز 2000-10-26

21۔ ''نیویارک ٹائمز'' 2000-10-26

22۔ سی اے آئی آر نیوز ریلیز 2000-11-14

❁ ❁ ❁ ❁

تیرہواں باب

مستقبل کا چیلنج

جب ہم اسلام کے حوالے سے باطل تصورات کا سامنا کریں تو ہم سب کو تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کی تاریخ بھی مذہبی رواداری کے اعتبار سے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح داغدار ہے۔ دامن کسی کا بھی صاف نہیں ہے' تاہم مؤرخ یہ ضرور دیکھے گا کہ مسلمانوں کے دامن پر بہت کم داغ ہیں۔

تینوں توحید پرست مذاہب نے خود اپنے اصولوں کو بری طرح پامال کرتے ہوئے بہت سے ایمان نہ رکھنے والوں کے ساتھ انتہائی سفاکانہ برتاؤ کیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائی رہنماؤں کے پھیلائے ہوئے یک رخے تصورات کی وجہ سے صلیبی جنگوں کے دوران یروشلم میں مسلمانوں کا ہولناک قتل عام برپا ہوا۔ نیز فرانس اور سپین میں مسلمانوں اور یہودیوں کو بے دردی سے عذاب دیئے گئے۔

امریکا کا ریکارڈ ملا جلا ہے' ایک صفحے پر قوم کی بنیادی دستاویزات میں بیان کردہ مثالیت پسندی ہے' جس کا اظہار برسوں سے امریکی رہنما کرتے آئے ہیں۔ جبکہ دوسرے صفحے پر ہمارے ملک کا درخشاں ریکارڈ ایک ایسے مقام کے طور پر ہے جہاں مذہبی جنگوں سے جانیں بچا کر لوگ پناہ لینے کے لیے آتے ہیں۔

دیگر صفحات مذہبی عدم رواداری سے داغدار ہیں۔

برسوں پہلے مقامی ہندوستانیوں کو اتنا خطرناک تصور کیا گیا کہ ان کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ اور یہ قتل عام کرنے والے زیادہ تر عیسائی تھے۔ مغربی نصف کرۂ ارض میں امریکہ کو یہ شرمناک امتیاز حاصل ہے کہ یہ ان چند ملکوں میں سے ہے جہاں آبادکاروں نے شعوری طور پر مقامی آبادی کا قتل عام کیا۔

تقریباً تین صدیوں تک امریکی شہریوں نے' جو بیشتر عیسائی تھے' افریقی امریکیوں سے ـــــ جن میں بہت سے مسلمان تھے ـــــ ذاتی املاک کی طرح برتاؤ کیا' ان سے حقارت آمیز سلوک کیا اور انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے سے روکا۔ کوئی ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصہ پہلے ایک آئینی ترمیم نے غلامی کا خاتمہ کیا لیکن جتھہ بند افریقی امریکیوں کو ہراساں کرتے رہے اور کئی کو توقتل کر دیا گیا۔ حبشی آبادی کے قتل عام (لنچنگ) کے دوران دس ہزار افریقی امریکیوں کو قتل کر دیا گیا۔ کئی نسلوں تک عیسائی کہلانے والے بہت سے غنڈوں نے کوکلکس کلاں کے جھنڈے تلے غلاموں کی اولادوں کو دوسرے شہریوں سے الگ تھلگ رکھا اور رہائش روزگار' تعلیم' ووٹنگ وغیرہ کے حوالے سے بے رحمی کے ساتھ ان کے حقوق کو کچل ڈالا۔

میرے کانگرس کے زمانے کی ابتداء میں ولیم ایل۔ ڈاسن پہلے افریقی امریکی تھے جنہیں امریکی ایوان نمائندگان میں ایک کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا۔ انہوں نے ایک سفید فام رکن کانگرس سے اپنی نسل کو درپیش المیے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: ''اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ آپ کو مسائل کا سامنا ہے تو ذرا تصور تو کیجئے کہ اگر آپ سیاہ فام ہوتے تو آپ کی زندگی کیسی ہوتی۔'' [1] آج تک بیشتر سفید فام لوگ افریقی امریکیوں کو پوری طرح قانون اور خدا کے روبرو مساوی تسلیم نہیں کرتے۔ روزا پارک' میلکم ایکس' مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور دیگر کی دلیرانہ جدوجہد کے باوجود یک رخے تصورات کی وجہ سے ان میں سے بیشتر کو الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور ان کے مواقع اور عزت و وقار کی نفی کی جاتی ہے۔

دیگر مذہبی اور نسلی گروپ بھی جھوٹے تصورات کے عذاب سے دوچار ہیں۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں مورمنوں (Mormons) کو یک رخے تصورات کی وجہ سے مشتعل لوگوں کے ڈر سے اوٹاہ کو فرار ہونا پڑا۔ برسوں تک آئرش کیتھولکوں کو ملازمتی امتیاز کا نشانہ بننا پڑا۔

''مہذب لوگوں'' کے معاہدوں نے یہودیوں اور افریقی امریکیوں کو رہائشی اور سماجی مواقع سے محروم رکھا' یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی میں وفاقی مقننہ نے ایسے امتیاز کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران' زمانہ جنگ کی روایت کے مطابق' ہمارے دشمنوں کے یک رخے تصورات کے تحت شیطانی خاکے بنائے گئے۔

ہوسکتا ہے کہ تیسری ہزاری کا آغاز امریکہ میں بین المذہبی روابط کے لیے ایک نیا حوصلہ افزا عہد ثابت ہو۔ مسلمان دشمن یک رخے تصورات اور بنیاد پرست عیسائیوں کی طرف سے عدم رواداری کے مظاہرے کے سوا میں امریکی عوام کو پہلے سے زیادہ مذہبی تنوع کو قبول کرتا ہوا پاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ امریکی عوام ہماری قوم کی بنیادی دستاویزات میں واضح طور پر بیان کردہ مذہبی رواداری کے مثالیے کو حقیقت میں عام کر دیں گے۔

آج مسلمان عدم رواداری کا اولین نشانہ بنے ہوئے ہیں اور بڑی شرم کی بات ہے کہ مسلمانوں کے یک رخے تصورات ساختۂ امریکہ (میڈان امریکہ) ہیں۔ جب میں نے زیر نظر کتاب کا خاکہ اور پہلے تین ابواب اپنی ایک سو چھ سالہ راسخ العقیدہ رومن کیتھولک ساس کو دکھائے تو انہیں پڑھ کر وہ کہنے لگیں: ''میں بھی لاکھوں امریکیوں کی طرح ہی ہوں۔ میں ہمیشہ مسلمانوں کو اجنبی لوگ تصور کرتی تھی۔ میں نے یہ تصور ٹیلی ویژن کے خبرناموں اور اخبارات کی شہ سرخیوں سے حاصل کیا۔ اب میں بہتر آگاہ ہوں۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہ بیشتر لوگ آگاہ نہیں ہیں۔''

ایسا صرف امریکہ میں ہے کہ اسلام کو دہشت گردی سے غلط طور پر جوڑا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ یک رخا تصور ہماری سرحدوں کے باہر بھی پایا جاتا ہے تاہم حالیہ برسوں میں ہمارے ہاں یہ بہت زیادہ شدت کے ساتھ پروان چڑھا ہے۔ امریکہ میں اسلام کے حوالے سے پھیلے ہوئے غلط تصورات کسی حد تک عرب اسرائیل تنازعے کی وجہ سے بھی ہیں۔ چونکہ اسرائیل کو اپنی ہمسایہ ریاستوں کے خلاف فوجی اعتبار سے چوکس رہنا پڑتا ہے اور وہ ریاستیں بیشتر مسلمان ہیں اس لیے عیسائی اور یہودی محسوس کرتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ برتنا چاہیے۔ جب ایک منصفانہ امن کے نتیجے میں اسرائیل کا عسکری رنگ روپ بدلا تو امریکہ میں مسلمانوں کے حوالے سے یک رخے تصورات کا پھیلاؤ کم ہوسکتا ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

1۔ امریکی رکن کانگرس

24 مزنگ روڈ، لاہور، پاکستان فون نمبر: 92-42-7322892
E-mail: nigarshat@wol.net.pk
E-mail: nigarshat@yahoo.com